اسلام میں بین الاقوامی تعلقات

اصول وضوابط

مصنف

ڈاکٹر احمد عبدالونیس شتا

مترجم

مولانا محمد اسعد ندوی

ایفا پبلیکیشنز، نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

(کتاب میں پیش کئے گئے خیالات کا ناشر کی رائے سے ہم آہنگ ہونا ضروری نہیں ہے، کوئی تیسرا شخص کتاب کو ویب سائٹ یا کسی اور ذریعے سے عام کرتا ہے تو اس کے مصدر اصلی کے مطابق ہونے کی ذمہ داری ناشر کی نہیں ہے)۔

نام کتاب : اسلام میں بین الاقوامی تعلقات-اصول وضوابط

الاصول العامة للعلاقات الدولية فی الاسلام وقت السلم

مصنف : ڈاکٹر احمد عبدالونیس شتا

مترجم : مولانا محمد اسعد ندوی

نظر ثانی : مولانا ہشام الحق ندوی

صفحات : 304

اشاعت اول: 2024

اشاعت دوم: 2026

تعداد: 200

ISBN:978-81-994277-0-9

باھتمام

اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)

ناشر

ایفا پبلیکیشنز، نئی دھلی

161-ایف، جوگا بائی، جامعہ نگر، نئی دہلی-110025

ای میل:ifapublications2004@gmail.com

فون:011 - 26981779

بسم الله رحمن الرحيم

فہرست مضامین

عمومی مقدمہ: موضوع مطالعہ اور طریقہ تحقیق کے حوالہ سے ۱۱

پہلا مبحث: مذاکرات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ ۱۹

پہلا مطلب: ۱۹

مذاکرات کی تعریف اور اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کے ضمن میں اس کی اہمیت کا بیان

دوسرا مطلب: اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں مذاکرات کی اہمیت ۲۳

تیسرا مطلب: اسلام میں مذاکرات کے شرعی دلائل ۲۷

چوتھا مطلب: مذاکرات کی تیاری کرنا ۳۲

پانچواں مطلب: مذاکرات میں وسائل کا مقاصد سے ربط ۵۶

چھٹا مطلب: مذاکرات کار کے لئے حفاظتی تدابیر ۵۸

ساتواں مطلب: مذاکرات کی پابندی کا دائرہ ۶۰

مذاکرات میں حسن نیت کی رعایت ۶۳

دوسرا مبحث: باہمی معاہدات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ ۶۷

پہلا مطلب: معاہدہ کی تعریف اور اسلام میں اس کی قانونی حیثیت کا بیان ۶۹

دوسرا مطلب: معاہدات طے کرنے کے مراحل ۷۷

۱-مذاکرات ۷۷

۲-معاہدہ کو ضبط تحریر میں لانا ۷۹

۳-معاہدہ پر دستخط اور اس کی توثیق ۸۵

تیسرا مطلب: معاہدوں کی درستگی کی معروضی شرائط ۹۰

۱-معاہدہ کرنے کی اہلیت ۹۱

۲-فریقین کی مکمل رضامندی ۹۸

۳-معاہدہ کے مندرجات کا قانونی جواز ۱۰۰

-کلی یا جزوی طور پر شرعی احکام سے متصادم معاہدے کے حوالے سے فریق ثانی کے حقوق ۱۰۵

۴-معاہدہ کی مدت ۱۱۳

اول-متعینہ مدت کے لئے کئے گئے معاہدے ۱۱۴

دوم-غیر متعینہ مدت کے لئے کئے گئے معاہدے ۱۱۸

۳-دائمی معاہدے ۱۲۰

مدت معاہدہ کی تعیین سے متعلق آراء کا جائزہ-تحقیق وتنقید ۱۲۱

تیسرا مبحث :تجارتی اور اقتصادی لین دین اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ ۱۲۷

پہلا مطلب: اسلام میں بیرون ملک تجارت کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت ۱۲۸

دوسرا مطلب: اسلامی ریاست میں بیرون ملک تجارت کے حدود وضوابط ۱۳۹

۱-تجارتی اور اقتصادی لین دین میں اسلامی ممالک اور جماعتوں کو ترجیح دینا ۱۴۰

۲-غیر مسلم ممالک کے ساتھ اقتصادی لین دین اور تجارتی تعلقات کے درست ہونے کی ایک اساسی شرط یہ ہے کہ اس سے اہل اسلام کے عمومی مصالح کی تکمیل ہوتی ہو۔ ۱۵۲
۳-اسلامی ریاست ہی خارجہ تجارت کو منظّم کرنے کی ذمہ دار ہے ۱۵۹
۴-اسلامی ریاست میں غیر مسلم تاجروں اور سرمایہ کاروں کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں ان کے داخلے اور قیام سے متعلق احکام کو ملحوظ رکھنا ۱۶۰
۵-غیر مسلم ممالک سے درآمدات پر ٹیکس یا کسٹم ڈیوٹی عائد کرتے وقت معاملہ بالمثل (باہمی تعاون) کے اصول کی رعایت کرنا ۱۶۳
۶-بیرون ملک اقتصادی اور تجارتی تعلقات میں عدل اور دیانت کے تقاضوں کی رعایت کرنا ۱۶۷
۷-دوطرفہ تجارتی اور اقتصادی معاملات میں معاہدہ کی دفعات کا ازروئے شرع درست ہونا ۱۷۲
چوتھا مبحث: سفراء کا تقرر اور دوطرفہ سفارت کاری اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ ۱۸۵
پہلا مطلب: سفراء کا تقرر اور باہمی سفارت کاری کی شرعی بنیاد ۱۸۸
دوسرا مطلب: نمائندگان اور سفرا کے مطلوبہ اوصاف ۱۹۷
تیسرا مطلب: سفراء کے تقرر اور دوطرفہ سفارت کاری کے حوالے سے باہمی رضامندی ۲۰۶
۱-کسی ملک میں عارضی طور پر مقرر کسی سفیر کے متعلق پیشگی منظوری یا پیشگی اطلاع کی شرط لگانا ۲۰۸

۲-دائمی دوطرفہ سفارت کاری کے لئے پیشگی رضامندی شرط ہے ۲۱۶
چوتھا مطلب: سفیر کا استقبال اور بھیجے گئے ملک کی طرف سے اس کا تسلیم کیا جانا ۲۲۰
پانچواں مطلب: اسلام میں سفراء اور سفارتی عملے کی ذمہ داریاں ۲۲۹
۱-اسلامی ریاست کی نمائندگی کرنا ۲۳۰
۲-اسلام کی دعوت دینا ۲۳۰
۳-مذاکرات کرنا ۲۳۲
۴-جس ملک کی طرف بھیجا جائے وہاں کے حالات کی چھان بین کرنا اور وہاں کے تمام احوال سے باخبر رہنا ۲۳۳
معلومات جمع کرنے کے کام میں مثبت اور منفی پہلو ۲۳۶
۵-اسلامی ریاست کی طرف سے تسلیم شدہ ممالک میں اپنی ریاست اور اس کے شہریوں کے مفادات کا تحفظ ۲۳۹
چھٹا مطلب: اسلام میں سفراء اور سفارتی عملے کا تحفظ ۲۴۷
۱-دائمی سفارتی مشن کو حاصل استثنا ۲۴۸
۲-اسلام میں نمائندگان اور سفارت کاروں کو حاصل استثنا ۲۵۵
الف-سفیر کو حاصل شخصی تحفظ ۲۵۵
ب-نمائندہ یا سفارت کار کو فوج داری قوانین سے حاصل استثنا ۲۵۸
ج-سول اور دیوانی عدالت کے بالمقابل استثنا ۲۶۹
د-اہل وعیال اور مال کا تحفظ ۲۷۰
ھ-نمائندگان اور سفراء کو حاصل تحفظ کی شرعی بنیاد ۲۷۳

و-نمائندگان اور سفراء کو دیئے گئے تحفظ کا خاتمہ ۲۷۹
ز-مشن کے غیر نمائندہ ارکان کو دیا جانے والا تحفظ ۲۸۳
خاتمہ: حالت امن میں اسلامی ریاست کے امور خارجہ کے ذرائع کو منظّم کرنے والے اصول وضوابط ۲۸۵
مراجع ۲۹۶

☆☆☆

عمومی مقدمہ

موضوع مطالعہ اور اس طریقہ تحقیق کے حوالے سے

دین اسلام میں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اسلامی شریعت جو کہ تمام آسمانی ہدایات کے سلسلہ کی آخری کڑی ہے اور جامعیت وہمہ گیریت میں ممتاز ہے، تمام مسلمانوں پر بحیثیت فرد وجماعت لازم کرتی ہے کہ وہ ان ممالک اور جماعتوں سے تعلقات اور روابط استوار کریں جو اسلام کو اپنا مذہب نہیں مانتے، ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے تاکہ مختلف اغراض ومقاصد کی تکمیل ہو سکے، جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ مکمل دین کی اشاعت ہو اور عوام الناس کو اس کی طرف بلایا جاسکے، علاوہ ازیں سامان اور منافع کا تبادلہ کیا جائے ؛ تاکہ مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے عمومی مصالح پورے ہوں، اس سلسلے میں اسلامی مملکت چونکہ دیگر غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں کی طرح ہے (یعنی بین الاقوامی معاملات میں دونوں برابر درجے کے ہیں) لہذا اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان اسباب وذرائع سے مدد لے جن کے ذریعہ اس کے لئے خارجہ تعلقات کو منظّم کرنا اور استوار کرنا ممکن ہو، نیز ان تعلقات کے توسط سے مطلوبہ اغراض ومقاصد بروئے کار لائے جاسکیں۔

اگرچہ مرور زمانہ کے ساتھ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں عملی اور حقیقی سطح پر یہ بات مشاہدہ میں آتی ہے کہ مملکتوں کو ایک سے زائد وسائل وذرائع اختیار کرنے کا وسیع میدان حاصل ہوتا ہے، اور وہ اپنی خارجہ پالیسی سے متعلق اغراض ومقاصد کے حصول کے لئے مناسب اور موثر ترین ذرائع کا تعیین کرتی ہیں، مگر یہ کہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات اپنی حقیقت

اور ظاہر کے اعتبار سے اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے مربوط ہونے کے نتیجہ میں اس آزادی کے عکاس ہیں جو اسے دوسرے ممالک سے اپنے تعلقات استوار اور منظّم کرنے اور اس کے لئے کامیاب ترین تدابیر اختیار کرنے کے حوالے سے حاصل ہیں۔

بالفاظ دیگر یہ ایک ایسی ٹھوس حقیقت ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات اگرچہ انہیں وجود بخشنا ایک واجب شرعی حکم ہے مگر ان تعلقات کے لئے ایک ایسی بنیاد ہونی چاہئے جس پر ان کی تعمیر کی جاسکے، اور ان کے لئے چند ایسے عمومی اصول وضوابط کا ہونا ضروری ہے جن کے زیر سایہ ان کی صورت گری ہو سکے، فطری طور پر یہ اساس اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کی تحدید وتعیین میں مؤثر ثابت ہوگی، جس طرح واقعات کی دنیا میں ان تعلقات کی عملی تشکیل کرتے وقت اپنا تاثیری کردار ادا کرے گی، چہ جائیکہ اسلامی مملکت کے امراء کو خارجہ پالیسی کے سلسلے میں عمل ودخل کے حوالے سے اسباب وآلات کے اختیار کا جو حق دیا گیا ہے وہ ان شرعی ضوابط کی وجہ سے تنگ ہوجائے یا پھر حد سے زیادہ وسعت اختیار کرلے۔

گذشتہ تفصیلات کی وضاحت کے طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس نقطہ نظر پر عمل کیا جائے جس میں اس بات کی نشاندہی کی گئی ہے کہ مسلمانوں کے غیر مسلم مملکتوں اور جماعتوں کے غیر مسلموں سے بالخصوص جبکہ مسلمانوں کو مکمل قوت وغلبہ حاصل ہو، تعلقات کی اساس یہ ہے کہ غیر مسلموں کو چاہے وہ کافر ہوں یا مشرک، یہ اختیار دیا جائے کہ یا تو وہ اسلام قبول کرلیں یا پھر قتال (جنگ) کے لئے آمادہ ہوجائیں، اور اہل کتاب اور ان کے ساتھ مجوسیوں کو یہ اختیار دیا جائے کہ یا تو اسلام قبول کریں یا پھر جزیہ دینا گوارہ کرلیں یا برسر پیکار رہیں، جب اس نقطہ نظر پر عمل کیا جائے گا تو اسکا تقاضا یہ ہوگا کہ ان مصالحتی اسباب ووسائل کے دائرہ کو تنگ کردیا جائے جن سے اسلامی مملکت کے لئے دوسروں سے تعلقات قائم اور منظّم رکھنے کی خاطر مدد لینا ممکن ہو سکے۔

اور صورتحال مذکورہ تفصیلات کے بالکل برعکس اس وقت ہوگی جب ہم اس نقطہ نظر کو

زیرعمل لائیں گے، جس میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات استوار کرنے کا اصل مقصد امن کا قیام ہے گرچہ جنگ وجدال کے اسباب ومحرکات پائے جارہے ہوں؛ کیونکہ ایسی صورت حال میں اسلامی مملکت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ متعدد اسباب وذرائع کو استعمال کرے یعنی خارجہ تعلقات کے جو مطلوبہ مقاصد ہوتے ہیں، وہاں تک رسائی کے مناسب طریقہ کار کی تعیین کرے۔

صحیح بات یہ ہے کہ دعوت یعنی مسلمانوں کی طرف سے اس بات کا التزام کہ وہ روئے زمین کے تمام غیر مسلموں کو دین اسلام کی دعوت دیں گے، اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں سے تعلقات قائم کرنے کی اصل بنیاد ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ دعوتی کام کا آغاز پرامن ماحول میں پرامن طریقہ پر فرض قرار دیا جائے۔

ان تمام تر سرگرمیوں کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کے سلسلے میں امن کا صحیح مفہوم طے کیا جائے، یعنی لفظ امن کو ایک پسندیدہ عمومی شکل دی جائے؛ تاکہ امن اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کی صورتوں میں سے ایک صورت کی بجائے، ایک ایسا عمومی مقصد بن جائے جو ''اسلامی امن وسلامتی'' کی صورت میں اس مملکت کا مطلوب ہو اور پورے کرہ ارض پر بالعموم اس کے اثرات مرتب ہوتے رہیں، یہ اسلامی امن اس بات پر مبنی ہے کہ دعوتی کام کو غیر مسلموں سے تعلقات کی بحالی کے سلسلے میں اصل سمجھا جائے، اور ان تعلقات میں امن کے حقیقی مقام ومرتبہ کی تعیین کا معاملہ بھی ایک بنیادی حقیقت پر مبنی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ وہ اسباب ووسائل جن کے ذریعہ اسلامی مملکت کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں کے ساتھ حالت امن میں اس کے تعلقات منظّم اور استوار ہوں، متعدد ومتنوع ہیں، ان میں دوطرفہ مذاکرات، غیر مسلموں کے ساتھ متعینہ مسائل کے حل کے لئے باہمی معاہدے مشترکہ تجارتی اور اقتصادی روابط، نمائندگان اور سفارت کاروں کا تبادلہ (یعنی ڈپلومیٹک تعلقات کا باہم تبادلہ) جیسے امور شامل ہیں، ان کے علاوہ بھی وسائل اور تدابیر ہیں جن سے حالت امن میں امور

خارجہ کو منظّم کرنے کی خاطر بالعموم مدد لی جاسکتی ہے۔

اس جگہ اسلامی مملکت کے طریقہ کار کو منظّم کرنے کے سلسلے میں اسلامی شریعت کے بیان کردہ اصول وضوابط کی ماہیت سے متعلق سوالات کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ سوالات تعلقات کو بحال رکھنے کے لئے گزشتہ سطور میں مذکور اسباب ووسائل کو اختیار کرنے سے متعلق ہیں، بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ وہ شرعی دلائل کیا ہیں جو اسلامی مملکت کے طرز عمل میں اس طرح کے اسباب وذرائع سے رجوع کو جواز عطا کرتے ہیں، اور وہ حدود وضابطے کیا ہیں جن کی مدد سے اسلامی مملکت کے امور خارجہ کو مستحکم اور منظّم کیا جاسکتا ہے؟ اور کس حد تک وہ حدود وضوابط جن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس صورت حال میں مختلف ہوجاتے ہیں جب ان اسباب ووسائل کا استعمال اسلامی مملکتوں کے باہمی تعلقات کے لئے کیا جاتا ہے، بالمقابل اس صورت کے جب ان کا استعمال اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے مابین تعلقات وروابط کے لئے کیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ حالت امن میں اسلامی مملکت کے خارجی معاملات کے لئے مطلوب اسباب ووسائل کے درمیان ربط کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان وسائل کے استعمال کے نتیجہ میں پیش آنے والے مسائل وامکانات کی نوعیت سے متعلق بھی سوال پیدا ہوتا ہے چاہے یہ استعمال اسلامی مملکتوں کے باہمی تعلقات کے لئے ہو یا معاصر بین الاقوامی گروپ کے دائرہ میں ہو یعنی سوال مذکورہ وسائل کو استعمال کرنے سے متعلق اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے درمیان اور معاصر بین الاقوامی تعلقات کے تحت اس سلسلہ میں وضع کئے گئے عالمی دساتیر وقوانین کے درمیان ہم آہنگی کے حدود کے حوالے سے ہے۔

یہ تحقیق سطور بالا میں اٹھائے گئے سوالات کے جوابات پیش کرنے میں قرآن کی تفاسیر اور حدیث کی تشریحات کے ذریعہ اسلامی اصولوں میں غور وفکر کے منہج پر مبنی ہے، ساتھ ہی

اسلامی اصولوں یعنی قواعد واحکام سے متعلق مذاہب وآراء پر مشتمل فقہاء اور علماء تاریخ وسیر اور بڑے مفکرین کی ان کتابوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے جن میں خاص طور پر بین الاقوامی تعلقات کو منظّم کرنے کے سلسلے میں اہم مصالحتی اسباب وذرائع کو استعمال کرنے کی مشروعیت کو بیان کیا گیا ہے، یعنی باہمی گفت وشنید، معاہدات، اقتصادی معاملات، سفراء اور سفارتوں کا باہمی تبادلہ، اسی طرح اس میں خصوصی طور پر وہ شرعی حدود وضوابط بیان کئے گئے ہیں جو اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کے سلسلے میں ان وسائل کے استعمال کو مضبوط ومنظّم کرتے ہیں۔ یہ رسالہ چار علاحدہ علاحدہ مباحث پر مشتمل ہے، جن کی تفصیل ذیل میں آرہی ہے۔

مبحث اول

مذاکرات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

پہلا مبحث

مذاکرات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

اس مبحث میں اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کے ایک ذریعہ کے طور پر مذاکرات کا مطالعہ وتجزیہ کیا گیا ہے، جیسے مذاکرات کی تعریف، اور اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں اسے زیر عمل لانے کی مشروعیت واہمیت کا بیان، ساتھ ہی ان عمومی قواعد کا جائزہ لیا گیا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان مذاکرات کے عمل کو منظّم ومستحکم کرتے ہیں، جن میں وہ قواعد بھی ہیں جو مذاکرات کار کے حفاظتی تدابیر اور مذاکرات کے نتائج کی پابندی کے دائرہ کو مندرجہ ذیل طریقے پر مستحکم کرتے ہیں:

پہلا مطلب

تفاوض (مذاکرات) کی تعریف، اور اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں اس کی اہمیت کا بیان

عربی لغت کی کتابوں میں مذکور تفصیلات سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ لفظ ''تفاوض'' (مذاکرات) یا ''مفاوضۃ'' کا استعمال دو معنوں میں ہوتا ہے، ان میں سے ایک ''مشارکۃ'' یا ''شرکت'' کے معنی میں آتا ہے، جیسے کہا جاتا ہے: ''**تفاوض الشریکان فی المال**'' جب فریقین پورے مال میں شریک ہوں اور ہر ایک اپنا معاملہ دوسرے کے سپرد کردے، مطلب یہ ہے کہ یہ پہلا دوسرے کے عمل سے راضی ہو اور دوسرا پہلے کے عمل سے راضی ہو، عمل سے مراد وہ عمل ہے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے، اور اسی سے ''شرکۃ المفاوضۃ'' ہے، جس میں دو

آدمی ہراس چیز میں شریک ہوتے ہیں جس پر دونوں کو مالکانہ قبضہ حاصل ہواور اخیر میں دونوں اپنا اپنا حصہ واپس لے لیں،'' مفاوضۃ'' یا'' تفاوض'' کا دوسرا معنی مناظرہ کرنا، گفت وشنید کرنا، مباحثہ کرنا ہے، جیسے کہا جاتا ہے :''**فاوضه فی الأمر**''یعنی اس نے اس مسئلہ میں مناظرہ کیا، ''**وتفاوضوا الحدیث**''، یعنی وہ گفتگو میں شامل ہوئے، اور ''**وتفاوض القوم فی الأمر** ''یعنی لوگوں نے اس مسئلہ میں ایک دوسرے سے مباحثہ اور مذاکرہ کیا، اسی طرح سے ''**مفاوضة العلماء**'' سے مراد علماء کا علمی موضوعات پر مذاکرہ اور باہم گفتگو کرنا ہے، اسی طرح مفاوضہ کو لغت میں کسی متفقہ نتیجہ تک پہنچنے کے لئے زور آزمائی کرنے، تبادلہ خیال کرنے اور آراء کی تحقیق کرنے کے معنی میں بھی لیا گیا ہے، اسی معنی میں علماء شوری کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس کا مطلب ایسا باہمی مذاکرہ ہے جس سے صحیح صورت حال سامنے آجائے ، یا ایک دوسرے سے اس طرح رجوع کیا جائے کہ کوئی رائے مستنبط ہوجائے (۱)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ لفظ'' مفاوضہ'' کا لغوی مفہوم جس میں برابر کی سطح پر باہمی شراکت ،مناظرہ ،مباحثہ اور مذاکرات کاروں کا ایک دوسرے کو قائل کرنے کا حق شامل ہے تفاوض کے اصطلاحی مفہوم سے مطابقت رکھتا ہے، اس لئے کہ وہ ایک قسم کا مکالمہ یا ایسا رابطہ ہے جو دو یا دو سے زائد افراد کے درمیان مکمل ہوتا ہے، جس کا مقصد ان متفقہ مسائل یا موضوعات تک پہنچنا ہے جو دو مذاکرات کاروں کے مشترکہ تعلقات اور مصالح سے متعلق ہوں (۲)، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ'' تفاوض'' کا لفظ اپنے اصطلاحی مفہوم کے اعتبار سے ایک خاص

۱- اس سلسلے میں دیکھیں: معجم مقاییس اللغة لأبی الحسن بن فارس بن زکریا (تحقیق وضبط) عبدالسلام ہارون، القاہرة، مطبعة البابی الحلبی، مادة (فوض) ص:۴۶؛ لسان العرب لابن منظور، بیروت، دار بیروت للطباعة فی ۱۹۶۸م، مادة (فوض). - الألوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی، القاہرة، المطبعة المنیریة، ۱۳۴۵ھ، ج ۲۵، ص: ۴۲۔ الطبرسی، مجمع البیان فی تفسیر القرآن، ایران، شرکة المعارف الاسلامیہ ج ۹، ص ۳۳۔

۲- دکتور مفید شہاب، المفاوضات الدولیة: علم وفن فی، المفاوضات الدولیة، ندوة معہد الدراسات الدبلوماسیة - الریاض ۱۴۱۳ھ/ ۱۹۹۳م ص: ۲۱۱۔

طریقہ کار کو تشکیل دیتا ہے یا اگر آپ چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تفاوض ایک ایسا عملی اسلوب ہے جس میں باہمی مذاکرات کے سارے گوشے شامل ہوتے ہیں، تاکہ ایسے اتفاقی نقطہ تک پہنچا جاسکے جہاں مذاکرات کے ممکنہ مصالح ومنافع کا تحفظ یقینی ہو، خلاصہ یہ کہ لفظ ''تفاوض'' میں اپنے اصطلاحی مفہوم کے لحاظ سے اور دونوں مذاکرات کاروں کے کسی معاہدہ تک پہنچنے کے لئے نقطہائے نظر کے تبادلے کا ایک ذریعہ ہونے کے لحاظ سے یہ پہلو لازما شامل ہے کہ وہ نقطہ جس پر اتفاق ہوجائے، ضروری نہیں کہ وہی نقطہ ہو جو ان مطالب کو بیان کرے جو ایک فریق یا دوسرے فریق کی طرف سے مذاکراتی عمل کے شروع میں پیش کئے جائیں، بلکہ اس کی بجائے وہ متفقہ نقطہ مذاکرات کے درمیان پیش کئے گئے افکار وخیالات، اور بہت حد تک دونوں مذاکرات کاروں کی جانب سے ایک دوسرے کو دی گئی رعایت کے نتیجہ میں فریقین کی طرف سے دریافت کئے جانے والے قابل فہم اور قابل قبول مصالحت ومفاہمت کے آئینہ دار حل کی وضاحت کرتا ہو، اس سب کا حاصل یہ ہے کہ ''تفاوض'' کا ایک ایسا ''ادنی درجہ'' ہو جو مذاکرات کی ان بنیادی اقدار اور بلند وبالا مقاصد کی نمائندگی کرے جن کی موجودگی میں کسی مذاکرات کار کے لئے مذاکرات سے دستبرداری نامناسب ہو، یا جب تک باہمی مذاکرات کا سلسلہ جاری رہے، اس وقت تک اس میں کسی طرح کی کمی یا کوتاہی کو گوارہ کرنا اس کے لئے روا نہ ہو(۳)۔

لیکن اگر ایک طرف عربی زبان میں مفاوضات (مذاکرات) کی کچھ ایسی بنیادیں موجود ہیں جو اپنے مضمون کے اعتبار سے مرور زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے بین الاقوامی زندگی کے لئے مطلوب مذاکرات کے اصطلاحی مفہوم سے مختلف نہیں تو دوسری طرف جو چیز تفسیر کی کتابوں اور حدیث کی شرحوں، اسی طرح فقہ وتاریخ اور سیر کی کتابوں میں بالعموم قابل غور ہے، وہ یہ کہ ان کتابوں میں عہد نبوی ﷺ اور خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان

۳- سابقہ مرجع، ص. ۲۱۷، اور اسی طرح اس میں بھی دیکھیں: دکتور أسامۃ الباز، المفاوضات السیاسیۃ: دراسۃ حالۃ مفاوضات السلام المصریۃ-الاسرائیلیۃ فی: المفاوضات الدولیۃ، مرجع سابق: ص: ۹۲، ۱۰۰-۱۰۱۔

جواستوار ہونے والے روابط اور تعلقات تفاوض (مذاکرات) کے باب میں زیر بحث نہیں لایا گیا۔

بلکہ ان تمام مصادر نے ان باہمی تعلقات کے واقعات کو تحلیل وتجزیہ کے طور پر مختلف ابواب جیسے "باب الصلح مع الأعداء"(دشمنوں کے ساتھ صلح کا باب) یا "مباحث الهدنة"(صلح کے مباحث) یا "دعوة العدو"(دشمنوں کو دعوت) کے تحت ذکر کیا ہے، ان کے علاوہ دیگر ان ابواب واسماء کے تحت جو اپنے مضمون کے اعتبار سے اس مفہوم سے میل کھاتے ہیں جن سے بعد میں بین الاقوامی برادری متعارف ہوئی یعنی لفظ ''المفاوضات'' یا ''التفاوض' کا اطلاق باہمی مذاکرات، تعلقات اور نقطہائے نظر کے تبادلے کی ان تمام صورتوں پر کیا جائے جو مختلف فریقوں کے درمیان پائی جاتی ہیں، اور جن کا مقصد ایک ایسے معاہدہ تک پہنچنا ہو جس کے ذریعہ مختلف فریقوں کے مشترکہ مصالح کی تکمیل کی جائے اور باہمی تعلقات استوار کئے جائیں(۴)۔

اور چونکہ صورتحال یہ ہے، اور اصطلاح میں کوئی تنازعہ نہیں اس لئے ہم تفاوض کے ان عمومی خصائص اور خدوخال کو پیش کریں گے جن کی رو سے ''تفاوض'' (مذاکرات) ایک ایسا ذریعہ ثابت ہوتا ہے جو اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کو منظّم کرنے میں سرگرم رول ادا کرسکتا ہے، اور وہ اس طرح کہ ہم مذاکرات کی اہمیت کے ساتھ ان شرعی دلائل کو بھی ذکر کریں گے جن پر اسلام میں ''تفاوض'' (مذاکرات) کی مشروعیت منحصر ہوتی ہے، اور ان اہم اغراض ومقاصد کو بھی بیان کریں گے جو ''تفاوض'' (مذاکرات) سے مطلوب ہیں، اور عملی طور پر ''تفاوض'' کے لئے

۴- اس طور پر مراجعت کریں: صحیح البخاری، المدینۃ المنورۃ، دار الفکر ۱۳۹۱ھ، صحیح مسلم، القاہرۃ، دار الریان للتراث ۱۹۸۸ھ، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، (تحقیق) محمد محی الدین عبد الحمید، القاہرۃ، دار الہدایۃ، ۱۹۸۰ء، محمد شمس الحق عظیم بادی، عون المعبود فی شرح سنن أبی داود، بیروت، دار الفکر، ۱۹۷۹ء، القلقشندی، صبح الأعشی فی صناعۃ الانشاء، القاہرۃ، المطبعۃ الأمیریۃ، ۱۹۳۱ء۔

کیسے تیاری کی جاسکتی ہے؟ اس پر بھی روشنی ڈالیں گے، اور تحفظات کے وہ پہلو بھی بدرجہ اولی تذکرہ میں آئیں گے جن سے مذاکراتی عمل کے دوران مذاکرات پر مامور فریق مستفید ہوگا۔

دوسرا مطلب

اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں مذاکرات کی اہمیت

لفظ تفاوض گذشتہ معنی ومفہوم کے اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے، ان اسباب وذرائع کے دائرہ میں جن کی مدد سے اسلامی مملکت ان اہداف ومقاصد کی تکمیل کرتی ہے جو غیر اسلامی جماعتوں اور مملکتوں سے تعلقات کے توسط سے مطلوب ہوتے ہیں، اس سلسلے میں مذاکرات کی اہمیت اس لئے بھی ہوتی ہے کہ مذاکرات دراصل اس حقیقت کا نام ہے جسے ہم مصالحاتی اور پر امن مزاج والا ذریعہ ووسیلہ کہہ سکتے ہیں، جو باہمی احترام اور افہام وتفہیم کے ماحول میں باہمی مذاکرات اور مباحثہ کے ذریعہ منطقی طور پر مطمئن کرنے سے وجود میں آتا ہے، یہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کے اہم اہداف ومقاصد کو روبہ عمل لانے کا ایک مؤثر وسیلہ ہوتا ہے، جیسے روئے زمین میں دعوت اسلامی کو فروغ دینے کی خاطر حصول اقتدار کا مقصد، اور جیسے مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان پیدا ہونے والے تنازعات کے خاتمہ کا مقصد، ساتھ ہی مذاکرات کے ذریعہ بہت سارے دائمی اور عارضی معاہدوں کو مستحکم کرنا، اور بہت سے ان مسائل وموضوعات کو حل کرنا جو فریقین کے درمیان پائے جانے والے تعلقات سے وابستہ ہوتے ہیں، ان مقاصد کے علاوہ مذاکرات کا اہم رول ہوتا ہے امن وسلامتی کے استحکام میں اور اسلامی اور غیر اسلامی مملکتوں کے درمیان تعاون وتفاہم کی روح بیدار کرنے میں۔

گذشتہ تفصیلات کی وضاحت کے طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ اور قبیلہ خزرج سے متعلق یثرب سے آئے وفد کے درمیان حج کے موقع سے مدینہ ہجرت کرنے سے

پہلے مذاکرات ہوئے، اس میں آپ ﷺ نے یثرب کے عربوں کو اسلام کی دعوت دی اور ان سے رب کریم کے پیغام کی تبلیغ میں تعاون کرنے کی اپیل کی، پھر اس کے بعد حضور ﷺ اور مدینہ کے اوس وخزرج جیسے قبائل کے درمیان مسلسل معاہدے ہوئے، چنانچہ پہلی بیعت عقبہ ان میں سے بارہ لوگوں کے ساتھ ہوئی، اور دوسری بیعت عقبہ ان میں سے ۷۳ لوگوں کے ساتھ ہوئی(۵)، اسی طرح سے صلح حدیبیہ کے موقع سے سفارتکار اور مذاکرات کا رکا جو تبادلہ ہوا آپ ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان یہاں تک کہ دونوں فریق کے درمیان اتفاق ہوگیا، اور جو کچھ معاہدہ کی شکل میں ۶ھ میں ہونے والے معرکہ بدر کے بعد ہوا، اور خلافت راشدہ کے دوران ماوراءالنہر کے علاقہ میں اہل فارس کے خلاف مسلمانوں کی معرکہ آرائی کے بعد جو کچھ طے پایا، وہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان دشوار گذار اور دقت طلب مذاکرات کے نتیجہ میں ظاہر ہوا، ان سب کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا کہ ایک دوسرے کے قیدیوں کو رہا کر دیا جائے، یہ سارے واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ مذاکرات کس قدر اہمیت کے حامل ہیں معاہدوں کے استحکام کے سلسلے میں اسلامی اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان(۶)، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کبھی اسلامی مملکت مجبور ہوتی ہے کہ وہ غیر مسلموں سے ہونے والے مذاکرات میں شامل ہو، تاکہ اسلامی ممالک کے متوقع خطرات کا خاتمہ کیا جاسکے، اور دشمنوں کے محاذ کو کمزور کرنے کی اسکیم تیار

۵- الشوکانی، نیل الأوطار، بیروت، دارالکتب العلمیۃ، ۱۴۰۵ھ/ ۱۹۸۵م، ج۸، ص: ۳۲۔ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ پہلی بیعت عقبہ میں خزرج کے دس افراد اور اوس کے دو افراد شامل تھے، جبکہ دوسری بیعت عقبہ میں خزرج کے باسٹھ افراد اور اوس کے گیارہ مرد شامل تھے. اسی طرح اس میں دیکھیں: دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام فی "المفاوضات الدولیۃ"، مرجع سابق، ص۱۹۔

۶- محمد بہرام القاضی، سیاسۃ الرسول فی الجہاد والقضاء، رسالۃ دکتوراۃ، کلیۃ الشریعۃ والقانون، جامعۃ الأزہر ۱۳۵۵ھ/ ۱۹۳۶ء، ص ۳۰۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص: ۱۳، اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ غزوہ بدر میں اس بات پر اتفاق ہوا کہ قیدیوں کا فدیہ چار ہزار درہم فی قیدی مقرر کیا گیا، اور جو شخص فدیہ دینے کے قابل نہ تھا مگر پڑھنا اور لکھنا جانتا تھا، تو اسے مدینہ کے دس لڑکوں کو پڑھانے کی ذمہ داری دی گئی اور یہی اس کا فدیہ قرار پایا۔

کی جاسکے، اور ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ بعض اداروں یا غیر اسلامی ممالک سے اس بات پر معاہدہ کیا جائے کہ جب مسلمان اپنے دشمن سے برسر پیکار ہوں گے تو وہ اس مہم سے دور رہیں گے، اگر چہ صورت حال کا تقاضا ہو کہ مسلمان غیر مسلموں کو کچھ مالی معاوضہ ادا کریں۔

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جنگ احزاب کے موقع پر قبیلہ بنو غطفان کے ساتھ جو گفتگو کی اس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ مدینہ کے پھلوں کے ایک تہائی حصہ کے عوض وہ لوگ مسلمانوں کے خلاف ہونے والی جنگ سے دور رہیں گے، اس لئے کہ اس وقت مدینہ کا محاصرہ کرنے کے ارادہ سے قبیلہ بنو نضیر، بنو فزارہ، قریش، غطفان، بنی مرہ اور قبیلہ اشجع کے بعض افراد پر مشتمل افواج کا اجتماع اسلامی مملکت کے لئے براہ راست خطرہ ثابت ہو رہا تھا، اگر چہ آپ ﷺ نے اس سلسلے میں جب انصار سے مشورہ کیا تو انہوں نے اس طرح کی مصالحانہ گفتگو کو مسترد کرنے کا مشورہ دیا، کیونکہ اس کا نتیجہ مسلمانوں کی عزت و وقار کی پامالی ہے، اور اسلام نے مسلمانوں کو جو شان و شوکت اور عزت و افتخار عطا کیا ہے، یہ اس سے کسی طرح میل نہیں کھاتا، مگر اس واقعہ کا رہنما پہلو ہی یہی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان گفتگو اور مذاکرات کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے(۷)۔

اس سلسلے میں جو بات قابل ذکر ہے وہ یہ کہ قبیلہ غطفان کے ساتھ مذاکرات جس شکل میں بھی اختتام پذیر ہوئے، اس کے متعلق علماء کے درمیان اختلاف ہے کہ کس حد تک مسلمانوں کے لئے دشمنوں کے ساتھ اس طرح کے مذاکرات میں شامل ہونا درست ہے؟ جس میں مسلمانوں کو جنگ بندی کی خاطر دشمن کو مالی معاوضہ ادا کرنا پڑے، دوسرا نقطہ نظر وہ ہے جو اس قسم

۷- ابن العربی، أحکام القرآن، (تحقیق) علی محمد البجاوِ، القاہرۃ، دار إحیاء الکتب العربیۃ (عیسی البابی الحلبی)، الطبعۃ الأولی، ۱۳۷۶ھ/ ۱۹۵۷ء، ج: ۲، ص: ۸۶۵، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج: ۲ ص: ۲۱۴ اور اس کے بعد کے صفحات، الطبری، اختلاف الفقہاء، ص: ۱۷، دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، دمشق، دار الفکر، الطبعۃ السابعۃ، ۱۳۹۸ھ، ص: ۶۲-۶۳۔

کی گفتگو اور مذاکرات میں مسلمانوں کی شمولیت کی مخالفت کرتا ہے، اگرچہ اس کا منفی اثر یہ ہو کہ مسلمان کمزور پڑ جائیں اور دشمن کو طاقت وقوت حاصل ہو جائے، کیونکہ ارباب حل وعقد حضرات کے لئے جبکہ صورتحال ایسی ہو تو یہ متعین ہو جاتا ہے کہ وہ دشمن کو جزیہ دینے کے بجائے جنگ کے لئے آمادہ ہو جائیں، کیونکہ دشمن کو مال وزر دیئے جانے پر اتفاق کرنے کی وجہ سے مسلمانوں کا مقام ومرتبہ کم سے کم ہو جائے گا اور دشمنوں کے دل سے مسلمانوں کا رعب اور ان کا وقار بھی ختم ہو جائے گا(۸)، ایک دوسرا رجحان یہ بھی ہے کہ انتہائی سخت ضرورت جس کا اندازہ ارباب حل عقد نے کر لیا ہو جس میں مسلمانوں سے جنگ بندی کے لئے دشمن کو پیسے دینے کے سواء کوئی چارہ نہ ہو تو ایسی صورتحال میں دشمن کو مالی رقم دی جا سکتی ہے، جبکہ ایسا کرنا استثنائی حالات کے تحت اور مختصر مدت کے لئے ہو(۹)، اس سلسلے میں تاریخ وفقہ کی کتابیں ان مذاکرات کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو امیر معاویہؓ اور اہل روم کے درمیان ہوئے تھے، جن میں یہ بات طے پائی تھی کہ مسلمان اہل روم کو مالی جزیہ ادا کریں گے اور اس کے عوض وہ مسلمانوں سے اس وقت تک کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ نہیں کریں گے جب تک مسلمان خلیفہ علی بن ابی طالب کے مقابلہ میں داخلی فتنوں میں مشغول رہیں گے، اس طرح خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اہل روم سے بات چیت کی، جس میں یہ طے پایا کہ مسلمان انہیں مالی رقم دیں گے اور وہ اس کے عوض جب تک مسلمان عراق میں باغیوں سے جنگ کرتے رہیں گے اس وقت تک مسلمانوں پر حملہ کرنے سے باز رہیں گے(۱۰)۔

۸- الشافعی، الأم، القاہرۃ، المطبعۃ الأمیریۃ، ۱۳۲۱ھ، اگرچہ وہ دشمن کو دوران جنگ جزیہ دینے میں کوئی ممانعت نہیں رکھتے جب مسلمانوں کو دشمن کو روکنے میں کمزوری محسوس ہو، بشرطیکہ وہ جزیہ سالانہ شکل میں ہو۔

۹- اس رائے کے مؤیدین میں فقہاء احناف، امام اوزاعی اور سفیان ثوری شامل ہیں، اس بارے میں دیکھیں: الطبری کی اختلاف الفقہاء، مرجع سابق، ص:۱۷-۲۰، أبو یوسف، الخراج، القاہرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، الطبعۃ الرابعۃ، ۱۳۹۲ھ، ص:۲۰۷، الشوکانی نیل الأوطان، مرجع سابق، ج:۸، ص:۵۱۔

۱۰- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص:۲۰، ۱۷۔ دکتور مجید خدوری، الحرب والسلم فی شرعۃ الإسلام، بیروت، الدار المتحدۃ للنشر، ۱۹۷۳ء، ص. ۲۸۸۔

تیسرا مطلب

اسلام میں مذاکرات کے شرعی دلائل

کتاب وسنت میں بہت سے دلائل ایسے ہیں جو تفاوض (مذاکرات) کی مشروعیت کو اس طرح واضح کرتے ہیں کہ مذاکرات اسلامی مملکت کے لئے خارجہ تعلقات کے طے شدہ مقاصد کی تنفیذ کا ایک ذریعہ ہیں، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ''**وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله**'' (اگر وہ صلح کے لئے تیار ہوں تو تم بھی صلح کے لئے تیار ہوجاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو)، ''**إلا الذين يصلون إلى قوم بينكم وبينهم ميثاق، فإن جاء وكم حصرت صدورهم أن يقاتلوكم أو يقاتلوا قومهم ولو شاء الله لسلطهم عليكم فلقاتلوكم، فإن اعتزلوكم وألقوا اليكم السلم، فما جعل الله لكم عليهم سبيلا**'' (سوائے ان لوگوں کے جو ایسی قوم سے جا ملیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو یا تمہارے پاس اس حال میں آئیں کہ تم سے جنگ کا حوصلہ نہ پاتے ہوں، ان کے دل تم سے یا خود اپنی قوم سے جنگ کرنے سے تنگ ہوں اور اللہ چاہتے تو انکو تم پر مسلط کر دیتے، چنانچہ وہ تم سے جنگ کرتے، لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، جنگ نہ کریں اور تم سے صلح کی پیش کش کریں تو اللہ نے ان کے خلاف تمہارے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے)، ''**وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه، ذلك بأنهم قوم لايعلمون**'' (اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دے دیں تاکہ وہ اللہ کا کلام سنے، پھر اس کو اس کی امن کی جگہ پہنچا دیں، یہ اس لئے کہ یہ ناواقف لوگ ہیں)۔ ''**قل يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله، فإن تولوا فقولوا**

اشهدوا بأنا مسلمون"(۱۱)(اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان مشترک ہے، کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے، نہ کسی کو اس کا شریک ٹھہرائیں گے اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے گا، پھر اگر وہ منہ موڑ لیں تو کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو فرمانبرداری پر قائم ہیں)۔

مذکورہ تمام آیتیں اس بات سے متعلق ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان امن، مصالحت اور ایک دوسرے سے عدم تعرض کی فضا قائم رہنی چاہئے، اور اس دعوی سے متعلق ہیں کہ فریقین کے سامنے امن و آشتی اور مصالحت کی حالت کو منظّم و مستحکم رکھنے والے احکام وقواعد اور ایسے اصول وضوابط پر معاہدہ واتفاق کی کوئی صورت ممکن نہیں ہوسکتی سوائے اس کے کہ ان پر امن ذرائع کو بروئے کار لایا جائے جن میں ایک دوسرے کے احترام اور افہام وتفہیم کے ماحول میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال ممکن ہو سکے، اس کے علاوہ دوسری شکلیں بھی موجود ہیں جو اصلا گزشتہ سطور میں مذکور مذاکرات کے مفہوم سے مختلف نہیں ہیں، اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ دشمن کے مسلمانوں سے مفاہمت ومصالحت کے جھکاؤ کو تسلیم کرلیا جائے، چاہے یہ جھکاؤ وقتی ہی کیوں نہ ہو، تاکہ دشمن اسلام کی بجائے اپنے دین پر قائم رہے مگر مسلمانوں پر حملہ نہ کرے، یہ عارضی طور پر ہو یا یہ جھکاؤ مستقل طور پر ہو کہ دشمن یہ اعلان کرے کہ ہم اسلام تو قبول کرلیں گے یا اسلامی نظام کی قیادت وسیادت کو تو تسلیم کرلیں گے مگر ظاہرا اسلام کے علاوہ دوسرے مذہب سے اپنا رشتہ باقی رکھیں گے، اسی طرح مسلمانوں کی طرف سے ان لوگوں کے لئے مصالحتی اقدام کیا جائے جن کا اسلامی مملکت سے معاہدہ کے تحت ربط قائم ہو یا ایسے شخص کے لئے جو امن وامان کی غرض سے اسلامی مملکت کا رخ کرے۔

اس طرح کے حالات کی تکمیل اسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب تک کہ ان مملکتوں اور جماعتوں سے گفت وشنید کا سلسلہ جاری نہ ہو جو اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب پر کاربند

۱۱- بالترتیب ان میں دیکھیں: سورۂ أنفال: ۶۱، سورۂ توبہ: ۶، سورۂ آل عمران: ۶۴۔

ہیں(۱۲)، یہ صورت حال سب سے پر زور انداز میں گزشتہ آیات میں سے سب سے اخیر والی آیت سے واضح ہوتی ہے، وہ ہے :"**یا أهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم**" جس میں سیاق یہ بتلاتا ہے کہ توحید کو اہل کتاب وغیرہ کی دعوت کا مرجع واساس بنایا جائے، اور وہ توحید ہی فریقین کی باہمی گفت وشنید اور مذاکرات کا بنیادی نکتہ اور مرجع کا فریم ورک قرار پائے، جس سے تجاوز کو درست نہ سمجھا جائے، بالفاظ دیگر توحید اور اس کی دعوت پر استقامت ہی، مذکورہ آیت کے سیاق کے مطابق مذاکراتی عمل کی حد بندی اس طرح کرے کہ کسی بھی اسلامی مملکت کے لئے غیر مسلموں سے مذاکرات کرتے وقت اس سے ہٹنا درست نہ ہو، ضمنی طور پر جو حکم مستفاد ہوتا ہے وہ یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ مذاکرات کا عمل جاری رکھنا مشروع ہے، مگر اس شرط پر کہ مذاکرات ایک تسلیم شدہ اور متعین عمومی اصول یعنی توحید کے دائرہ میں ہوں، چنانچہ جب مذاکرات دوسرے مذاکرات کار کو اس مشترک نکتہ تک پہنچانے میں ناکام ہوجائیں تو اس وقت مذاکرات کا اختتام طے ہوجاتا ہے، اور پہلے سے مذاکرات کے لئے متعین کئے گئے موقف پر قائم رہنا لازم ہوجاتا ہے، اس موقف کی تاکید وتائید "**ولاتجادلوا أهل الكتاب الا بالتى هى أحسن**" (۱۳)(اور اہل کتاب سے اچھے اسلوب سے مجادلہ کرو،) جیسی آیت کریمہ سے بھی ہوتی ہے، کیونکہ مجادلہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے باہمی گفتگو، مذاکرات اور نقطہائے نظر کے تبادلہ سے زیادہ نہیں ہے، اور مسلمانوں کو آیت کے تقاضے کے مطابق اچھے اسلوب کی پیروی کا حکم دیا گیا ہے، جب وہ اہل کتاب سے ہم کلام ہوں یا انہیں حق کی دعوت دیں (۱۴)، اس سے بھی بڑی دلیل اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے:"**أدع إلى سبيل ربك**

۱۲- ابن کثیر، تفسیر القران العظیم، بیروت دار المعرفۃ، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ج ۳، ص:۱۰۹، القرطبی، الجامع لأحکام القران، القاہرۃ، دار الکتب العربی، ۱۹۷۶ء، ابن العربی، أحکام القران، مرجع سابق، ج:۸، ص:۷۴، دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ص:۱۷-۱۸، الشوکانی، السیل الجوار المتفق علی حدائق الأزہار، (تحقیق) محمد إبراہیم زاید، بیروت، دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ الأولی، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۵ء، ص: ۵۶۴۔

۱۳- سورۂ عنکبوت:۴۶۔

۱۴- القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، (الطبقۃ الثانیۃ) ج ۱۳، ص ۳۵۰-۳۵۱۔ ابن کثیر تفسیر

بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن''(اپنے رب کے راستہ کی دعوت دیجئے حکمت اور نصیحت کی اچھی اچھی باتوں کے ذریعہ اور ان سے اچھے اسلوب سے مجادلہ کیجئے)۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ غیر مسلموں سے مذاکرات کریں، تاکہ انہیں حق کا راستہ دکھائیں، اور انہیں حکمت ودانائی پر مبنی باتوں کے ذریعہ نیز مطمئن کرنے والے انداز کلام اور مفید وسبق آموز مثالوں سے کام لیتے ہوئے حق کی دعوت دیں، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے فریق یعنی غیر مسلموں سے اچھے طریقے پر یعنی مناظرہ کا جو اچھا طریقہ ہوتا ہے مناظرہ کرنا چاہئے، وہ اس طرح کہ طریقہ کار میں نرمی ہو، زبان آسان ہو اور انہیں مطمئن کرنے کی خاطر مشہور متعارف حقائق سے زیادہ سے زیادہ مثالیں دی جائیں، یہ ساری تفصیلات اس تفاوض (مذاکرات) کے دائرہ میں شامل ہیں، جس کی وضاحت گزشتہ صفحات میں کی جاچکی ہے(۱۵)، مثال کے طور پر یہ کہنے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہی کہ گزشتہ آیات سے جس طرح 'تفاوض' (مذاکرات) کی مشروعیت پر استدلال کیا گیا ہے اسی طرح سے روایت سے ثابت شدہ چند واقعات سے مزید تقویت حاصل ہوتی ہے، مثال کے طور پر یہ کہ حضور ﷺ نے مکہ اور مدینہ میں رہنے والے مشرکین کے ساتھ ایک سے زائد موقع پر طرح طرح سے مذاکرات کئے، چاہے معاملہ اسلام کی دعوت کا رہا ہو، یا فریقین کے درمیان

القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ص ۳۱۵-۴۱۶، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ بعض حضرات اس آیت کو محکم مانتے ہیں ان میں سے اس شخص کے لئے جو دین کے احکام کو جاننا اور سمجھنا چاہتا ہے، جبکہ بعض حضرات اسے منسوخ مانتے ہیں کہ وہ حکم تلوار والی آیت سے منسوخ ہوگیا، کیونکہ اب ان کے سامنے مباحثہ کا دروازہ بند ہوگیا تو پھر وہ اسلام قبول کریں یا جزیہ دیں یا تلوار کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہیں۔ ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ۱۳/ ۷۵ ۱۴۔ الشنقیطی، أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن، الریاض، الرئاسة العامة لإدارة البحوث العلمیة والإفتاء والدعوة والإرشاد، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء۔

۱۵- أبوالسعود، تفسیر أبوالسعود، المسمی إرشاد العقل السلیم إلی مزایا القرآن الکریم، بیروت، دار إحیاء التراث العربی، د. ت. ج ۳ ص ۳۰۳-۳۰۴۔

جنگ شروع ہونے کے بعد کے حالات زیر غور ہوں، اسی طرح آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے نمائندہ سہیل بن عمرو سے مذاکرات کئے، اسی ذیل میں وہ مذاکراتی گفتگو بھی ہے جو آپ ﷺ نے بنونضیر کے ایک یہودی کے ساتھ کی، جب وہ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ اپنے ان دو قتل کئے گئے ساتھیوں کی دیت کے سلسلے میں مدد طلب کرتے ہوئے مسلمانوں کے پاس آیا جنہیں کسی مسلمان نے غلطی سے قتل کر دیا تھا، اسی طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ کے دوران جنگ بندی کرانے کی غرض سے ابوسفیان کے ساتھ بات چیت کی (۱۶)۔

اسلامی اصولوں کی روشنی میں اسلامی مملکت کے لئے خارجہ تعلقات کو منظّم اور بحال رکھنے کی خاطر مذاکراتی گفتگو کو جو مشروع قرار دیا گیا ہے، اس پر خلافت راشدہ کے بعد جو حکومتیں قائم ہوئیں ان کا عمل جاری رہا، اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مذاکرات اس طرح کے تعلقات کو منظّم کرنے کے ذریعہ کے طور پر نیز مطلوبہ مقاصد تک رسائی کے لئے کس قدر اہم اور کارگر ہیں، اس سلسلے میں سب سے نمایاں مثالیں ان مذاکرات کی ہیں جو ایک طرف عباسی اور اموی حکومتوں کے درمیان اور دوسری طرف رومیوں اور یورپیوں کے درمیان ہوئے (۱۷)۔

۱۶- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق۔ الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۱۶-۳۲۔
دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۱۸- دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ص ۶۲ اور اس کے بعد کے صفحات۔
دکتور عون الشریف قاسم، نشأۃ الدولۃ الإسلامیۃ علی عہد رسول اللہ ﷺ، دراسۃ فی وثائق العہد النبوی، دار الکتب الإسلامیۃ، ۱۹۸۱م، ص ۴۳ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۷- اس کی تفصیل درج ذیل کتب میں دیکھیں:
دکتور إبراہیم أحمد، السفارات الإسلامیۃ إلی أوروبا فی العصور الوسطی، ص ۱۲، ۲۰، ۹۳، ۱۰۰-۱۱۲۔
دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۰-۲۲۔
دکتور عبد المنعم ماجد، التاریخ السیاسی للدولۃ العربیۃ (عصر الخلفاء الأمین، ج ۲)، القاہرۃ، الأنجلو المصریۃ، ط ۷، ۱۹۷۲، ص ۷۲ اور اس کے بعد کے صفحات۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الإسلام، القاہرۃ، الأنجلو المصریۃ، ۱۹۸۶ ص ص ۷۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔

چوتھا مطلب

مذاکرہ کی تیاری

گذشتہ تفصیلات کا خلاصہ یہ نکلا کہ اسلامی اصولوں اور اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی ممالک کا عمل اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کے لئے مذاکرات سے استفادہ کرنا مشروع کام ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کے ذرائع کا استعمال اسی وقت مؤثر ومفید ثابت ہوگا جب کہ کسی بھی مذاکراتی عمل کے لئے جس میں شامل ہونے کا مسلمان پختہ ارادہ رکھتے ہوں، پہلے سے اس کی مکمل تیاری اور منصوبہ بندی کر لی جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر کتاب وسنت کے ان تمام احکام کا جن سے قریب یا دور سے مذاکرات اور اس سے استفادہ کی مشروعیت، اسلامی مملکت کے لئے ثابت ہوتی ہے، جائزہ لیا جائے، اور اسی طرح اسلام کے دور اول میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان کی چھان بین کی جائے تو واضح ہوجاتا ہے کہ مذاکرات کی تیاری کا عمل کئی طرح کے تعلقات پر مشتمل ہوتا ہے، سب سے پہلے حاکم یا امام اور گفتگو یعنی مذاکرات پر مامور فریق کے درمیان تعلقات کو منظّم کیا جاتا ہے، دوسرے نمبر پر گفتگو پر مامور فریق کے افراد کے درمیان تعلقات منظّم کئے جاتے ہیں تیسرے نمبر پر تعلقات کے ان پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے جو مذاکرات کی دونوں سمتوں کو طے کرتے ہیں۔

رہی بات مملکت کے سربراہ (صدر، امام یا خلیفہ) اور اس فریق کے درمیان استوار کئے جانے والے تعلقات کی جسے مذاکرات کے لئے منتخب کیا جائے، تو اس کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ مملکت کا سربراہ ازخود مذاکرات پر مامور کی جانے والی ٹیم کے افراد کا انتخاب کرتا ہے، اور حدیث میں دور اول کی اسلامی مملکتوں کا عمل بتلاتا ہے کہ مذاکرات کے لئے مامور کئے جانے

والے وفد کے اراکین کا انتخاب چند متعینہ بنیادی پہلوؤں پر غور وخوض کے بعد ہوتا تھا، اس کے لئے ان میں چند صفات کا پایا جانا ضروری تھا، ساتھ ہی یہ بھی دیکھا جاتا تھا کہ وہ شخص مذاکرات کے درمیان دوسرے فریق کے موقف کو اپنی گفتگو میں کس حد تک مدنظر رکھتا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے قریش سے مذاکرات کے لئے حدیبیہ میں وفود ومشاورت کے تبادلہ کے دوران حضرت عثمان بن عفان کو منتخب فرمایا وہ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ﷺ قریش کے درمیان حضرت عثمانؓ کے مقام ومرتبہ سے واقف تھے، اس موقع پر قریش نے آپ ﷺ کی خدمت میں زیادہ وفود بھیجے تاکہ انہیں مسلمانوں کے عزم وارادے کے متعلق اعتماد واطمینان ہوجائے۔

جبکہ قریش نے آپ ﷺ کی طرف سے بھیجے گئے وفد کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا تھا(۱۸)، مذاکراتی وفد کے لئے متعینہ صفات سے متصف ہونا ضروری ہے، اس کا تاکیدی ثبوت آپ ﷺ کے اس نامہ مبارک سے ملتا ہے جو آپ ﷺ نے اہل یمن کے لئے روانہ فرمایا تھا، جس میں ہے: ''میں نے آپلوگوں کے پاس اپنے ہاں کے نیک، دین دار اور اصحاب علم کو بھیجا ہے'' (۱۹)، فقہاء اور مؤرخین کے بیان کے مطابق خلفاء اور مسلمان امراء کی یہی خواہش رہی ہے کہ اسلامی مملکت کی طرف سے مذاکرات کے لئے مامور کی گئی ٹیم کے افراد کو چند جسمانی، اخلاقی، ثقافتی اور سماجی صفات سے آراستہ ہونا چاہئے، ان کا حاصل یہ ہے کہ وہ جسمانی اعتبار سے تندرست ہوں، تمام ظاہری وباطنی نقائص سے پاک ہوں، خوبرو ہوں، خوبصورت لباس تن کئے ہوئے ہوں، اپنی رائے کی تنفیذ پر قادر ہوں، پختہ عقل کے مالک ہوں، اظہار مافی الضمیر پر قادر ہوں، حاضر جواب ہوں، جرأت واقدام کے ساتھ استقامت کے وصف سے بھی متصف ہوں، انہیں سیرت، تاریخ اور شریعت کے احکام سے پوری واقفیت ہو، اور جہاں تک ہوسکے مذاکرات

۱۸- دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الإسلام، القاہرۃ، الأنجلو المصریۃ، ۱۹۸۶ء، ص ۸۶، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲۔

۱۹- محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، بیروت، دار النفائس، الطبعۃ الرابعۃ ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ص ۱۸۲۔

کے موضوع سے متعلق خصوصی اور وسیع معلومات حاصل ہوں، ساتھ ہی خاندانی شرافت کے حامل ہوں، اس لئے کہ یہ صفت اس بات کی ضامن ہے کہ ان کا برتاؤ اور عمل اچھا ہوگا (۲۰)۔

اس کی تطبیقی مثال یہ ہے کہ خلیفہ یا امام کی یہ چاہت ہوتی ہے کہ مسلمان مذاکرات کار کے انتخاب میں مذکورہ صفات کا اعتبار کیا جائے، حضرت عمر فاروقؓ کا یہ قول ہے: ''تمہیں اجازت دی جائے تو وہ نام پیش کرو جو تم میں سب سے اچھا ہو، اور جب تم اندر داخل ہو جاؤ تو ہم تم میں سے جو خوبرو ہوگا اسے ترجیح دیں گے، جب تم بولو گے تو تمہاری زبان تمہارے درمیان امتیاز پیدا کردے گی، اس لئے کہ بادشاہ کی آنکھیں پیامبروں میں جو قابل دید ہوتے ہیں انہیں بڑی جلد پہچان لیتی ہے'' (۲۱)، حضرت عمرو بن العاصؓ نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کا انتخاب فرمایا تاکہ وہ مصر کے مقوقس کے سامنے قوم کی ترجمانی کرسکیں، جب مؤخر الذکر نے مسلمانوں سے مذاکرات پر آمادگی ظاہر کی، کیونکہ مسلمانوں نے مصر کی حصار بندی سخت کردی تھی، اور حضرت عبادہ بن صامتؓ کے حسن انتخاب کی دلیل اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتی ہے کہ مقوقس نے ان کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ''ان کی گفتگو کی ہیبت اور رعب ان کی شکل وشباہت کی ہیبت سے کہیں بڑھ کر ہے''۔

اسی طرح عبدالرحمٰن اوسط جو اندلس کے امیر تھے نے یحیی الغزال کو نورمان کے سفراء سے ان مباحثوں میں حصے لینے کے لئے منتخب کیا جو دونوں فریقوں کے درمیان ہوئے، جس کا مقصد یہ تھا کہ یورپ کے شمال میں واقع نورمان اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بندی ہوجائے، کیونکہ یحیی اپنی دانائی، حکمت پسندی، حاضر جوابی اور حسب ونسب کی شرافت کے حوالے سے اچھی شہرت رکھتے تھے، عبدالملک بن مروان نے عامر بن شراجیل کو منتخب کیا تاکہ وہ بازنطینی شاہی

۲۰- ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح للرسالۃ والسفارۃ، (تحقیق) صلاح الدین المنجد، بیروت، دارالکتاب الجدید ۱۹۷۲ء، ص ۱۱۳۔

۲۱- سابقہ مرجع، ص: ۴۷۔

محل سے مذاکرات کریں، کیونکہ عراق کے حکمراں حجاج بن یوسف ثقفی نے انہیں نامزد کیا تھا، اور خلیفہ نے ان کے علم وحکمت کے بارے میں اطمینان کرلیا تھا، وہ اس طرح سے کہ انہوں نے بادشاہ کی طرف سے علم وعقل نیز کلام عرب کے مختصر وفصیح حصے کی حقیقت وماہیت سے متعلق کئے گئے سوالات کے جوابات دیئے تھے، جن کی روشنی میں بادشاہ کے لئے ان کی دانائی ودور بینی کا اندازہ کرلینا آسان ہوگیا تھا(۲۲)۔

مذاکرات سے متعلق گروپ کی تشکیل کے بعد یہ معمول ہے کہ مذاکرات کی مملکت کے سربراہ اعلی اور مذاکرات کار گروپ کے درمیان ایک میٹنگ کی جاتی ہے، جس میں اصلا مذاکراتی موقف کے بنیادی خدوخال کی تعیین پر گفتگو کی جاتی ہے، ساتھ ہی حاکم وقت کی طرف سے مذاکراتی عمل کے طریقہ کار، بنیادوں اور مذاکراتی مراحل کی پیش رفت سے متعلق اہم ہدایات دی جاتی ہیں۔

ان نصیحت آمیز باتوں اور ان رہنما اصولوں میں جو نکتہ سرفہرست ہوتا ہے وہ یہ کہ مسلم مذاکرات کار مسلمانوں کے مفاد کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھے جب وہ دوسرے فریق سے گفتگو کرے، اور اس سلسلے میں مفاد کا دائرہ اس حد تک وسیع ہے کہ اس میں ہر وہ شئ داخل ہوسکتی ہے جس سے مسلمانوں کے لئے شرعی مفاد کی تکمیل اور مسلمانوں کے حق میں دفع مضرت ممکن ہوسکے، اس طرح کہ مذاکرات کار حقیقت کی نگاہ سے مسلمانوں کی صحیح صورتحال یعنی ان کی طاقت وقوت اور کمزوری کا صحیح ادراک کرلے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ میں مشرکین مکہ سے صلح کی اور صلح میں زیادہ تر شرائط مشرکین کی تسلیم کرلیں اس امید میں کہ وہ آئندہ اسلام قبول

۲۲- المسعودی، مروج الذہب، القاہرۃ، مطبعۃ بولاق، ۱۲۸۳، ج ۳، ص ۱۲۴۔ ابن خلکان، وفیات الأعیان وأبناء الزمان، (تحقیق) إحسان عباس، بیروت، دار الثقافۃ، ۱۹۷۱، ج ۲، ص. ۲۲۷۔ دکتور إبراہیم أحمد، مرجع سابق، ص ۱۰۴-۱۰۷۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، مرجع سابق، ص ۲۱-۳۲۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، مرجع سابق، ص ۶۶-۶۸۔

کرلیں گے، اور آئندہ حج کے لئے مکہ جانے کی خواہش پوری ہوجائے گی (۲۳)، اسی طرح آپ ﷺ نے فتح مکہ کے سال صفوان بن امیہ سے چار مہینے کے لئے مصالحت کی، باوجودیکہ مسلمان طاقت وشوکت اور غلبہ وتسلط کے مرکز میں زندگی بسر کررہے تھے، لیکن آپ ﷺ اس مصالحت کے پیچھے صفوان بن امیہ کے اسلام میں داخل ہونے کی امید وابستہ کئے ہوئے تھے، جو عملی طور پر مصالحت کی مدت ختم ہونے سے پہلے ہی پوری ہوگئی (۲۴)۔

بہرحال وہ مصلحت جو اسلامی مذاکرات کار کو اپنے مخالف فریق سے مذاکرات کرتے وقت مطلوب رہتی ہے، ضروری ہے کہ وہ اپنے مزاج ومذاق کے اعتبار سے شریعت کے دائرہ میں ہو، اور اس کا اصل محرک بھی اسلامی شریعت سے کلی موافقت رکھتا ہو، ساتھ ہی مذاکرات کے دوران اس مصلحت کی تکمیل کے طریقہ کار اور منہج کی وضاحت بھی ہو، اور یہ سارے امور مسلم حکمراں اور مذاکرات کار گروپ کے درمیان مسلسل مشاورت کے ذریعہ مکمل ہونے چاہئیں، جبکہ باہمی مشاورت کا عمل حکمراں کے لئے شرعی سیاست کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے اجتہاد کے لئے طے کئے گئے دائرہ میں ہو (۲۵)، اس سلسلے میں اس واقعہ کو بطور مثال پیش کیا جاسکتا ہے، جس میں سیدنا عمر بن خطابؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ کو مشورہ دیا جو اہل روم سے مذاکرات کر رہے تھے کہ وہ ان کے ساتھ ایک معاہدہ کریں جو شام کے شہروں میں مسلمانوں کے قیام کو منظّم

۲۳- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق ۲/ ۷۴۔ دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۸۰-۲۸۱۔

۲۴- ابن رشد القرطبی، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، (تحقیق) دکتور محمد محمد سالیم محیسن، دکتور محمد شعبان إسماعیل، القاہرۃ، مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ، ۱۳۹۴ھ/ ۱۹۷۴ء، ج ۱، ص ۳۷۴۔
دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۰-۲۱۔

۲۵- الطبری، إختلاف الفقہاء، مرجع سابق، ص، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جسے فقہ کے ایک رجحان نے اختیار کیا ہے کہ اگر دشمن مسلمان کے قلعہ پر اتر آئے اور مسلمانوں میں اسے دفع کرنے کی طاقت نہ ہو، تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ وہ دشمن سے صلح کرلیں اس شرط پر کہ وہ دشمن کو اپنا مال، اسلحہ، اور گھوڑا دے دیں، بشرطیکہ وہ (دشمن) وہاں سے کوچ کرجائے۔ مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۸۸۔

کرنے والے احکام وقوانین سے متعلق ہے، وہ اس طرح کہ لازمی طور پر معاہدہ میں دو شرطوں کو شامل کیا جائے، جن میں اس چیز کی صراحت کی گئی ہو کہ اہل روم مسلمانوں کے قیدیوں کو ہرگز نہیں خریدیں گے، اور ہر وہ آدمی جو کسی مسلمان کو قصداً مارے گا وہ معاہدہ سے باہر ہو جائے گا، حضرت عبد الرحمٰن بن غنم نے شام کے شہروں میں جو رومی مقیم تھے انہیں مذکورہ دونوں شرطوں کے تقاضوں کے مطابق ان کی حالت پر برقرار رکھا(۲۶)۔

اس طرح حاکم وقت کی ہدایات مذاکرات کار فریق کے حق میں بہت ہی وسعت کی حامل رہی ہے، جس میں یہ پہلو بھی شامل ہے کہ مذاکرات کار گروپ اعلی صفات سے آراستہ اور اچھے اخلاق وکردار کا حامل ہو، اور فریق مخالف سے مذاکرات کرتے وقت احتیاط و لچک پر کاربند رہے، ساتھ ہی دیگر چیزوں کی پابندی بھی ضروری ہے، جیسے فریق مقابل سنجیدہ رہے اور مسلمانوں سے مذاکرات کرنے کے عمل میں حسن نیت کا پیکر رہے۔

بالعموم ایسا ہوتا ہے کہ حاکم وقت مذاکرات کار گروپ کو اجازت نامہ دیتا ہے، جو مذاکرات کی اجازت ثابت کرتا ہے، اس میں یہ درج ہوتا ہے کہ اس گروپ کے مذاکرات اسلامی مملکت کی طرف سے ہوں گے، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ مذکورہ گروپ کو حاکم وقت کی طرف سے مذاکرات کی منظوری دی گئی ہے، اس میں ساتھ ہی مذاکرات کا مقصد اور یہ بھی درج ہوتا ہے کہ اسلامی فریق کی خواہش ہے کہ مذاکرات اس نتیجہ تک پہنچیں جس سے فریقین کے مصالح پورے ہوں(۲۷)۔

رہی بات مذاکرات کار گروپ کے افراد کے باہمی تعلقات کی، تو ان کی بنیاد ایک دوسرے کے احترام اور باہمی محبت واخلاص ہوتی ہے، جس میں اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ جو

۲۶- ابن قیم الجوزیۃ، أحکام أہل الذمۃ (تحقیق د. صبحی الصالح)، بیروت، دار العلم للملایین، ۱۹۸۳ء، ج ۲ ص ۶۵۷-۶۵۸۔

۲۷- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص: ۲۳۔

بھی اقدام کیا جائے اس کی بنیاد شوری پر ہو، جس میں ہر فرد برابر کی حیثیت کا حامل ہو، کوئی فرد اپنی رائے کو قطعی نہ سمجھے، اور نہ اپنے دوسرے بھائی کی رائے کے مقابل کوئی منفرد رائے اختیار کرے، یا اگر معاملہ ایسا ہو جس میں اُولی الامر سے رجوع کرنا مطلوب ہو، تو اس میں بھی انفرادیت درست نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالی کا قول ہے: "والذین استجابوا لربهم وأقاموا الصلاة وأمرهم شوری بینهم"(۲۸)(جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں) اور اللہ تعالی کے اس قول پر بھی عمل کرتے ہوئے "وشاورهم فی الأمر فإنا عزمت فتوكل علی الله"(۲۹)(اور دین کے کام ان کو بھی

۲۸- سورۂ آل عمران: ۱۵۹۔

۲۹- مراجعت کریں: سورۃ الشوری: ۳۸۔ اور اس میں دیکھیں: ابن العربی أحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۱، ص ۲۹۷-۲۹۹، ج ۳، ص ۱۴۴۷-۱۴۴۸، ج ۴، ص ۱۶۵۵۔ کیونکہ وہ اس رائے کے قائل ہیں کہ اللہ تعالی کا فرمان: ''اور ان سے مشورہ کرو معاملے میں'' اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ مشورہ کا مقصد باہم مشورے سے کسی معاملے پر جمع ہونا ہے، تاکہ ہر شخص اپنے ساتھی سے رائے لے اور جو کچھ اس کے پاس (علم یا رائے) ہے، اس سے حاصل کرے۔

محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۶۳-۱۶۸، ج ۵، ص ۱۶۰ اور اس کے بعد کے صفحات، "اور اس آیت 'وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ' (اور ان سے امور میں مشورہ کرو) سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا امت کے عمومی امور میں مشورہ کرنا، جیسے جنگ و امن، خوف و امان اور دیگر دینی و دنیاوی مصلحتوں کے معاملات میں ان سے مسلسل مشورہ لینا، جیسا کہ غزوۂ احد سے پہلے کیا۔ اگرچہ صحابہ کرام نے اس موقع پر رائے میں غلطی کی، لیکن نبی کریم ﷺ نے ان کی تربیت اس طریقے پر کی کہ وہ مشورے کے اصول پر کاربند رہیں، نہ کہ صرف حاکم (رئیس) کی رائے پر، چاہے وہ رائے درست ہی ہو۔ کیونکہ اس میں ان کے لیے مستقبل کی حکومت سازی میں فائدہ ہے، اگر وہ اس عظیم ستون (مشورہ) کو قائم رکھیں۔ اور یہ بات بھی واضح ہے کہ عام لوگوں کی اجتماعی رائے اکثر ایک فرد کی رائے سے زیادہ درست ہوتی ہے، اور اگر ایک امت اپنے تمام معاملات ایک ہی شخص کے سپرد کر دے تو اس میں بڑا خطرہ ہوتا ہے۔

اس آیت میں 'الأمر (معاملہ) سے مراد دنیاوی امور ہیں جنہیں عام طور پر حکمران سنبھالتے ہیں، نہ کہ دین کے وہ امور جو وحی پر مبنی ہوتے ہیں اور جن میں رائے کی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ سے نہایت نرمی اور محبت کے ساتھ مشورہ کرتے، ہر بات کو توجہ دیتے۔ اور صحابہ کرام کی رائے کے سامنے اپنی رائے سے رجوع کر لیتے، تمام دنیوی امور میں، جیسا کہ غزوہ بدر کے دن پیش آیا، جب رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ایک مقام پر قیام کرنے کا حکم دیا، تو حضرت حباب بن المنذر بن الجموحؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا یہ جگہ اللہ تعالی کے حکم سے طے کی گئی ہے کہ نہ ہم آگے جا سکتے ہیں نہ پیچھے؟ یا یہ صرف آپ کی رائے ہے، جو جنگی تدبیر پر مبنی ہے؟ نبی ﷺ نے فرمایا: نہیں یہ میری ذاتی

شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہوجائے تو اللہ پر بھروسہ کرو) اور حدیث سے ثابت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس آیت کریمہ کے نازل ہوتے وقت فرمایا: اللہ اور اس کے رسول ﷺ اس سے بے نیاز ہیں، لیکن اللہ نے اسے میری امت کے لئے ذریعہ رحمت بنایا ہے، لہذا میری امت میں سے جو کوئی مشورہ کرے گا وہ راہ حق سے محروم نہ ہوگا، اور جو مشورہ نہیں کرے گا وہ گمراہی سے محفوظ نہیں رہے گا (۳۰)، آپ ﷺ ہمیشہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو اسے صحابہ کرامؓ کے سامنے ان کی رائے لینے کی غرض سے پیش کرتے بالخصوص اگر مسئلہ ایسا ہوتا جس میں انسانی اجتہاد کی گنجائش ہو۔

شرعی سیاست کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کی مثالوں میں ایک مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ آپ ﷺ نے غزوہ بدر واحزاب میں مسلمانوں کے قیام کی جگہ کی تعیین اور دشمن سے مقابلہ کے طریقہ (۳۱) کے سلسلے میں اپنی رائے سے تنازل کرتے ہوئے اپنے اصحاب کی رائے کو ترجیح دی، اس طرح آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے معاہدہ طے ہونے سے پہلے قریش کے احوال دریافت کرنے کی غرض سے

رائے ہے، تو حضرت حبابؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ جگہ مناسب نہیں ہے، آپ لوگوں کو لے کر آگے بڑھیں اور دشمن کے قریب ترین پانی کے چشمے پر ڈیرہ ڈالیں پھر ہم اس سے آگے کے پانی کو بند کردیں گے، نبی ﷺ نے فرمایا: تم نے بہت اچھا مشورہ دیا، اور آپ ﷺ نے اسی مشورہ پر عمل فرمایا۔

۳۰- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۱۷-۱۱۸۔

القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق (الطبعۃ الثانیۃ)، ج ۴ ص ۲۴۸، ج ۱۶ ص ۳۶۔

۳۱- محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۵، ص ۶۰ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن القیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، (تحقیق) شعیب الأرناؤوط، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۸۱م، ج ۲، ص ۶۲، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۳، ص ۶۷-۶۸۔ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، القاہرۃ، البابی الطبی، ۱۹۵۹ ج ۱۷، ص ۱۰۳-۱۰۴۔ صحیح مسلم بشرح النووی، مرجع سابق، ج ۱۲ ص ۱۲۴۔ دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۱۶۸-۱۷۱۔

قبیلہ خزاعہ سے مسلمانوں کی طرف سے جاسوس کی حیثیت سے حضرت بشیر بن سفیانؓ کو بھیجا، چنانچہ جب آپ ﷺ کی ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے فرمایا: قریش نے آپ کے مقابلہ کے لئے بنی حارث، بنی المصطلق اور بنو قارہ کے متحدہ قبائل کو اکٹھا کرلیا ہے، وہ آپ سے برسر پیکار ہونے والے ہیں اور بیت اللہ سے آپ کو روکنے والے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: مجھے مشورہ دو، تم لوگوں کا کیا خیال ہے کہ میں ان مشرکین کے اہل وعیال پر حملہ کردوں، جو مجھے کعبۃ اللہ سے روکنا چاہتے ہیں، اگر وہ لوگ ہم پر حملہ آور ہوں گے تو اللہ تعالی مشرکین کے ایک گروہ کو ان سے الگ کر چکا ہوگا، بصورت دیگر ہم انہیں ہمیشہ کے لئے شکست خوردہ کردیں گے، سیدنا ابوبکرؓ نے مشورہ دیا کہ ایسا نہ کیا جائے، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، تو اللہ کے نام پر نکل پڑو (۳۲)، اسی کے ساتھ آپ ﷺ نے یوم احزاب کے موقع پر قبیلہ غطفان سے مدینہ کے تہائی پھل پر اس کے عوض کہ وہ لوگ مسلمانوں کے خلاف کی گئی لشکر کشی سے دور رہیں گے، مذاکرات کے سلسلے میں صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا، مگر آخر کار مذاکرات کی تجویز واپس لے لی گئی، اس لئے کہ خود مسلمانوں نے اس سے اختلاف کیا (۳۳)۔

اسلامی مذاکرات کار گروپ کے لئے بہتر یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مذاکرات کار کی تمام سرگرمیوں اور ان ذاتی صلاحیتوں کو مدنظر رکھے جن سے گروپ کا ہر فرد آراستہ ہوتا ہے، اس طرح کہ کسی متعین نقطہ میں یا متعین مسئلہ میں گفتگو کرنے کے لئے اسے آگے کرے جو اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں سے پوری واقفیت رکھتا ہو، اور اسلامی موقف کو کما حقہ پیش کرنے کی لیاقت

۳۲- الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸ ص ۵۱-ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۵-۲۶۔ دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۲۴۵-۲۵۲۔

۳۳- ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲ ص ۸۶۵۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۸، ص ۴۱-ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲ ص ۲۱۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔ الطبری، اختلاف الفقہاء، مرجع سابق، ص ۱۷- دکتور إبراہیم أحمد، السفارات الإسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۱۵-۱۶۔

رکھتا ہو، اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جو اس اسلامی وفد کے ارکان کے درمیان پیش آیا جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے حبشہ کے بادشاہ سے مذاکرات کے لئے بھیجا تھا، اس وفد کے ارکان نے اپنے قبیلے سے ایک قابل رکن حضرت جعفر بن ابوطالب کو اپنا سرکاری ترجمان بنایا، تاکہ وہ پوری اہلیت سے نجاشی کی طرف سے کئے جانے والے سوالات کا جواب دے سکیں، ان کا انتخاب اس لئے ہوا کہ وہ اپنی قابلیت، لیاقت اور صلاحیت میں اپنے معاصر رفقاء سے ممتاز تھے، اور سیرت کی کتابوں میں منقول ہے کہ حضرت جعفرؓ نے اپنی تمام تر لیاقت وصلاحیت کی بناء پر اسلام کی ایسی منفرد تصویر کشی کی جس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے، انہوں نے ایسی حکمت عملی اپنائی، یا مذاکراتی منصوبہ بندی کی جس میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل تھیں:

دور جاہلیت کی خامیوں اور کمزور پہلوؤں پر روشنی ڈالی، پھر اسلام کے اصول وضوابط اور عمومی احکام بیان کئے، پھر اپنے مدمقابل نجاشی کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی، مشرکین کے ہاتھوں مسلمانوں پر روا رکھے گئے مظالم کا تذکرہ کیا، اس کے بعد بالغ نظری اور اعتدال پر مبنی تعریف کی اپنے اس مدمقابل یعنی نجاشی کی جس میں نہ مبالغہ تھا اور نہ اس حقیقت سے عدم واقفیت کہ بادشاہ نجاشی کمزوروں کے ملجا وماوی ہیں (۳۴)۔

رہی بات ان ضروری شرائط کی جو مذاکراتی عمل کے دونوں فریقوں کے باہمی تعلقات

۳۴- منیر محمد الغضبان، المنہج الحرکی للسیرۃ النبویۃ ج ۱، القاہرۃ، دارالأمان، الطبعۃ الثالثۃ، ۱۹۸۷، ص ۹۴-۹۶۔ اور اسی طرح دیکھیں: صحیح مسلم بشرح النووی، مرجع سابق ج ۱۲، ص ۱۰۸۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے جو خطوط پڑوسی ممالک کے بادشاہوں اور امراء کو بھیجے گئے، ان میں خط وکتابت کے آداب اور نرمی واحتیاط کا پہلو واضح طور پر پایا جاتا ہے، نہ کہ حد سے بڑھنے کی روش اپنائی گئی ہے، اور نہ ہی کوتاہی کی گئی ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے ہرقل کو مخاطب کرتے ہوئے روم کا عظیم کہا، روم کا بادشاہ نہیں کہا، اس میں نرمی اور حکمت کا انداز اختیار کیا گیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا حکم ہے کہ جسے اسلام کی دعوت دی جائے تو اس سے نرمی سے بات کی جائے، ''اس سے نرم بات کہو، شاید وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے'' اس میں یہ پہلو بھی ہے کہ حقیقی بادشاہی نہ اس کی ہے اور نہ کسی اور کی، بلکہ بادشاہی کا حق صرف اسلام کے مطابق ہے اور کسی کو اقتدار حاصل نہیں ہوسکتا، جب تک کہ رسول اللہ ﷺ اسے ولایت (اقتدار واختیار) نہ دے دیں۔ اور اسی معنی میں دیکھئے: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ۲۵۳-۱۵۴۔

کے ساتھ خاص ہیں،تو اس سلسلے میں اسلامی اصول اور عہد اول کی اسلامی مملکت کا طرز عمل اشارہ کرتا ہے کہ کچھ ایسے اصول وضوابط کا پایا جانا ضروری اور لازمی ہے جن سے ان مذاکرات کا عمومی فریم ورک تشکیل پاتا ہے، چنانچہ سب سے پہلے اس بنیاد کا تعین ضروری ہے جس پر مذاکرات کئے جائیں، اور دونوں فریق کے لئے اس بنیاد کی پابندی لازم ہو، جو کہ دونوں فریق کے حسن نیت کی دلیل ہوگی اور اس بات کی ضامن ہوگی کہ مذاکرات کا مطلوبہ نتیجہ ہر حال میں حاصل ہو کر رہے گا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عملا مذاکرات شروع ہونے سے پہلے ہی ان کے اصولوں کے تعین پر اتفاق ہو جاتا ہے، یہ ان خطوط ومراسلات کے ذریعے ممکن ہوتا ہے جو دونوں طرف کے ممالک کے حکمرانوں کے درمیان ہوتے ہیں، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ مذاکراتی عمل شروع کرتے وقت مذاکرات کی بنیادوں کو طے کیا جاتا ہے، پھر متفق علیہ بنیادوں کے توسط سے نقطہائے نظر کا تبادلہ ہونے لگتا ہے(۳۵)، اس کی وضاحت اللہ تعالی کے اس قول سے ہوتی ہے :"**قل يأهل الكتاب تعالوا إلى كلمة سواء بيننا وبينكم ألا نعبد إلا الله ولا نشرک به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا أربابا من دون الله فإن تولوا فقولوا اشهدوا بأنا مسلمون**"(۳۶)(" کہو اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنالے' اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم (صرف خدا کی بندگی واطاعت کرنے والے) ہیں) (یعنی وہ عمومی اصول جو عموما اہل کتاب سے مذاکرات میں کلیدی رول ادا کرتا ہے، انصاف اور راہ حق سے عدم انحراف پر مبنی ہے یعنی اس بات پر اتفاق ہو جائے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرنی ہے، اور اس ذات عالی کو شرک سے پاک سمجھنا ہے، اور حرام وحلال کے سلسلے میں

۳۵- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۸۔

۳۶- دیکھئے: حاشیہ ۳۷۔

اس کے دیئے گئے احکام کی تعمیل کرنا ہے۔

مگر جب اس عمومی اصول پر اتفاق نہ ہو سکے تو باہمی مذاکرات کو جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس وقت اسلامی فریق کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ دین اسلام پر ثابت قدم رہے، اور اسلامی احکام کی تعمیل کرے (۳۷) اسی طرح حضور ﷺ نے ۶ھ میں صلح حدیبیہ سے کچھ پہلے فرمایا: اگر مشرکین مکہ مصالحت کے کسی بھی ایسے منصوبہ کے متعلق جس میں وہ اللہ تعالی کے تقدس کا احترام ملحوظ رکھیں گے، مجھ سے کچھ مطالبہ کریں گے تو میں ان کے مطالبہ کو پورا کروں گا (۳۸)، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ باہمی مذاکرات کے لئے عمومی اصول یا ایک ثابت شدہ متفق علیہ بنیاد پر پہل کرنا ضروری ہے، اور وہ مسلمانوں کی نسبت سے اللہ تعالی کا تقدس اور اس کے احکام ونواہی کا پاس ولحاظ ہے۔

اور جو امور مذاکرہ کے اصول وضابطہ کی تعیین وتحدید سے متعلق ہیں ان میں ایک یہ ہے کہ یہ طے کیا جائے کہ مذاکرہ کس جگہ ہوگا اور کس وقت ہوگا، جب ایسا ہوگا تو ایک ہی وقت میں

۳۷- القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۰۶-۱۰۷۔ اور اسی طرح دیکھیں: ابن العربی، أحکام القرآن مرجع سابق، ج ۱ ص ۴۵۱-۴۵۳۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو، اور رسول (ﷺ) کی اطاعت کرو، اور تم میں سے جو لوگ صاحبِ امر ہوں ان کی بھی۔ پھر اگر تم کسی معاملے میں اختلاف کرو، تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو، اگر تم واقعی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو، یہی بہتر ہے اور انجام کے لحاظ سے بہت عمدہ ہے" (سورۃ النساء: 59)۔

اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اسلامی ریاست میں خلیفہ اور مذاکراتی ٹیم کے درمیان تعلقات کی بنیاد کس اصول پر قائم ہونی چاہیے۔ چنانچہ جب کسی معاملے میں اختلاف ہو جائے، مثلاً یہ کہ آیا وہ مسئلہ جاری مذاکرات کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں، تو اس کا فیصلہ شریعت اسلامی کے مطابق کیا جائے گا۔

اگر وہ معاملہ اسلامی احکام سے مطابقت رکھتا ہو تو اس پر مذاکرات جاری رکھنا جائز ہے، اور اگر وہ احکامِ شریعت کے خلاف ہو تو ایسے مذاکرات کو روک دینا یا مکمل طور پر منقطع کر دینا واجب ہوگا۔

۳۸- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۸۔ دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۲۵۲۔

مذاکراتی عمل انجام پذیر ہوجائے گا، یا پھر وہ مرحلہ وار تسلسل کے ساتھ اختتام پذیر ہوگا، جس کے لئے مختلف مراحل وادوار اور تسلسل کے ساتھ اوقات کی تعیین لازم ہوگی، عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے مبارک دور میں اسلامی حکومت کے طرز عمل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے اس میں کوئی فرق نہیں کہ مذاکرات چاہے مسلم ملک میں ہوں یا غیر مسلم ملک میں یا پھر غیر جانبدار کسی ملک میں ہوں، مگر جب جگہ کی تعیین سے بعض شکوک وشبہات پیدا ہونے لگیں یا بعض مشکلات اور نزاکتوں کا دروازہ کھلنے لگے تو اس وقت معاملہ سربراہ مملکت کے حوالہ کردیا جائے گا، وہ اپنی صوابدید اور شرعی پالیسی کے تحت جو مناسب فیصلہ کرنا چاہے کرسکتا ہے(۳۹)۔

جب مذاکرات کے فریم ورک پر اتفاق ہوجائے اور اس عمومی اصول کی تعیین بھی مکمل ہوجائے جس کی روشنی میں باہمی مذاکرات کا سفر طے کرنا ممکن تو مسلم فریق کے مذاکرات کار کے لئے لازم ہوگا وہ اللہ تعالی کی بندگی اور عقیدہ توحید کی عملی صورت میں نمایاں اسلامی مملکت کے بلند وبالا مصالح ومقاصد اور بنیادی اقدار کو اپنے سامنے رکھے، کیونکہ اس عمومی اصول پر ثابت قدمی اور اس میں ذرہ برابر کوتاہی نہ کرنا یا اس سلسلے میں لاپرواہی کا مظاہرہ نہ کرنا مسلم فریق کے مذاکرات کار کے حق کے لئے ہر حال میں ضروری ہے۔

یہاں تک کہ اگر اس کی وجہ سے مسلمانوں کے کچھ فائدے خطرہ میں پڑ جائیں یا انہیں نقصانات کا سامنا کرنا پڑے تب بھی اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

چنانچہ اس طرح کی بہت سی آیات ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ عقیدہ پر سختی سے گامزن رہا جائے، اور ذرہ مفاہمت گوارہ نہ کی جائے، چاہے اس کے نتیجے میں جانوں کا نذرانہ کیوں نہ پیش کرنا پڑے، یا پھر مسلمانوں کو برے انجام کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے؟ اسی لئے سورۃ الکافرون اپنی حقیقت میں اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ایک عمومی حکم دیا گیا ہے کہ وہ کلی طور پر ایسے دین سے براءت کا اظہار کریں جو دین اسلام کا مخالف ہو، نتائج

۳۹- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۸۔

اور برے انجام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے، اس سورہ کا نزول (جیسا کہ تفسیر کی کتابوں میں مذکور ہے) اس لئے ہوا ہے کہ لوگوں کو اس بات کی تاکید کردی جائے کہ عقیدہ توحید پر ثابت قدمی ہر حال میں ضروری ہے، اور ایک مسلمان کے لئے غیر اللہ کی عبادت بالکل محال ہے، کیونکہ ایسا کرنا عین شرک ہے، تو سورہ کا مفہوم اور مقصود یہ ہے کہ مسلمان بالعموم اس بات کے مکلّف ہیں کہ وہ غیر مسلموں کو راہ حق اور نجات کی دعوت دیتے رہیں، اور جب وہ اس دعوت کو قبول نہ کریں اور اسلام میں داخل نہ ہوں، تو اس سے کم کوئی چیز نہیں کہ مشرکین مسلمانوں کو اپنی حالت پر رہنے دیں، انہیں شرک کی دعوت نہ دیں (۴۰)، اسی طرح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ حضور ﷺ سے جب ان کے چچا ابوطالب نے پوچھا کہ آپ اپنی قوم سے کیا چاہتے ہیں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: میں ان سے اس کلمہ کا اقرار چاہتا ہوں جس کے سامنے عرب جھک جائیں اور عجم جس کے بدلے انہیں جزیہ دیں، ابوطالب نے کہا کہ وہ صرف ایک کلمہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں ایک ہی کلمہ ہے، تم لوگ "لا إله إلا الله" کہہ دو، ان لوگوں نے کہا کہ ایک ہی معبود، ہم نے ایسا دوسرے مذاہب میں نہیں سنا، یہ تو من گھڑت بات ہے (۴۱)، اسی طرح سے آپ ﷺ نے اپنے چچا ابوطالب سے فرمایا: اس وقت جب آپ ﷺ نے مشرکین مکہ کے ساتھ پر اس مفاہمت کو ٹھکرا دیا جس سے عقیدہ توحید کی مذمت یا اس کی اہمیت کم ہو رہی تھی، "اے چچا خدا کی قسم اگر وہ لوگ میرے داہنے ہاتھ میں سورج رکھ دیں اور بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیں اور یہ کہیں کہ میں عقیدہ توحید کی دعوت سے دستبردار ہو جاؤں تو میں کبھی ایسا نہیں کر سکتا یہاں تک کہ اللہ تعالی یا اس

۴۰- أب السعود، تفسیر أبو السعود، مرجع سابق، ج۹، ص۲۰۶-۲۰۷۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج۴، ص۵۶۰-۵۶۱۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، تفسیریں اس جانب اشارہ کرتی ہیں کہ یہ سورہ کفار قریش کے سلسلے میں نازل ہوئی جس کے پیش نظر روئے زمین کا ہر کافر بھی تھا، وجہ یہ تھی کہ کفار نے اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ دعوت دی کہ وہ ان کے معبود کی ایک سال عبادت کریں اور دوسرے سال وہ لوگ ان کے معبود کی عبادت کریں گے تو اللہ تعالی نے اس وقت یہ سورہ نازل فرمائی اور یہ حکم دیا کہ ان لوگوں سے کلی طور پر براءت اختیار کرلیں۔

۴۱- الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج۸، ص۱۶۔

عقیدہ توحید کو غالب کر دے گا یا پھر میں اس کے راستہ میں شہید ہو جاؤں گا (۴۲)۔

حدیث سے بھی ثابت ہے کہ قریش نے ابتداء میں یہ کوشش کی کہ آپ ﷺ کو مال، بادشاہت، قیادت وسیادت اور حکومت کا لالچ دے کر پھسلا لیا جائے، اور اس کے عوض وہ دعوتی کام سے دور ہو جائیں، اور حق کے ذریعہ ان کا مقابلہ کرنا بند کر دیں، لیکن آپ ﷺ اپنے موقف پر جمے رہے، اسلام کی دعوت میں سرگرم رہے، اور اپنے مدمقابل کفار ومشرکین کے لئے مذاکرات کے وہ حدود متعین کرتے رہے، جن کو نظر انداز کر کے مذاکرات پر آمادگی آپ ﷺ کے لئے ممکن نہ تھی چاہے معاملہ جیسا بھی ہو، وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے ان کی پیش کش کو ٹھکراتے ہوئے فرمایا: میں جو چیز تمہارے پاس لے کر آیا ہوں، اس سے نہ میں تم سے مال چاہتا ہوں اور نہ عزت اور نہ تم پر بادشاہت چاہتا ہوں، لیکن اللہ تعالی نے مجھے تمہارے لئے رسول بنا کر بھیجا ہے اور مجھ پر ایک کتاب اتاری ہے، اور مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں خوشخبری سناتا رہوں، اور انجام سے خبردار بھی کرتا رہوں، تو میں نے تم لوگوں تک اپنے رب کے پیغامات پہنچا دیئے، اور تمہارے حق میں بہتر کیا، اگر جو کچھ میں تمہارے پاس لے کر آیا ہوں، اسے مجھ سے قبول کر لو تو یہ تمہارے لئے دنیا اور آخرت کا بیش قیمت سرمایہ ہے، اور اگر تم نے قبول نہ کیا تو میں اللہ تعالی کے فیصلے کا انتظار کروں گا، یہاں تک کہ اللہ تعالی میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ کر دے گا (۴۳)۔

وہ آیتیں جو عقیدہ توحید پر ثابت قدمی کو اور اللہ تعالی کی شان میں ادنی کوتاہی کو گوارہ نہ کرنے کو واجب قرار دیتی ہیں چاہے اس کے لئے کتنی ہی قربانی دینی پڑے، ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''جو لوگ صبح وشام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں اور

۴۲- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۲۶۶۔

۴۳- دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۸۸-۹۰۔

صرف اسی کی خوشنودی چاہتے ہیں، ان کو دور مت کیجئے، نہ آپ پر ان کی جوابدہی کی کوئی ذمہ داری ہے اور نہ ان پر آپ کی جوابدہی کی ذمہ داری ہے کہ آپ انہیں دور کر دیں، ورنہ آپ کا شمار ناانصافی کرنے والوں میں ہوجائے گا'' (سورۂ انعام:۵۲)، ''(اے رسول!) ہم نے آپ پر جو وحی بھیجی ہے، یہ (کفر کرنے والے) لوگ آپ کو اس سے ہٹا دینا چاہتے تھے تاکہ آپ اس کے سوا ہم پر کچھ اور گڑھ لیں اور ایسی صورت میں وہ آپ کو مخلص دوست بنا لیتے'' (سورۂ اسراء:۷۳)، ''اور اگر ہم نے آپ کو ثابت قدم نہ رکھا ہوتا تو بعید نہ تھا کہ آپ ان کی طرف کسی قدر جھک جاتے (بالفرض) اگر ایسا ہوتا تو ہم آپ کو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی دوہرا عذاب چکھاتے اور آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مدد کرنے والا بھی نہیں پاتے) (۴۴) (سورۂ اسراء:۷۴، ۷۵)۔

جمہور مفسرین کا یہ ماننا ہے کہ مذکورہ آیات کے اسباب نزول میں وہ مذاکرات شامل ہیں جو قریش کے سربرآوردہ حضرات اور آپ ﷺ کے درمیان ہوئے، جن میں قریش کے لوگوں کا مقصد یہ تھا کہ آپ ﷺ کو ادنی درجہ کے لوگوں کی ہم نشینی سے روک دیا جائے، یا یہ مقصد تھا کہ وہ آپ ﷺ کو اس بات پر آمادہ کرلیں کہ وہ ان کے معبودوں سے صرف نظر کریں پھر وہ تمام لوگ آپ ﷺ کے ساتھ دین میں داخل ہوجائیں گے اور آپ ﷺ کو حجر اسود کا استلام کرنے دیں گے، معاملہ بالکل اس طرح کا ہو چکا تھا کہ قریب تھا کہ آپ ﷺ ان حضرات کی طرف مائل ہوجاتے، اور ان حضرات کے مطالبات کو تسلیم کر لیتے جبکہ آپ ﷺ کو اس کا یقین کامل تھا کہ اللہ تعالی آپ ﷺ کے متعلق واقف ہیں کہ آپ ﷺ ان کے مطالبے کے مخالف ہیں، مگر آپ ﷺ محض اس امید میں ان کے مطالبے کی طرف مائل تھے کہ وہ آئندہ اسلام میں داخل ہوجائیں گے، تو فورا یہ آیت نازل ہوئی جن میں پرزور انداز میں یہ واضح کیا گیا کہ عقیدہ توحید پر ثابت قدم رہنے میں ہی آپ ﷺ کی یقین مدد و نصرت

۴۴- سورۂ أنعام:۵۲، سورۂ إسراء:۷۳-۷۵۔

ہے(۴۵)۔

جب قریش آپ ﷺ کو ان کے موقف سے نرمی کے ذریعہ، بیجا وعدے کر کے اور بے بنیاد امید دلا کر بھی ہٹانے میں ناکام ہوگئے، اور انہیں اس سلسلے میں پوری مایوسی ہاتھ لگی تو انہوں نے اپنے لیڈران کے اتفاق سے یہ فیصلہ کیا کہ اب انہیں قتل کی دھمکی دی جائے، اور ان کی معاشی ناکہ بندی کی جائے، اور اتنا ہی نہیں ان کا اور ان کے ساتھ جو مسلمان ہیں اور بنو ہاشم اور بنو المطلب میں سے جو ان کی حمایت کر رہے ہیں ان سب کا سماجی بائیکاٹ کیا جائے، جب قریش ان تمام کاروائیوں کا سہارا لینے لگے، تب بھی آپ ﷺ اپنے موقف سے دستبردار نہیں ہوئے، بلکہ آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے رفقاء پوری مضبوطی سے دین اسلام پر عمل پیرا رہے اور جگہ جگہ اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے رہے، ساتھ ہی دعوت اسلامی کے کام میں سرگرم رہے(۴۶)، اسی طرح یہ واقعہ بھی ثابت ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مرتد لوگوں سے جنگ کی اور ان حضرات نے فریضہ زکاۃ ساقط کرنے کی شرط پر دوبارہ اسلام میں داخل ہونے کی پیشکش کی تھی، وہ اسے بھی ٹھکراتے ہوئے ان سے برسر پیکار رہے، چنانچہ اس سلسلے میں ان کا ایک مشہور قول ہے ''خدا کی قسم اگر لوگ اونٹ کی وہ رسی جسے وہ اللہ کے رسول ﷺ کے لئے نکالتے تھے مجھ سے روک لیں (زکاۃ میں دینا بند کردیں) تو میں اس بات کے لئے بھی ان سے جنگ کروں گا''(۴۷)۔

جہاں یہ حقیقت واضح رہنی چاہئے کہ مسلمان فریق کے مذاکرات کار کے لئے ضروری

۴۵- السیوطی، أسباب النزول لآیات من القرآن الکریم، القاہرۃ (کتاب الجمہوریۃ) د.ت. ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، (طبعۃ الشعب)، ج۱۵، ص ۲۵۴۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، (الطبعۃ الثانیۃ)، ج۶، ص ۴۳۱، ج۲۰، ص ۲۲۵۔ الشنقیطی، احتواء البیان، مرجع سابق، سید قطب، فی ظلال القرآن، القاہرۃ، بیروت، دار الشروق، الطبعۃ العاشرۃ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲م، ج۷ ص ۱۰۹۹-۱۱۰۰۔

۴۶- دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۹۳-۹۴۔

۴۷- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق۔

ہے کہ وہ مسلمانوں کے بلند و بالا مقاصد پر پورے شد و مد سے عمل پیرا رہے، اس میں ادنی درجے کا تنازل گوارہ نہ کرے، وہیں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ مذاکرات اسی وقت مفید و مؤثر ثابت ہوں گے، جب اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کیا جائے ،اور ان چیزوں کو نہ چھیڑا جائے جن سے دونوں مذاکرات کار کے درمیان ماحول پراگندہ ہو، اس لئے یہ ضروری ہے مذاکرات کے کچھ ایسے اصول وضابطے متعین کر دیئے جائیں جو مسلمانوں کے بنیادی اقدار یا بلند مقاصد پر آنچ نہ آنے دیں، اس کی وضاحت حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے دربار میں جانے والے اسلامی وفد سے ہوتی ہے، جس نے ابتداء میں ان امور پر گفتگو کی جو نجاشی اور مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ تھے یعنی وفد کی طرف سے تلاوت کی گئی ''سورہ مریم'' کی ابتدائی آیتیں جنہیں سن کر نجاشی حد درجہ متاثر ہوا، اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ'' یہ اور جو کچھ عیسی علیہ السلام اس دنیا میں لے کر آئے دونوں ایک ہی چراغ کی روشنی ہیں''(۴۸)، اور وفد نے اس حقیقت کے اظہار کو مؤخر کیا جو حضرت عیسی ابن مریم اور ان کی والدہ سے متعلق تھی، کیونکہ وہ حقیقت نجاشی سے نقطہ اختلاف کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن جب مذاکرات کا وفد مجبور ہوا کہ وہ اس مسئلہ میں حقیقت کا سامنا کرے تو اس نے نجاشی کے قبول اسلام، دعوتی کاموں کی آزادی، مسلمانوں کی مختلف طرح کے آزار اور پریشانی سے نجات کی امید، یا مسلمانوں کو دشمنوں کے حوالے کرنے کے سلسلے میں نجاشی کے رکاوٹ بن جانے کے پہلوؤں کی پراہ نہ کرتے ہوئے حقیقت کا برملا اظہار کیا(۴۹)۔

بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ مذاکرات کے ابتدائی دور میں اسلامی مذاکرات کار کے لئے سخت گیر موقف اختیار کرنا ضروری ہوتا ہے، یہاں تک کہ جب مد مقابل گروپ اسے تنازل پر مجبور کرے تو اسے اخیر میں اس مقصد تک رسائی کی کوشش کرنی چاہئے جو اسے مذاکرات سے

۴۸-،۴۹- منیر محمد الفیضان، المنہج الحرکی السیرۃ النبویۃ، عمان، مکتبۃ المنار، ط ۲، ۱۹۸۵م، ص ۹۶-۹۷۔ اسی طرح دیکھیں: ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۳۷-۳۳۸۔ دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص ۹۹-۱۰۰۔

مطلوب ہے، اس سلسلے میں سب سے اہم بات امام شیبانیؒ نے لکھی ہے کہ مذاکرات کار کاتب کو چاہئے کہ ابتداء میں احتیاط کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے سخت سے سخت موقف درج کرے، اگر ان میں سے کسی پہلو کو مسلمان ناپسند کریں گے تو اسے تحریر سے خارج کر دیں گے، اس لئے کہ وہ جس شق کو ناپسند کرتے ہیں اسے تحریر سے خارج کرنا ان کے لئے زیادہ آسان ہے اس اضافی شق کے مقابلے میں جس کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں، ایسا اس لئے ہے کیونکہ جنگجو قوم سخت موقف ہی کو قبول کرتی ہے، اس لئے ابتداء میں سخت موقف تحریر کیا جائے گا، اگر اختیار کردہ موقف کی آسان شق کو قبول کر لیا جائے تو مسلمان اس بات کے مجاز ہوں گے کہ اپنی پسند کے مطابق جس شق کو چاہیں تحریر سے خارج کر دیں (۵۰)۔

نیز اسلامی مذاکرات کار کے لئے حق پر ثابت قدمی اور کسی ایسی شئ سے دوری اختیار کرنے میں عدم کوتاہی پر سختی سے کاربند رہنا جس سے عقیدہ پر ضرب پڑتی ہو، اس بات سے مانع نہیں ہے کہ مذاکرات میں مختلف نقطہائے نظر میں ایک طرح سے قربت پیدا کرنے کی غرض سے نیز مذاکرات سے مطلوبہ مقاصد کی تکمیل کی خاطر دوسرے فریق کو اپنے موقف میں نرمی اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے ارادہ سے مذاکرات میں نرمی، آسانی اور لچک کا اظہار کیا جائے، جو کچھ صلح حدیبیہ میں مشرکین مکہ اور آپ ﷺ کے درمیان طے ہونے والے معاہدہ سے متعلق مذاکرات میں ہوا وہ اس بات کی سب سے بہتر دلیل ہے کہ اسلامی مذاکرات کار کی جانب سے مذاکرات میں نرمی اور لچک کے اظہار کی پوری گنجائش ہے۔

چنانچہ آپ ﷺ سہیل بن عمرو کی خواہش پر جو مشرکین مکہ کی طرف سے مذاکرات کار تھا ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے بجائے ''باسمک اللھم'' لکھنے پر آمادہ ہو گئے اور ''محمد رسول اللہ'' کے بجائے ''محمد بن عبداللہ'' لکھنے، نیز حج بیت اللہ کے ارادہ کو آئندہ سال تک مؤخر کر دینے

۵۰- السرخسی، شرح السیر الکبیر الشیبانی، (تحقیق) صلاح الدین المنجد، معہد المخطوطات بجامعۃ الدول العربیۃ، ۱۹۸۲ء۔

پر راضی ہو گئے، علاوہ ان شرائط کے جو سہیل نے رکھی اور آپ ﷺ نے انہیں منظوری دے دی، مثال کے طور پر یہ کہ اگر مشرکین میں سے کوئی مسلمان ہو کر مسلمانوں کے پاس جائے تو انہیں اس کو لوٹانا ہوگا، آپ ﷺ نے مذکورہ معاہدہ میں اس قدر تنازلات اختیار کئے کہ مسلمان دہشت زدہ رہ گئے، اور حضرت عمرؓ کے قول کے مطابق دین کے معاملہ میں گویا ذلت گوارا کرنے پر مجبور ہو گئے (۵۱)، جبکہ بعض مفسرین اور فقہاء نے ان تنازلات سے یہ استدلال کیا ہے کہ دشمنوں سے اس حد تک مصالحت کر سکتے ہیں جس سے بظاہر مسلمانوں پر زیادتی ہو رہی ہو اگر ضرورت کا تقاضا ہو (۵۲)۔

واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے معاہدہ سے متعلق مذاکرات میں جن ''تنازلات'' کو قبول فرمایا اگر ان کا باریکی سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تنازلات دراصل مذاکرات کار کی سمجھداری اور اپنی مضبوطی کے سرچشمہ پر غایت درجہ اعتماد اور مذاکراتی مزاج سے ہم آہنگی پر مبنی ہیں، جن سے نہ اسلامی عقیدہ متاثر ہوتا ہے اور نہ عقیدہ توحید پر کسی دوسرے عقیدہ کو فوقیت دینا لازم آتا ہے، اور نہ ان سے وہ زیادتی ہوتی ہے جسے مسلمان مجبور ہو کر قبول کر لیں۔

۵۱-۵۲- اس میں دیکھیں: ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۳، ص ۳۲۰ اور اس کے بعد کے صفحات، الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۳۹، دکتور محمد الصادق عفیفی، الإسلام والمعاہدات الدولیۃ، القاہرۃ، الأنجلو المصریۃ، ۱۹۸۵، ص ۱۰۰ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۶، نیز دیکھئے: ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۳، ص ۱۴۴۷-۱۴۴۸۔ ابن کثیر، مرجع سابق، ص ۱۹۴-۱۹۸۔ البرہان نوری، کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال، (تحقیق) بکر حیاتی، بیروت، مؤسسۃ الرسالۃ ۱۹۷۹م، ج ۱۰، ص ۴۷۳، یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے جو ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے فرمایا: "بیشک رسول اللہ ﷺ نے اہلِ مکہ کے ساتھ صلح کی اور انہیں کچھ چیزیں دیں۔ اگر نبی اللہ (ﷺ) کے بعد کوئی امیر (حاکم) ہوتا اور وہ وہی کچھ کرتا جو نبی اللہ نے کیا، تو میں نہ اسے سنتا اور نہ اس کی اطاعت کرتا۔" اور وہ چیز جو رسول اللہ ﷺ نے کفار کے لیے مقرر کی تھی وہ یہ تھی کہ: اگر کوئی کافر مسلمانوں کے پاس آ جائے تو مسلمان اسے واپس کر دیں گے، اور اگر کوئی مسلمان کفار کے پاس چلا جائے تو کفار اُسے واپس نہیں کریں گے۔

اس صورت حال کی مزید وضاحت اس طرح ہوتی ہے کہ مشرکین مکہ شرک وکفر پر قائم رہتے ہوئے آپ ﷺ کے ساتھ مذاکرات میں شریک ہوئے، جبکہ اس طرح کے حالات میں ان سے اس بات کی توقع تھی کہ وہ ان تمام شرائط کو ماننے سے انکار کردیں گے جن سے آپ ﷺ کو نبی اور رسول تسلیم کرنا لازم آتا تھا، کیونکہ اس سے ان کی بنیادی اقدار یا ان کے بنیادی مصالح جن میں وہ کسی سمجھوتے یا کوتاہی کے روادار نہیں متاثر ہوتے، ایسے وقت میں آپ ﷺ کے اس طرح کے شرائط سے تنازل اختیار کرنے سے آپ ﷺ کی نبی اور رسول کی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑا، مطلب یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ ان شرائط کو اسی شکل میں لکھنے پر اصرار کرتے جو شکل ابتداء میں آپ ﷺ کو پسندیدہ تھی، تو آپ ﷺ کی نبی اور رسول کی حیثیت میں کوئی نیا اضافہ نہ ہوتا، مگر اتنا ضرور ہوتا کہ اس طرح کا اصرار مذاکرات کے عمل کے تسلسل میں رکاوٹ بن جاتا اور مذاکرات میں شامل ہونے کا جو اصل مقصد تھا وہ بھی خطرہ میں پڑ جاتا، جبکہ مشرکین نے مذاکرات میں شمولیت کی منظوری دی، اس طرح کہ وہ اسلام میں داخل نہ ہونے کے موقف پر اڑے رہے، اس طرح کی صورت حال میں جو تنازلات اختیار کئے گئے کہ اس سال بیت اللہ کے طواف کو آئندہ سال کے لئے مؤخر کردیا جائے، اور مسلمان اس پر مضبوطی سے کاربند رہیں کہ قبیلہ قریش میں سے جو مسلمان ہو کر ان کے پاس جائے اسے ہر حال میں لوٹا دیا جائے، یہ تنازلات اپنی حقیقت کے اعتبار سے عقیدہ کی اصل روح کو متاثر نہیں کرتے، اس لئے کہ آپ ﷺ خلاف عقیدہ تمام چیزوں کا انکار کر چکے تھے، آپ ﷺ کے ذہن مبارک میں صرف اتنی بات تھی کہ اس سے مسلمانوں کو بڑا فائدہ حاصل ہونے والا ہے کہ ایک معقول مدت کے لئے معاہدہ ہوجائے گا، جس میں مسلمانوں کے لئے اپنی طاقت وقوت کو مضبوط کرنا ممکن ہوجائے گا، اور مشرکین کے سامنے اپنے اوپر غور وفکر کا دروازہ کھل جائے گا، نیز اللہ کے رسول ﷺ کا حضرت عمرؓ کو خاص انداز سے جواب دینا، اس بات کو واضح کرتا ہے کہ آپ ﷺ کا عمل اللہ تعالی کی نصرت پر مکمل یقین اور وحی کے دائرہ میں تھا، دوسری طرف آپ ﷺ کی یہ خواہش تھی کہ ان مسلمانوں

کی جانچ پڑتال کی جائے جو مکہ میں اپنے اسلام کا اظہار کر رہے تھے، اور انہیں تکلیف دہ چیزوں پر صبر و تحمل سے کام لینے کی ٹریننگ دی جائے، یہاں تک کہ اللہ تعالی فتح عطا فرمادے یا اپنا کوئی فیصلہ سنادے، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ حج کو اور طواف بیت اللہ کو دوسرے سال تک مؤخر کرنا عقیدہ کو زک نہیں پہنچاتا تھا، بالخصوص جب اس معاہدہ سے دس سالوں تک دونوں فریق کے درمیان جنگ بندی ہوگئی، اسی طرح اہل ایمان کی حمایت کے متقاضی کاموں سے ظاہری دستبرداری، اور وہ لوگ مشرکین کے ہاتھوں جس طرح ستائے جارہے تھے اور مظلومیت کے شکار تھے، اس سے نجات دلانے کی کوشش سے دوری، اور اسی کے ساتھ مسلمانوں کے لئے یہ بھی ضروری ٹھہرایا گیا کہ جو مکہ سے مسلمان ہوکر آئے گا اسے لوٹانا ہوگا، اس طرح کی ظاہری دستبرداری یعنی ظاہری طور پر اپنے موقف سے تنازل چہ جائیکہ یہ ایک عارضی اور وقتی موقف تھا مگر یہ سب کچھ اس موقف کے جو فوائد تھے ان کے بالمقابل ہیچ تھے، وہ اس طرح کہ آپ ﷺ کی شدید خواہش تھی کہ اہل ایمان کے دلوں کی جانچ پڑتال ہوجائے اور ان کے ایمان کو آزمالیا جائے تاکہ وہ لوگ حقیقت میں دین کے حامی قرار پائیں، اس موقف کی تائید اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے حضرت ابوجندلؓ سے فرمایا تھا جسے آپ ﷺ اور جو ان کے ساتھ مکہ سے مسلمان ہوکر آئے تھے لوٹادیا تھا"**إصبر و احتسب، فإن الله جاعل لک ولمن معک مخرجاوفرجا**"(۵۳، ۵۴)(صبر کرو ثواب کی امید

۵۳-۵۴-اس سلسلے میں ان مباحث کا مطالعہ کیا جائے جو اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کے شرعی بنیادوں اور اصولوں سے متعلق ہے، خاص طور پر "عہد کی وفاداری اور عہد میں خیانت کی حرمت" کے اصول پر۔ علما کا کہنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کفارِ قریش کے ساتھ بعض امور میں موافقت اختیار کرنا ایک اہم دینی مصلحت کے تحت تھا جو صلح کے ذریعے حاصل ہورہی تھی، کیونکہ ان باتوں میں کوئی شرعی خرابی یا فساد نہ تھا۔

جہاں تک "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کے بجائے "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ" لکھنے کی بات ہے، تو دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ اسی طرح "محمد بن عبداللہ" لکھنے میں بھی کوئی قباحت نہیں، حالانکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو اس موقع پر "الرحمٰن الرحیم" جیسے صفاتی ناموں سے یاد نہ کرنا، ان صفات کے انکار کو ظاہر نہیں کرتا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو "رسول اللہ" نہ لکھنے میں بھی آپ کی رسالت کے انکار کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ اس لیے کفار کے ان مطالبات میں

رکھو، اس لئے کہ اللہ تعالی آئندہ تمہیں اور جو تمہارے ساتھ ہیں دونوں کو وسعت اور خلاصی عطا فرمائے گا)، اور اس سے بڑھ کر اس معاہدہ میں ایک شق ایسی بھی شامل تھی کہ اہل عرب میں سے جو محمد ﷺ کے معاہدہ میں داخل ہونے کی چاہت رکھتا ہو کے لئے دروازہ کھلا تھا، ساتھ ہی جنہیں قریش کے معاہدہ میں داخل ہونے کی چاہت تھی ان کے لئے بھی دروازہ کھلا تھا، اس سے حضور ﷺ کے لئے یہ گنجائش پیدا ہوئی کہ وہ جزیرۃ العرب کو اپنی طرف راغب کریں، اور انہیں اسلام کی طرف مائل کریں، اور اس سے بڑھکر کوئی اور دلیل نہیں ہوسکتی کہ قبیلہ خزاعہ نے جلد محمد ﷺ کی طرف سے معاہدہ میں داخل ہونے کا اعلان کر دیا، جبکہ بنوبکر نے قریش کی طرف سے معاہدہ میں داخل ہونے میں دلچسپی لی۔

گذشتہ تفصیلات کا مدعا یہ ہے کہ حدیبیہ کے مذاکرات میں جو تنازل اختیار کیا گیا، اس

کوئی دینی مفسدہ نہ تھا۔ مفسدہ اس وقت پیدا ہوتا اگر وہ اس بات کا مطالبہ کرتے کہ ان کے معبودوں کی تعظیم یا شرک پر مبنی کوئی بات لکھی جائے، یا ایسی کوئی بات کہی جائے جو شریعت کے خلاف ہو۔

اور جہاں تک اس شرط کا تعلق ہے کہ جو شخص (کافر) مسلمانوں کے پاس آجائے، اسے واپس کر دیا جائے، اور جو مسلمان ان کے پاس چلا جائے، اسے واپس نہ کیا جائے— تو رسول اللہ ﷺ نے اس کی حکمت خود بیان فرمائی: "جو ہم میں سے ان کے پاس چلا جائے، اللہ اسے دُور کر دے، اور جو ان میں سے ہمارے پاس آجائے، اللہ اس کے لیے کشادگی اور نجات پیدا فرمادے گا۔"

اس صلح کو مکمل کرنے سے جو دینی مصلحت حاصل ہوئی، وہ بعد میں اپنی شاندار اور واضح شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس کے نمایاں نتائج میں فتح مکہ شامل ہے، اور مکہ کے تمام باشندوں کا اسلام قبول کرنا، اور پھر لوگوں کا فوج در فوج دینِ اسلام میں داخل ہونا بھی اسی کا نتیجہ تھا۔ اس صلح کی بدولت اہلِ مکہ کو مسلمانوں کے ساتھ میل جول اور براہ راست تعلق کا موقع ملا، جس سے انہوں نے اسلام کی حقیقت کو جانا، اور یہی چیز ان کے دلوں کے اسلام کی طرف مائل ہونے کا سبب بنی۔

صحیح مسلم بشرح النووی، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۱۳۸-۱۴۱۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۰۴ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور عون الشریف قاسم، مرجع سابق، ص ۶۵ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، ص ۲۵۵۔

سے حقیقت کے اعتبار سے ان عمومی اصولوں کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، جنہیں اسلامی مذاکرات کے لئے غیر سے مذاکرات کرتے وقت نصب العین بنانا ضروری سمجھا گیا ہے، یہ تنازلات اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ یہ طبعی وفطری صورت حال ہے جو مذاکرات کے قابل عمل مزاج سے ہم آہنگ ہے، وہ اس طرح کہ مذاکرات کے اصل مقصود تک پہنچنے کی خاطر ضروری مروت، نرمی اور لچک کا اظہار کیا جائے، اس کے باوجود یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ صلح حدیبیہ کے موقع سے جو مذاکرات ہوئے اور اس میں جو تنازل اختیار کیا گیا وہ بنیادی طور پر بعض فقہاء اور مفسرین کی اس رائے کے لئے جواز نہیں بن سکتا کہ ضرورت کے وقت دشمن سے مفاہمت کے لئے مسلمانوں پر ہورہے مظالم کو بھی گوارا کیا جاسکتا ہے، صلح حدیبیہ کے تنازلات تو مسلمان مذاکرات کار کی منفرد صفات اور صلاحیتوں کے آئینہ دار ہیں۔

تفسیر اور تاریخ کی کتابوں (۵۵) کے مطابق اس وقت کے مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان طاقت وقوت کے توازن کے حوالے سے ''ضرورت وحاجت'' کی شرط مسلمانوں کی طرف سے ثابت نہیں تھی، اسی طرح بعض کا یہ دعوی کہ آپ ﷺ کا عمل تنازل وحی کے دائرہ میں تھا، یہ بھی اسلامی مملکت کے اصحاب اقتدار کی صلاحیتوں سے باہر کی چیز ہے، اس سے صرف اس قدر استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ہر حال میں اسلامی مذاکرات کار کے لئے اس پر سختی سے کاربند ہونا ضروری ہے کہ وہ اپنے مدمقابل سے مذاکرات کرتے وقت دوراندیشی سے کام لے، ہر پہلو سے مصلحت ومنفعت کا اندازہ لگائے، مسلم فریق کے پاس طاقت وقوت کا جو مجتمع سرچشمہ ہے اس کا استحضار رہے اور اس پر کامل یقین رکھے، نیز مدمقابل کی طاقت وقوت کے سرچشمہ کا صحیح اور بامقصد اندازہ لگانے سے غافل نہ رہے، اس سلسلے میں اگر وہ بلند وبالا مقاصد جن پر ذرہ مفاہمت

۵۵- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج۲، ص۳۳۳-۳۳۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، (طبعۃ الشعب) ج۷ ص۳۰۷ ومابعدہا، القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، (الطبعۃ الثانیۃ) ج۱۶، ص۲۵۹ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور عون الشریف قاسم، مرجع سابق، ص۶۷-۶۸۔

نہیں کی جاسکتی، کی بڑی باریکی سے تعیین کردی جائے اوران کے علاوہ ان حدود کی بھی نشاندہی کردی جائے جوان سے کمتر ہیں اورجن پر مفاہمت ممکن ہےتو پھراتنی ہی کوشش راہ اعتدال سے تجاوز کرنے سے روکنے میں مدد ومعاون ثابت ہوگی۔

پانچواں مطلب

مذاکرات میں وسائل کا مقاصد سے ربط

ایک اہم بنیادی حقیقت جومذاکرات کے دونوں فریق کے درمیان ربط وتعلق سے جڑی ہوئی ہے،جس کا ماحصل یہ ہے کہ وہ ذرائع جنہیں مسلمان مذاکرات کار غیر مسلموں سے مذاکرات کے وقت استعمال کرتا ہے آیا وہ مذاکرات کے مقصد سے ہم آہنگ ہیں یانہیں؟اللہ کے رسول ﷺ اورقریش کے درمیان دعوتی مواقع پر جومذاکرات ہوئے ان سے واضح ہے کہ جن وسائل وذرائع کے واسطے سے مسلمان مذاکرات کاراپنی کاروائی کا آغاز کرتا ہے، وہ ان مقاصد کادرجہ رکھتے ہیں جن کی تکمیل مذاکرات سے مقصود ہوتی ہے،توجس طرح یہ ضروری ہے کہ مقاصد شرعی احکام سے ہم آہنگ ہوں اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ متبادل اور دستیاب اختیارات اور استعمال میں لائے جانے والے ذرائع ووسائل بھی شرعی نقطہ نظر سے جائز اور عملاً قابل تصور ہوں، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اگرایک طرف مصلحت اورشرعی پالیسی کا تقاضا یہ ہے کہ مسلم مذاکرات کار ان ذرائع وسائل کے استعمال کے لئے آزاد ہے،جنہیں وہ مذاکراتی عمل کے زیرعمل لاسکتا ہےتو دوسری طرف آزادی مشروط ہے اس شرط سے کہ وہ ذرائع ووسائل شریعت کی طرف سے جائز کردہ دائرہ میں ہوں، اس کی تاکیداس واقعہ

سے بھی ہوتی ہے کہ وہ پرکشش پیش کش جو قریش نے آپ ﷺ سے کی، آپ ﷺ کے دعوتی کاموں سے دستبرداری کے عوض جو شرعی پالیسی اور حکومتی تقاضوں سے میل کھاتی تھی اور معاملات کے مزاج سے پوری طرح موافق تھی- وہ اس لائق تھی کہ انہیں قبول کرلیا جاتا، یہاں تک کہ جب حکمرانی مل جاتی اور جاہ ومنصب قدم بوسی کرنے لگتے تو اسے دعوت کی اشاعت کا ذریعہ اور اسے عوام پر تنفیذ کا وسیلہ بنالیتے، مگر آپ ﷺ نے پیش کش کو اس لئے قبول نہیں فرمایا کہ وہ دین کی بنیاد اور تاسیسی اصول وضابطہ کے خلاف تھی۔

اسی طرح جب اللہ کے رسول ﷺ نے ایک معذور صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ سے قریش کے صف اول کے قائدین سے گفتگو کررہے تھے اور انہیں اسلام کے حقائق سے باخبر کرتے وقت اعراض فرمایا تو اس کی وجہ یہی تھی کہ آپ ﷺ نے ان حضرات کی جانب توجہ دینے کے موقع کو غنیمت جانا اور ہاتھ سے جانے دینا مناسب نہیں سمجھا، جیسے ہی آپ ﷺ کی طرف سے یہ اقدام کیا گیا، قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی "عبس وتولی أن جاء ہ الاعمی" اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد اگرچہ جائز اور نیک ہو مگر ذریعہ ووسیلہ ایک بندہ مسلم سے اعراض اور ان سے بے توجہی پر منتج ہورہا ہو، ایسا ذریعہ غیر مشروع اور غیر مقبول ہے، ان تمام تفصیلات کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ جواز اور مشروعیت کے نقطہ نظر سے وسائل کا مقاصد کے مطابق ہونا ضروری ہے(۵۶)۔

۵۶- دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ، مرجع سابق، ص۹۱-۹۲۔

چھٹا مطلب
مذاکرات کار کے لئے حفاظتی تدابیر

مذاکرات کار فریقین کے باہمی تعلقات کی تعیین کے سلسلے میں یہ اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے تعلقات کے کچھ ایسے بنیادی محرکات اور عوامل ہیں جن کی وجہ سے مذاکرات کار حضرات کو سیکورٹی اور تحفظ فراہم ہوتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مذاکرات کار حضرات اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو احسن طریقہ پر ادا کرنے کی پوزیشن حاصل کر لیتے ہیں، بالفاظ دیگر مذاکرات کار افراد کا یہ حق ہے کہ انہیں اس حد تک تحفظ حاصل ہو کہ وہ مطمئن ہوں کہ انہیں مذاکرہ سے مطلوب مقاصد کی راہ میں کوئی ضرر لاحق نہ ہوگا، احادیث کے ذخیرہ میں بہت سے ایسے دلائل موجود ہیں جو مذاکرات کار کی جان، مال اور قابل تحفظ امور کے حوالے سے حفاظتی اقدامات کے وجوب پر زور دیتے ہیں، جیسے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں عہد و پیمان کو نہیں توڑوں گا''، یعنی میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس کی خلاف ورزی نہیں کروں گا،'' اور نہ قاصد کو اس کے اپنے ملک واپس جانے سے روکوں گا'' (۵۷)، اسی طرح آپ ﷺ کا مسیلمہ کذاب کے نمائندوں سے (جو کہ اس کا خط لے کر اس غرض سے آئے تھے کہ اسے نبوت میں شریک کیا جائے اور باوجودیکہ ان دونوں نے مسیلمہ کذاب کے موقف کا اظہار بھی کر دیا تھا)، یہ کہنا کہ ''اگر سفارت کاروں کا قتل ناجائز نہ ہوتا تو میں ضرور تم دونوں کی گردنیں مار دیتا'' (۵۸)، اسی طرح بہت سے فقہاء نے اور علماء نے اللہ تعالی کے قول "**وإن أحد المشركين استجارك،**

۵۷، ۵۸- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق۔ دکتور صبحی محمصانی، القانون والعلاقات الدولیۃ فی الاسلام، بیروت، دار العلم للعلابین، ۱۳۹۲ھ/ ۱۹۷۲ء، ص ۱۲۹۔ ۱۳۰۔

فأجره حتى يسمع كلام الله" (اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے (تاکہ اللہ کا کلام سنے) تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے) کو سفیر، نمائندہ اور مذاکرات کار کو دیئے گئے تحفظ کی دلیل قرار دیا ہے (۵۹)۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کریمہ کا ظاہر واضح کر رہا ہے کہ یہ آیت اس شخص کے لئے خاص ہے جو دین کے حوالے سے پناہ چاہتا ہو، مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی عدم واقفیت کی وجہ سے اسلامی مملکت میں امن و امان کا خواہاں ہو تو اسے امن و امان دیا جائے، تاکہ اس کے سامنے دین کی تعلیمات پیش کی جاسکیں اور اس کے لئے اللہ تعالی کا کلام سننا ممکن ہو، اگر مذکورہ آیت کسی عارضی اور وقتی معاملہ میں جیسے تجارت یا دیگر امور جن میں مسلمانوں کا مفاد وابستہ ہو کی خاطر کسی غیر مسلم کو دارالاسلام میں امن و امان دیئے جانے کی مشروعیت پر دلالت کر رہی ہے، تو پھر یہ فقہ اسلامی کے راجح نقطہ نظر کے برعکس کسی مذاکرات کار، سفیر یا نمائندہ کو تحفظ دینے کی مشروعیت کی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس طرح کے گروہ کو جو سہولیات اور تحفظ دیا جاتا ہے اس کے نظام میں اور نظام امن و امان میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے، اصل میں سہولیات اور تحفظ دیئے جانے کا معاملہ جیسا کہ مؤخر الذکر دونوں صحیح روایتوں میں ذکر ہوا، نمائندہ طبقہ کے ساتھ خاص ہوتا ہے، یعنی جب مذاکرات کار کسی ملک یا کسی خود مختار ریاست کا نمائندہ ہو، اسی طرح وہ مذاکرات کار کے فرض منصبی کا تقاضا ہیں تاکہ وہ امن و سلامتی اور اطمینان کی فضا بہ طریق احسن اپنی ذمہ داریاں انجام دے سکے (۶۰)۔

۵۹- دراسۃ کے صفحہ نمبر ۱۰۹-۱۴۵ دیکھیں۔

۶۰- دراسۃ کے صفحہ نمبر ۱۰۹-۱۴۵ دیکھیں۔

ساتواں مطلب

مذاکرات کے نتائج کی پابندی کا دائرہ

چونکہ مذاکرات پر امن گفتگو اور اختلافات کے خاتمہ کا ذریعہ ہیں اس لئے اسلامی اصول وضوابط میں ان کی ایک شرعی بنیاد ہے، مذاکرات میں فریقین کا مزاج اتفاق کا ہو، مطلب یہ ہے کہ جب اسلامی مملکت دوسرے ممالک کے ساتھ دوطرفہ مذاکرات یا پھر اجتماعی مذاکرات میں شریک ہوتو اس شرکت پر تمام متعلقہ فریق رضامند ہوں، اوران تمام حضرات کا ارادہ بھی اس پر مرکوز ہے، اس رضامندی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسلامی مملکت اس مسئلہ میں دوسرے فریقوں کی طرح اپنے مذاکرات کار کے ان اقوال و افعال کی جو مذاکراتی عمل کے دوران اسلامی مملکت کے مذاکراتی موقف کی تعیین کرتے ہوں پابند نہیں ہوگی، جب تک کہ مذاکرات پر مامور تمام فریق کسی متفقہ فیصلے تک نہ پہنچ جائیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ چند ایسے طریقے ہیں جن سے مذاکرات اختتام پذیر ہوتے ہیں اور یہ بھی طے پاتا ہے کہ مذاکرات جن مراحل کو طے کرتے ہیں، اوران سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں(٦١)ان سے وابستگی کس حد تک رکھی جائے؟ کیونکہ کبھی کبھی مذاکرات اختتام پذیر ہوتے ہیں اور ساتھ ہی مقاصد بھی حاصل ہوجاتے ہیں، اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب اسلامی مملکت اپنے مذاکرات کار فریق کے ساتھ مذاکرات میں زیر غور آنے والے موضوع سے متعلق کسی اتفاقی پہلو تک پہنچ جائے، اور ایک بین الاقوامی معاہدہ میں طے شدہ ان امور کو تحریری شکل میں مرتب بھی کرلیا جائے جن سے حقوق کی تعیین ہوتی ہو اور فریقین کی باہمی ذمہ داریوں پر روشنی پڑتی ہو۔

کبھی غیر معمولی قسم کے حالات پیش آتے ہیں جو مذاکراتی فریق کے ساتھ اسلامی

٦١- أنظر بصفة أساسية: دکتور وہبۃ الزحیلی، الفاوضات فی الاسلام، مرجع سابق، ص ٢٧-٢٨۔

ریاست کے تعلقات کو متاثر کر دیتے ہیں، یہ صورت حال جنگ چھڑ جانے یا فریقین کے درمیان تعلقات کشیدہ ہوجانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے، ایسے حالات میں مذاکراتی عمل کو جاری رکھنا بڑا دشوار ہوجاتا ہے، چنانچہ مذاکرات کا عمل موقوف کر دیا جاتا ہے، اور مذاکرات میں شامل فریقین کے حق میں کسی طرح کے نتائج کی پابندی لازم نہیں ہوتی، کیونکہ حقیقت میں مذاکرات پر جنگ کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ بالعموم باہم دست وگریباں دو مملکتوں کے درمیان قائم امن کی فضا کو غارت کر دیتی ہے، اس صورت میں ان تعلقات کے ضروری حصوں پر عمل کرتے ہوئے جنگ کی کاروائی کو منظّم کرنے پر معاہدہ کرلیا جاتا ہے اور فریقین صلح نیز زخمیوں اور قیدیوں کے باہمی تبادلہ سے متعلق کوئی سمجھوتہ کر لیتے ہیں، بالفاظ دیگر اسلامی اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان جنگ برپا ہونے کی صورت میں دونوں فریق کے قیدیوں اور زخمیوں کے تبادلے کے طریقہ کار یا جنگ بندی کی خاطر ایک عارضی صلح کے لئے مذاکرات شروع کر دیتے ہیں، یہ منطقی اور فطری بات ہے کہ اسلامی مملکت اور دوسرے مذاکرات کار فریق کے درمیان مذاکرات ختم ہوجائیں، جب فریقین کے لئے اس مسئلہ میں کسی متفق علیہ نکتہ تک پہنچنا دشوار ہوجائے جس کے لئے مذاکرات کا عمل شروع کیا گیا ہو، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اس طرح ختم ہونے والے مذاکرات اس امر کے لئے محرک ثابت ہوتے ہیں کہ دونوں ممالک اس بات پر اتفاق کرلیں کہ مذاکرات کو ایک متعین یا غیر متعین مدت کے لئے مؤخر کر دیا جائے، یا دونوں اس بات پر آمادہ ہوجائیں کہ کسی دوسرے پرامن سنجیدہ ذریعہ کو اختیار کیا جائے جیسے کہ باہمی تنازعہ کے حل کی غرض سے کسی کو حکم بنالیا جائے کبھی مذاکرات اس طرح ختم ہوتے ہیں کہ اسلامی مملکت مذاکرات سے ہٹنے کا قطعی فیصلہ کر لیتی ہے، جب اسے اس بات پر اطمینان ہوجاتا ہے کہ مذاکرات کو جاری رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں، یا اسلامی فریق کی طرف سے کی جانے والی باہمی مشاورت کا یہ نتیجہ ظاہر ہو کہ اسلامی مملکت کی طرف سے جو تنازل اختیار کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کو حاصل طاقت وشوکت، اور اسلام کی طرف سے دیئے گئے اعزاز واکرام سے مطابقت نہیں رکھتا، ان تمام حالتوں میں مذاکرات فریقین کی طرف

سے کسی متفق علیہ صورت حال تک پہنچے بغیر ختم ہوجاتے ہیں، اور فریقین مذاکراتی عمل شروع ہونے سے پہلے کی حالت پر واپس آ جاتے ہیں اور وہ اس طرح کہ فریقین مذاکرات میں زیر غور مسئلہ سے متعلق کسی بھی طرح کی ذمہ داری اور حقوق سے بری سمجھے جائیں گے۔

دلیل کے طور پر یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ جب قریش، بنوقریظہ کے یہود اور دیگر گروہ غزوہ احزاب میں مسلمانوں سے جنگ لڑنے کی خاطر اکٹھا ہوئے تو آپ ﷺ کی یہ رائے ہوئی کہ ''قبیلہ غطفان'' کو مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ شریک جنگ ہوکر مسلمانوں سے لڑنے سے روکا جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے قبیلہ غطفان سے انہیں مدینہ کے پھلوں کا ایک تہائی حصہ دینے کے عوض جنگ سے دور رکھنے کی غرض سے گفتگو فرمائی، قریب تھا کہ اس بنیاد پر فریقین کے درمیان اتفاق ہوجائے، یہاں تک کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحابؓ کو طلب فرما کر انہیں قبیلہ غطفان کے ساتھ ہوئے مذاکرات سے اور فریقین کے درمیان متفقہ تنازلات سے باخبر کیا، جب صحابہ کرامؓ کو یہ علم ہوا کہ یہ حکم اللہ تعالی کی وحی سے مستفاد نہیں ہے، بلکہ یہ آپ ﷺ کی اپنی اختیار کردہ رائے ہے، کیونکہ آپ ﷺ کا خیال تھا کہ ''عرب نے مسلمانوں کو ایک ہی کمان سے نشانہ بنایا ہے، اور ہر طرف سے ان پر ٹوٹ پڑے ہیں، تو آپ ﷺ کی یہ منشا ہوئی کہ ان کی طاقت توڑ دی جائے (۶۲)، جب صحابہ کرامؓ کو اس کا ادراک ہوا تو ان کی رائے یہ ہوئی کہ قبیلہ غطفان کو اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعہ ان کے ساتھ کئے گئے مذاکرات کے مطابق کچھ نہ دیا جائے اور یہ اس وجہ سے کہ قبیلہ غطفان اور انصار جب شرک میں مبتلا تھے اور بتوں کی پوجا کرتے تھے تو اس وقت قبیلہ غطفان کو کچھ بھی نہیں ملتا تھا تو اب مدینہ کے پھلوں میں سے جبکہ اللہ تعالی نے انصار کو اسلام کے ذریعہ اور رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ اعزاز و تمکنت عطا فرمائی ہے، کچھ بھی دینا درست معلوم نہیں ہوتا، آپ ﷺ نے انصار کی رائے پر اطمینان کا اظہار فرمایا، اور قبیلہ غطفان کے

۶۲- ابن ہشام، السیرۃ، مرجع سابق، ج۳، ص ۲۳۳۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۲۸۷۔

ذمہ داروں کو اطلاع دے دی کہ ہم مذاکرات سے دستبردار ہوتے ہیں، اور مذاکرات کے متعلق یہ سمجھا جائے کہ گویا وہ ہوئے ہی نہیں (۶۳)۔

مذاکرات میں حسن نیت کی رعایت:

مذاکرات سے متعلق گفتگو کا اختتام یوں کیا جاسکتا ہے کہ مذاکرات اسلامی مملکت کی طرف سے خارجہ تعلقات استوار کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مذاکرات ایک اہم اور بنیادی حقیقت ہیں، اس کی اہمیت کے پیش نظر اسلامی مذاکرات کار کے لئے یہ لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے مدمقابل مذاکرات کار کے حسن نیت کی رعایت کرے، اور اس کے ظاہری پر اعتماد کرے، چاہے معاملہ مذاکرات جاری رکھنے کا ہو، یا مذاکرات سے نکلنے یا انہیں ختم کرنے کا ہو، جب تک کہ مدمقابل فریق کی طرف سے کوئی ایسا عمل نہ سرزد ہو جس سے مذاکرات سے دستبرداری کا اظہار ہورہا ہو، اس حقیقت کی مزید وضاحت اور تاکید اللہ تعالی کے اس قول ہوتی ہے: ''اے ایمان والو! جب تم زمین میں سفر کرو تو خوب تحقیق کرلیا کرو، اور جو کوئی تمہیں سلام کرے تو یہ نہ کہا کرو کہ تم مؤمن نہیں ہو، تم دنیاوی زندگی کے ساز وسامان کی خواہش رکھتے ہو، تو اللہ تعالی کے پاس بہت زیادہ مال غنیمت ہے، یہی حال اس سے پہلے تمہارا بھی تھا تو اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا، اس لئے خوب تحقیق کرلیا کرو اور جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے اللہ تعالی خوب واقف ہے'' (سورۂ نساء: ۹۴)۔

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا یہ قول بھی مذکورہ حقیقت کو مؤکد کرتا ہے: ''مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں کے اقوال کا محاسبہ کروں، اور اللہ تعالی اندرونی احوال کا نگراں ہے''، یہ سارے اصول اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ لوگوں کے اعمال کو ظاہر پر محمول کیا جائے، اس لئے یہ طے شدہ ہے کہ جو کوئی ظاہراً اپنے کو مسلمان بتائے اسے مسلمان شمار کیا جائے گا، اور بھی ان کے

۶۳- ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۸۶۵۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۸، ص ۴۱۔ دکتور ابراہیم أحمد، السفارات الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۱۵-۱۶۔

علاوہ دیگر دلائل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ظاہر کو دیکھتے ہوئے حسن نیت کا اعتبار کیا جائے گا، بالخصوص ان مذاکرات میں جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہوں جب تک کہ کوئی ایسا عمل سرزد نہ ہو جس سے حسن نیت کا معاملہ مشکوک ہو جائے (۶۴)۔

۶۴- سورۃ النساء: ۹۴، السیوطی، اسباب النزول، مرجع سابق، ج ۱ ص ۱۰۱-۱۰۲۔

دوسرا مبحث

معاہدات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

دوسرا مبحث

معاہدات اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

حقیقت میں معاہدے اس طور پر بڑی اہمیت کے حامل ہیں کہ وہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کو منظّم کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں، معاہدوں کو اس قدر بلند مقام حاصل ہونے کے بہت سے عوامل اور محرکات ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ فریقین کی باہمی رضامندی سے طے پانے والے معاہدوں کے نتیجہ میں حقوق کا تعین ہوتا ہے اور فرائض کی درجہ بندی ہوتی ہے، اس طرح معاہدات غیر اسلامی ممالک سے اسلامی مملکت کے تعلقات اور ان کے مابین تعاون کے فروغ کا ایک بہتر ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، اس طرح معاہدہ جب کسی خاص موضوع یا خاص قضیہ میں ہوتا ہے اسلامی مملکت اور دوسری حکومت کے درمیان، تو اس سے اس چیز کی قانونی ضمانت ملتی ہے کہ اس موضوع یا اس مسئلہ سے متعلق جو بھی ذمہ داریاں ہیں ان کو روبہ عمل لایا جائے گا اور ان کا پاس ولحاظ رکھا جائے گا، اس لئے کہ معاہدہ میں جن ذمہ داریوں کے انجام دینے کا عہد کیا گیا ہے، وہ معاہدہ میں شامل ہر فریق کے اختیار اور اس کی رضامندی سے اس پر عائد کی گئی ہے۔

چنانچہ اسلامی مملکت کی طرف سے معاہدہ کے احکام کے تقاضوں پر پورا اترنا بھی معاہدوں کے احترام میں شامل ہے، جس کی صراحت کتاب وسنت میں کردی گئی ہے(٦٥)۔

دوسرے پہلو سے یوں کہا جاسکتا ہے کہ معاہدہ اگر ایک طرف عام حالات میں ایک ایسے طریقہ پر اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان مصالحاتی تعلقات کو منظّم کرنے کا

٦٥- اس سلسلے میں اس کتاب: مبدأ الوفاء بالعہود واحترام المواثیق. فی الدرسۃ المتعلقۃ بالأساس الشرعی والمبادء الحاکمۃ للعلاقات الخارجیۃ للدولۃ الإسلامیۃ'' کا مطالعہ کریں۔

ذریعہ ہے، جس کی وجہ سے اسلامی مملکت کو ایک ایسا مناسب ماحول مل جائے، جس میں وہ دعوتی کام کو عام کر سکے، اور تمام انسانوں کے درمیان امن وامان کی فضا کو فروغ دے سکے تو دوسری طرف معاہدہ جنگ کے وقت اسلامی مملکت کے غیر مسلم حکومت سے تعلقات کو منظّم کرنے کا ایک مناسب اور حسب حال ذریعہ ہے، بالخصوص اس طرح کے ناگفتہ بہ ماحول میں جب اس بات کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے کہ قیدیوں اور زخمیوں کے تبادلہ پر یا وقتی مصالحت کو مستحکم کرنے پر معاہدہ کرلیا جائے یا اور دیگر ان امور پر معاہدہ کرلیا جائے جو جنگ کو جاری رکھنے یا جنگ ختم کرنے سے متعلق ہوں، گذشتہ سطور میں بیان کی گئی ہے اس کا ماخذ اسلامی مملکت کے قیام یعنی عہد رسالت اور خلفائے راشدین کے دور میں کئے گئے معاہدات ہیں، ان ادوار میں غیر اسلامی معاہدے کئے گئے، جن کا مقصد سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ جنگ وامن کی حالت میں دعوت اسلامی سے متعلق تمام امور ومسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے فریقین کے درمیان تعلقات کو منظّم کیا جائے (٦٦)۔

جب یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ گئی کہ معاہدوں کی اہمیت اس لئے ہے کہ وہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کو استوار کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ چند ایسے مسائل کو زیر بحث لایا جائے جو اسلام میں معاہدہ کی مشروعیت کی وضاحت سے مربوط ہیں، اس ضمن میں معاہدوں کی ان تمام انواع کا تفصیلی تذکرہ ضروری ہوجاتا ہے جن سے استفادہ اسلامی مملکت کے لئے غیر اسلامی مملکت سے معاہدہ کرتے وقت ضروری ہے، ساتھ ہی معاہدوں کے درمیان پیش آنے والے مراحل اور ان شرائط کا ذکر بھی ضروری ہے جو معاہدوں کی درستگی کے لئے لازم ہیں۔ اسی طرح اس کا بھی بیان ضروری ہے کہ اسلامی مملکت اور دیگر ممالک باہمی تعلقات میں معاہدے کالعدم اور غیر مؤثر ہوتے ہیں۔

٦٦- دراسۃ میں صفحہ نمبر ۴۲ دیکھیں، مزید تفصیل کے لئے دیکھیں: ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۸٦۵۔

پہلا مطلب

معاہدہ کی تعریف اور اسلام میں اس کی قانونی حیثیت کا بیان

لفظ معاہدہ لغوی طور پر اعتہاد سے ماخوذ ہے، تعاہد اور تعہد یہ دونوں الفاظ ایک معنی میں استعمال ہوتے ہیں یعنی کئے گئے معاہدہ کی تجدید کرنا(٦٧)، قرآن کریم میں اور بھی الفاظ مستعمل ہوئے ہیں، جو لفظ معاہدہ کے مترادف ہیں، جیسے ذمہ، حلف اور میثاق(٦٨)۔

قرآن کریم میں معاہدہ کے مفہوم میں استعمال ہونے والے الفاظ میں ایک تو لفظ ''معاہدۃ''ہی ہے جیسے ''**إلا الذين عاهدتم من المشركين**''(سوائے ان لوگوں کے جن سے تم نے مشرکین میں سے معاہدہ کیا ہے)، دوسرا لفظ ''عہد'' ہے، جیسے ارشاد ربانی ہے: ''**وأوفوا بعهد الله اذا عاهدتم**''(جب تم معاہدہ کرو تو اللہ تعالی کے معاہدہ کو پورا کرو)، تیسرا لفظ یمین ہے:''**ولا تنقضوا الأيمان بعد توكيدها**'' (اور قسموں کو مضبوط ہونے کے بعد مت توڑو)، چوتھا لفظ ''عقد'' ہے:''**يا يها الذين آمنوا أوفوا بالعقود**''(اے ایمان والو! اپنے معاہدوں کو پورا کرو)، پانچواں لفظ ''میثاق'' ہے: ''**وإن استنصروكم فى الدين**

٦٧- المعجم الوسیط. مختار الصحاح، مادۃ عہد۔

٦٨- أبوالفرج البغدادی، زاد المسیر فی علم التفسیر، المکتب الإسلامی للطباعۃ والنشر، د.ت.، ج١، ص٥٦۔
"ذمہ" کے ایک معنی "عہد" کے بھی ہیں (المعجم الوسیط، مادہ: ذمم)۔اسی طرح "اللہ" (اللّٰ) کے بھی ایک معنی "عہد اور حلف" (یعنی قسم اور معاہدہ) ہیں (لسان العرب، مادہ: اللّٰ)۔"یمین" (قسم) بھی عہد ہی کو کہا جاتا ہے، اور اس کی تاکید کے لیے قسم اٹھائی جاتی ہے (لسان العرب، مادہ: یمین)۔"حلف" کا مطلب ہے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون، مدد اور اتفاق کے لیے معاہدہ کرنا، اور یہ سب "حلف" یعنی "قسم" کے مادہ سے ہیں (المعجم الوسیط، مادہ: حلف)۔یعنی یہ تمام الفاظ — ذمہ، اللہ، یمین، اور حلف — عہد و معاہدہ، قسم اور باہمی تعاون کے معانی میں استعمال ہوتے ہیں۔

فعليكم النصر، إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق'' (اگر وہ لوگ تم سے دین میں مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد واجب ہے، سوائے اس قوم کے تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو)۔

گذشتہ آیات میں مذکور الفاظ جیسے عقود، عہود اور مواثیق وغیرہ جو تفاسیر لکھی گئی ہیں وہ سب کی سب ایک ہی مفہوم کے گرد گردش کر رہی ہیں، یعنی جس پر معاہدہ ہو جائے اور جس کے احکام کی تعمیل تمام فریقوں پر ضروری ہو جیسے لفظ حلف وغیرہ کے احکام (۶۹)۔

حدیث پاک کے ذخیرہ میں جو الفاظ معاہدہ کے مفہوم کو واضح کرتے ہیں ان میں ایک لفظ 'شرط' ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**المسلمون على شروطهم**'' (مسلمان اپنے معاہدوں کے پابند ہیں)، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ہر وہ معاہدہ جس کی اصل اللہ تعالی کی کتاب میں موجود نہ ہو وہ باطل ہے''، لفظ حلف بھی حدیث میں معاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں عبداللہ بن جدعان کے گھر میں ہونے والے معاہدہ میں شریک رہا، مجھے اس کے بدلے سرخ اونٹنیاں بھی پسند نہیں، اگر مجھے زمانہ اسلام میں بھی اس کی پیش کش کی جائے گی تو میں اسے ضرور قبول کروں گا''، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**أيما حلف كان في الجاهلية**'' (کوئی بھی ایسا معاہدہ جو زمانہ جاہلیت میں ہوا اسلام اسے مضبوط ہی بناتا ہے البتہ اس کا مطابق شرع ہونا ضروری ہے)، اسی طرح لفظ 'معاہدہ' بھی معاہدہ کے معنی میں حدیث میں استعمال ہوا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''سن لو جو کوئی ظلم کرے اس شخص پر جس سے کوئی معاہدہ کیا گیا ہو یا اس کی حق تلفی کرے یا اسے اس کی طاقت سے بڑھ کر مکلّف کرے تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے وکالت کروں گا''، لفظ ذمہ بھی معاہدہ کے معنی میں آیا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''**من آذى ذميا فأنا خصمه**'' (جو کوئی کسی ذمی یعنی جس سے جان مال

۶۹- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۲۴-۱۲۶، ج ۶، ص ۳۲-۳۳، محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ۵/ ۱۸۵۔

کی حفاظت کا معاہدہ ہو چکا ہو، کو تکلیف دے تو میں اس کے حق میں اس کی طرف سے فریق بنوں گا)، لفظ 'امان' بھی حدیث میں معاہدہ کے معنی میں آیا ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے: "**أيما رجل من أقصاكم أو أدناكم من أحراركم أوعبيدكم أعطى رجلا منهم أمانا، فله الأمان حتى يسمع كلام الله**" (اگر تم میں کا کوئی خواہ دور کا ہو یا قریب یا آزاد ہو یا غلام لوگوں میں سے کسی کو امن دے دے یعنی امن دینے کا معاہدہ کر لے تو اسے امن حاصل ہو گا یہاں تک کہ وہ اللہ تعالی کا کلام سن لے)، لفظ "صلح" بھی معاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "**لعلكم تقاتلون قوما فتظهرون عليهم فيصالحونكم على صلح فلا تصيبوا منهم فوق ذلك، فإنه لا يصلح لكم**" (امید ہے کہ تم لوگ جنگ کرو ایسے لوگوں سے جن پر تم غالب آ جاؤ اور وہ لوگ تم سے کسی معاہدہ پر مصالحت کر لیں، تو تم اس سے آگے انہیں کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کیونکہ ایسا کرنا تمہارے لئے روا نہیں)، اور لفظ 'خطۃ' بھی معاہدہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ صلح حدیبیہ سے تھوڑا پہلے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**والذى نفسى بيده لا يسألونى خطة يعظمون فيها حرمات الله، الا أعطيتهم إياها**" (۷۰) (اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر وہ لوگ مجھ سے کسی بھی ایسے معاہدہ کی بابت درخواست کریں گے جو اللہ تعالی کے مقدسات کے احترام پر مشتمل ہو تو میں ضرور قبول کروں گا)۔

۷۰- القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج۶، ص ۲۳-۳۳۔ ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۵۲۴-۵۲۵۔ محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۶، ص: ۹۸۔ دکتور أحمد أبو الوفا محمد، المعاہدات الدولیۃ فی الشریعۃ الإسلامیۃ، القاہرۃ، دار النہضۃ العربیۃ، الطبعۃ الأولی ۱۴۱۰ھ/ ۱۹۹۰م، ص ۱۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔ الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۳۱۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقۃ الاسلامی، دمشق، دار الکفر ۱۹۶۲م، ص ۱۳۱-۱۳۲۔ دکتور محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیر ۃ، مرجع سابق، ص: ۲۵۲۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۲۸۔

حضرت علیؓ نے والی مصر اشتر نخعی کو جو خط لکھا اس کے زیادہ تر الفاظ وہ ہیں جو معاہدہ کے مفہوم پر دلالت کرتے ہیں جیسے ایک لفظ صلح استعمال ہوا ہے، ''**ولا تدفعن صلحا دعاک الیه عدو ،لک وللہ فیه رضا** ''(تم ایسے معاہدہ کو رد نہ کرو جس کی تمہیں تمہارے دشمن دعوت دیں، اس میں تمہارے لئے اللہ تعالی کی خوشنودی ہے)، لفظ عقدہ بھی معاہدہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے، جیسے ''**وإن عقدت بینک وبین عدوک عقدة**''(اگر تم اپنے اور اپنے دشمن کے درمیان معاہدہ کرو)، لفظ ذمہ اور عہد کا بھی یہی حال ہے جیسے ''**أو البسته منک ذمة فلا تعذرن بذمتک ولا تخسین بعهدک**'' (اگر تم نے اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا ہے تو اپنے معاہدے میں بد دیانتی نہ کرو اور اپنے معاہدہ کو مت توڑو)، ''**وحط عهدک بالوفاء وارع ذمتک بالأمان**''(۷۱)(اپنے معاہدے کو پورا کرو اور امن دے کر اپنے معاہدہ کا خیال رکھو)۔

معاہدہ کا اصطلاحی مفہوم اس کے لغوی مفہوم سے مطابقت رکھتا ہے، اسی پر عمل ہوتا رہا ہے اور تواتر کے ساتھ اسے حکومتیں اور معاشرے زیر عمل لاتے رہتے ہیں، اس اعتبار سے کہ لفظ معاہدہ دراصل فریقین یا دو سے زیادہ فریقوں کے درمیان ہونے والے عہد کے لئے بولا جاتا ہے، لہذا معاہدہ فقہ اسلامی کے قدیم اور جدید ذخیرہ کے مطابق ہر اس اتفاق اور عہد کو کہا جائے گا جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کیا جائے، اور جس کا اصل مقصد یہ ہو کہ دعوتی مصالح ومقاصد کو بروئے کار لایا جائے گا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی اہم ہے کہ معاہدہ کی وہ تمام تعریفات جو قدیم فقہاء نے کی ہے وہ سب کی سب اس حیثیت سے امتیازی شان رکھتی ہیں کہ ان کے اغلب حصہ کا اطلاق معاہدوں کی اس متعین قسم پر ہوتا ہے جو مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان طے پاتی ہے، اس

۷۱- نہج البلاغۃ لعلی بن أبی طالب بشرح ابن أبی الحدید، القاہرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۲۹ھ ج ۲، ص ۱۴۰-۱۴۲۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، أثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۲۸۔

سے میری مراد صلح یا مصالحت کے معاہدے ہیں (۷۲)، زیادہ تر تعریفات جو جدید فقہ کے مطابق اسلام میں معاہدہ کے مفہوم کی کی گئی ہیں، وہ ''مسلم غیر مسلم تعلقات'' کے تصور سے میل نہیں کھاتی ہیں، یہ وحدت یا تعدد یا طاقت اور کمزوری کے اعتبار سے اسلامی مملکت کی صورت حال کے ادراک سے قاصر ہیں، ساتھ ہی ان تمام تعریفات میں اکائیوں یا اداروں کی شکل میں موجودہ بین الاقوامی تعلقات کی حالیہ پیش رفت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے، سوائے ان ممالک کے جو کم وبیش بین الاقوامی معاملات کے نظم ونسق کے حوالے سے اثر ورسوخ اور عالمی پوزیشن کے حامل ہیں، مثال کے طور پر بعض حضرات نے معاہدہ کی تعریف یہ کی ہے کہ اسلام میں معاہدہ کہتے ہیں جو اسلامی اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان طے پانے والے اس بین الاقوامی عہد کو جو اپنے مزاج کے اعتبار سے اتحاد واتفاق کا حامل ہو، اور اس کا مقصد متعینہ وقت کے لئے طرفین کے درمیان

۷۲- معاہدے کی تعریف میں (اختزال) کی جو مثالیں دی جاتی ہیں، ان میں سے ایک بعض علما کا یہ قول ہے کہ: "معاہدہ وہ عقد ہے جو مسلمان، حربی (یعنی جنگی حالت میں موجود کافر) کے ساتھ اس بنیاد پر کرتا ہے کہ ایک متعین مدت تک فریقین ایک دوسرے سے باز رہیں گے، اور اس مدت میں وہ (حربی) اسلامی حکومت کے زیرِ حکم نہیں ہوگا۔" (الخرشی علی مختصر خلیل، ج ۸، ص ۴۵۹ مشار الیہ فی د. محمد الصادق عفیفی، الإسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۳۸)، اسی طرح ایک اور قول یہ ہے کہ:

"معاہدہ وہ عقد ہے جو مسلمانوں اور اہلِ جنگ کے درمیان اس بات پر ہوتا ہے کہ ایک مخصوص مدت کے لیے جنگ بند رکھی جائے، چاہے اس کے بدلے کوئی معاوضہ طے کیا جائے یا نہ کیا جائے۔" (ابن قدامۃ، المغنی، القاہرۃ، مطبعۃ المنار، الطبعۃ الأولی، ۱۳۴۸ھ، ج ۸، ص ۴۵۹). تیسرے بعض فقہاء کے نزدیک: "یہ ایک ایسا عقد ہے جس میں مسلمانوں اور اہلِ حرب کے درمیان اس بات پر مصالحت ہوتی ہے کہ ایک متعین مدت تک جنگ ترک کی جائے۔"

ایسے معاہدے کو فقہ میں موادعۃ (یعنی جنگ بندی) کہا جاتا ہے، اور اگر یہ معاہدہ خاص سالوں کے لیے ہو تو اسے "موادعۃ سنین معلومۃ" (یعنی مخصوص برسوں کے لیے جنگ بندی) کہا جاتا ہے (السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج ۴ ص: ۷۰)۔

گذشتہ تفصیلات سے رجوع کریں: دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۳۸-۳۹۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، أثار الحرب فی الفقہ الإسلامی، مرجع سابق، ص ۳۲۱-۳۲۲۔ دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۳۰۳-۳۰۴۔

متعینہ شرعی حقوق اور ذمہ داریوں کو وجود بخشتا ہو، ساتھ ہی اس میں وہ تمام اصول وضابطے بھی مذکور ہوں جن کے اردگرد معاہدہ گردش کر رہا ہو۔

لیکن وہ معاہدہ کسی مخصوص شکل نمونہ کے طور پر نہ ہو(۷۳)، کچھ لوگوں کا یہ احساس ہے کہ مذکورہ تعریف میں ایک طرح کی تکرار ہے کیونکہ اس میں 'عقد اور اتفاق' دونوں کو جمع کر دیا گیا ہے، جبکہ اصل کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں، ساتھ ہی جس تعریف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہ ان ممالک کو چھوڑ کر جن سے اسلامی مملکت کے لئے بین الاقوامی معاہدے کرنا ممکن ہو، دیگر اکائیوں یا قانونی حیثیت کے حامل اداروں کو نظر انداز کرتی ہے۔اس سے مراد وہ صورت ہے جب کسی اسلامی مملکت کو کسی بین الاقوامی تنظیم کے ساتھ معاہدہ کرنے کی ضرورت پیش آئے، جیسے تنظیم اسلامی کانفرنس، مذکورہ نقطہ نظر کے مطابق جو تعریف کی گئی ہے، اس کی روشنی میں غیر متعینہ مدت کے لئے معاہدہ کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، جبکہ وہ معاہدے جن کا اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکت کے ساتھ کرنا جائز کبھی وہ عارضی ہوتے ہیں (جیسے کہ صلح) کبھی وہ دائمی ہوتے ہیں جیسے (بعض صورتوں میں کیا جانے والا عقد ذمہ)۔ ان سب کے علاوہ اس تعریف کے مطابق سیاسی اتحاد کو بین الاقوامی معاہدے میں شمار نہیں کیا جا سکتا، جبکہ اس سیاسی اتحاد کا مقصد کیا ہے؟ وہ بیان نہیں کیا گیا ہو، وہ اتحاد جو گروہوں اور سماج کے مختلف طبقوں کے درمیان کیا جاتا ہے یا اس سے مقصود وہ اتحاد ہے جو اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان محدود مدت کے لئے یا خاص صورتحال کا سامنا کرنے کے لئے کیا جاتا ہے، ایسے اتحاد کو اس کے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے معاہدہ کہا جائے گا(۷۴)۔

اسلام میں معاہدہ کی ایک دوسری تعریف بھی کی گئی ہے اس کی رو سے یہ ایک ایسا عہد

۷۳- دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۵۲-۵۳۔

۷۴- دکتور أحمد ابوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۱۲-۱۳۔

ہے جو اسلامی مملکت کی طرف سے قانونی حیثیت کے حامل بین الاقوامی اداروں کے ساتھ کیا جائے، جس کا مقصد یہ ہو کہ بین الاقوامی قانون کے ضوابط کے زیر اثر بین الاقوامی قانونی نتائج حاصل کئے جائیں (۷۵)، اگر ایک طرف یہ تعریف ریاستوں کے ساتھ بین الاقوامی قانونی اداروں کے ظہور کی شکل میں موجود بین الاقوامی تعلقات میں ہونے والی پیش رفت سے ہم آہنگ ہے، دوسری طرف یہ اپنے بعض اجزاء کے اعتبار سے مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات استوار کرنے کی اصل حقیقت سے ہم آہنگ نہیں ہے، وضاحت کے طور پر اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ بات کہ ''جس کا مقصد یہ ہو کہ بین الاقوامی قانون کے ضوابط کے زیر اثر بین الاقوامی نتائج حاصل کئے جائیں'' میل نہیں کھاتی غیر مسلم فریق کے موقف سے، کیونکہ غیر مسلم فریق شرعی احکام کا قائل نہیں ہوتا، کیونکہ اس میں وہ خصوصی دفعات شامل ہوتی ہیں جو اسلامی ریاست کے بیرونی تعلقات منظّم کرنے سے متعلق ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام وضوابط جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہونے والے معاہدے میں مؤثر ہوتے ہیں، ان کا اثر صرف اس حد تک ہے کہ فریقین کے درمیان اتفاق ہوجائے اور دونوں کے درمیان رضامندی ثابت ہوجائے، ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی مملکت سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ غیر اسلامی مملکت سے شریعت مخالف احکام پر اتفاق نہ کرے، ورنہ ایسا معاہدہ باطل سمجھا جائے گا، جس کا عملاً کوئی اثر نہ ہوگا۔

بالفاظ دیگر شریعت اسلامی کے وہ احکام جو معاہدوں کو منظّم کرتے ہیں جیسے اسلامی مملکت اور دیگر ممالک جو کہ غیر اسلامی ہیں، کے درمیان تعلقات کا تبادلہ کیسے ہو؟ ان احکام کی پابندی غیر مسلموں کے لئے ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کی پابندی صرف اسلامی مملکت کے لئے

۷۵- المرجع السابق، ص ۱۲۔

ضروری ہے، اس پر یہ لازم ہے کہ وہ ان احکام کے تقاضوں کے مطابق غیر اسلامی ریاستوں سے تعلقات قائم کرے، اس حقیقت کی وضاحت اور اس کی تاکید ان مذاکرات سے ہوجاتی ہے جو صلح حدیبیہ کے موقع پر ہوئے تھے، جن کے نتیجہ میں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان حقوق کی تحدید کی گئی، اور فریقین کے اتفاق اور ان کی باہمی رضامندی سے ان پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوئیں، مگر یہ واضح رہے کہ شریعت کی دفعات کا کوئی اثر غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والی صلح پر نہ تھا، البتہ اسلامی فریق نے شرعی احکام کی رعایت کی اور وہ اس کے تقاضوں پر عمل پیرا رہا(۷۶)۔

گذشتہ بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلام میں معاہدہ کی دقیق تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ یہ ایک ایسا عہد ہے جسے اسلامی مملکت کے لئے شرعی احکام کے مطابق روبہ عمل لانا جائز ہے، خواہ وہ ایک کے ساتھ ہو یا ایک سے زائد اکائیوں یا بین الاقوامی سطح کے قانونی اداروں کے ساتھ ہو، جس کا مقصد فریقین کے باہمی تعلقات سے متعلق کسی موضوع یا متعین مسئلہ کو لازمی طور پر حل کرنا ہو، اس میں کوئی شک نہیں کہ معاہدہ کی تعریف اس طریقہ پر مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی حقیقت سے بالکل میل کھاتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس سلسلے میں شرعی احکام کی رعایت صرف اسلامی فریق سے متعلق ہوگی، ساتھ ہی یہ بات بھی مد نظر رہنی چاہئے کہ یہ تعریف بین الاقوامی سطح کے قانونی حیثیت کے حامل اداروں کے حوالے سے ہونے والی معاہدہ کی وجہ سے پیش رفت کو بھی اپنے جلو میں سموئے ہوئے ہے، علاوہ ازیں یہ تعریف اسلامی ممالک کی ایک سے زائد صورت حال سے بھی متصادم نہیں ہے۔

۷۶- المرجع السابق، ص ۲۲-۲۴۔

دوسرا مطلب

معاہدات طے کرنے کے مراحل

معاہدہ کا عمل کئی مرحلوں سے گزرتا ہے، یہ سارے مرحلے یا زیادہ تر مرحلے وہ ظاہری شرائط ہیں جن کا پایا جانا اسلامی شریعت میں معاہدہ کی درستگی کے لئے ضروری ہے معاہدوں کے مراحل درج ذیل ہیں:

۱- مذاکرات:

اس مرحلہ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آیا طرفین- یعنی مسلم اور غیر مسلم- کے درمیان باہمی مذاکرات اور گفت وشنید سے دلچسپی اس غرض سے کہ دونوں کے باہمی تعلقات سے متعلق کسی معاملہ کو منظّم کرنے پر معاہدہ ہوجائے، پائی جاتی ہے یا نہیں؟ اگر دلچسپی پائی جاتی ہے تو اس طرح کی دلچسپی فریقین کو مہمیز لگاتی ہے کہ وہ ایسے مذاکروں میں شریک ہوں جو زیر غور مسئلہ کے مزاج کے لحاظ سے طویل بھی ہوسکتے ہیں اور مختصر بھی، معاہدوں کے پہلے مرحلہ میں مذاکرات کی اہمیت اس طور پر ہے کہ اس میں چونکہ مذاکرات کار فریقوں کی باہمی گفتگو ہوتی ہے اور ان کے درمیان نقطہ ہائے نظر کا تبادلہ ہوتا ہے- اس لئے فریقین کو اتفاقی پہلوؤں کی تعیین کا موقع دیا جاتا ہے، یعنی وہ نقطے جو مذاکرات کو جاری رکھنے کے لئے مشترک بنیاد فراہم کرتے ہیں، اور جن کے ذریعہ مذاکرات کے پس پردہ مطلوبہ مقاصد تک رسائی ممکن ہوتی ہے(۷۷)۔

نیز معاہدہ طے کرنے سے متعلق مذاکرات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ معاہدہ کو اختتامی صورت میں لکھنا ممکن ہوجاتا ہے، اور دونوں طرف سے معاہدہ کی اس تحریر پر

۷۷- راجع المبحث الخاص بالتفاوض۔

دستخط لینا آسان ہوجاتا ہے۔

یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ مذاکرات کی کاروائی باہمی رضامندی کے ساتھ پرامن طریقہ پرانجام پاتی ہے، جواپنے مزاج میں ایک طرح سے باہمی دستبرداری کا تقاضہ کرتی ہے، اس کے بعد مسلم فریق مذاکرات میں شامل ہوتا ہے، ''متعینہ مذاکراتی موقف'' کے مطابق یا 'مذاکراتی منصوبہ' کے مطابق یہ ''مذاکراتی موقف یا منصوبہ'' جس کی وجہ سے مسلمانوں کے بلند مقاصد و اقدار کے درمیان اور ثانوی یا کم اہمیت کے حامل ان امور کے درمیان فرق پر مبنی ہوتا ہے جن میں تنازلات کی گنجائش ہوتی ہے جن سے دستبرداری اختیار کرنا وقتی طور پر جائز ہوگا(۷۸)۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم مذاکرات کار کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس کوئی تحریر یا کوئی ایسی دستاویز ہو جو اس بات کی سند ہو کہ اسے اسلامی مملکت کی طرف سے مذاکرات میں نمائندگی اور مملکت کے عزائم اور موقف کی ترجمانی کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے۔

اس نقطہ نظر کی صراحت اس سے بھی ہوتی ہے کہ پہلے زمانے میں سفارت کاروں اور نمائندگی پر مامور افراد کو بہت ساری دستاویز دی جاتی تھیں جن سے ان کی شناخت ہوتی تھی اور جن میں ان کے بھیجے جانے کا مقصد درج ہوتا تھا، ایسا اس لئے بھی کیا جاتا تھا تاکہ مذاکرات میں شریک دوسرے فریق کی طرف سے انہیں امن وامان اور تحفظ مل جائے، اور دوسرے فریق کو یہ اعتماد حاصل ہوجائے کہ وہ اسلامی مملکت کی طرف سے بطور نمائندہ آیا ہے(۷۹)، یہ ایک فطری بات ہے کہ اس طرح کی دستاویز سپرد کرنے کی اس وقت ضرورت باقی نہیں رہتی ہے جب اسلامی مملکت کا سربراہ اعلی یا اس کا نائب یا اس کوئی وزیر کسی غیر اسلامی مملکت کے اپنے ہم منصب سے مذاکرات کرے، ایسا اس وجہ سے کہ ایسے ذمہ داروں کی سرکاری اور عوامی حیثیت

۷۸- راجع أیضا ما سبق بشأن الاعداد للتفاوض فی المبحث المتعلق بالتفاوض۔

۷۹- دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام، الاسکندریۃ، منشأۃ المعارف ۱۹۸۹ .ص۲۶- وراجع أیضا ما سبق، ص۱۵۔

سب کو معلوم ہوتی ہے، لہذا وہ ان تمام دستاویزات سے بے نیاز ہوجاتے ہیں جن کا غیر سے مطالبہ کیا جاتا ہے(۸۰)۔

۲-معاہدہ کو ضبط تحریر میں لانا:

معاہدہ کو قلم بند کرنے کا حاصل یہی ہے کہ جو کچھ معاہدہ میں شریک افراد کے درمیان مذاکرات کے دوران طے پا گیا اسے تحریری شکل دے دی جائے تاکہ فریقین کے باہمی حقوق اور ذمہ داریوں کی توثیق کی یقین دہانی، معاہدہ کو تحریر میں لانا شرعی نقطہ نظر سے ایک واجب حکم ہے تحریر سے حاصل ہونے والے منافع کے پیش نظر، اس کا سب سے اہم فائدہ یہ ہے کہ یہ براہ راست درجہ اول کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، جس میں بہت کم شک کی گنجائش ہوسکتی ہے، یہ فریقین کے درمیان طے شدہ امور کے سلسلہ میں پیش آنے والے کسی بھی تنازعہ یا اختلاف کے خاتمہ کا ذریعہ ہو۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ معاہدہ کو تحریری شکل دینے میں جیسا کہ بعض کا نقطہ نظر ہے، فریقین کے حقوق کا تحفظ اور ان کے درمیان تنازعات کا خاتمہ ہے، غلط شرطوں سے گریز ہے اور معاہدہ پر زیادہ عرصہ گزر جانے کی صورت میں اس سے متعلق پیدا ہونے والے شک وشبہ کا ازالہ ہے(۸۱)۔

معاہدہ کا لکھنا ضروری ہے اس کی اصل دلیل شرعی اللہ تعالی کا یہ قول ہے: ''اے ایمان والو! جب تم ایک مقررہ مدت کے لئے ادھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو.....، اور مدت مقررہ پر ادھار معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا، لکھنے میں سستی نہ کرو، اس طرح لکھ لینا اللہ کے نزدیک زیادہ قرین

۸۰- دکتور أحمد أبوالوفا، مرجع سابق، ص۴۸-۴۹۔

۸۱- السرخسی، المبسوط، بیروت، دارالمعرفۃ، ط۲، د.ت، ج۳، ص۱۶۷-۱۶۸۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام، مرجع سابق، ص:۴۸۵۔

انصاف ہے، گواہی کو درست رکھنے کا باعث اور شک وشبہ سے بچانے والا ہے'' (۸۲)، یہ آیت دلیل ہے اس بات کی کہ معاہدہ چاہے وقتی ہو یا دائمی، اس کا لکھ لینا واجب ہے، کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں وہ فریقین کی باہمی ذمہ داریوں اور حقوق کی ایک قسم شمار کیا جاتا ہے، جبکہ جمہور مفسرین کا کہنا ہے کہ آیت مذکورہ میں معاہدہ کے لکھنے کا حکم استحبابی ہے (۸۳)، دوسری رائے یہ ہے کہ معاہدہ کو تحریری شکل دینا واجب ہے، بالخصوص جب معاہدہ طویل مدت کے لئے ہو، اگر ایسی صورت میں اسے نہ لکھا گیا تو اس میں گناہ کا ایک شائبہ ہے، دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح کے حالات میں شرعی نقطہ نظر سے معاہدہ کے لکھنے کا حکم دیا گیا ہے، اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے "**إذا تداينتم بدين إلى أجل مسمى فاكتبوه**"، جیسا کہ اللہ تعالی کے اس قول "**إلا أن تكون تجارة حاضرة تديرونها بينكم**" کا مفہوم مخالف تاکید کے ساتھ یہ بتاتا ہے کہ جو معاہدہ طویل مدت کے لئے ہو اگر اس کی

۸۲- سورۃ البقرۃ/ ۲۸۲، نیز دیکھئے: القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۳، ص ۳۸۲-۳۸۳۔ محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۳، ص ۱۰۰-۱۰۶۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ تحریر (لکھنا) کا وجوب ایک عام حکم ہے جو تمام لین دین کرنے والوں پر لاگو ہوتا ہے، جن میں ان پڑھ (امی) افراد بھی شامل ہیں۔ اور موجودہ دور میں یہ وجوب اُس چیز کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے جسے آج "رسمی معاہدات" یا "سرکاری دستاویزات" کہا جاتا ہے۔ اور معاہدات اور دستاویزات لکھنے والا شخص دراصل لوگوں کے درمیان فیصلہ کن عدالت کی حیثیت رکھتا ہے، لہٰذا لازم ہے کہ وہ عادل، منصف اور معاملات و احکام کا علم رکھنے والا ہو، تاکہ جو کچھ وہ لکھے اُس پر بعد میں تنازع پیدا نہ ہو۔

اسی طرح وہ (مصنف) ایک اور مقام (صفحہ 111-112) پر یہ بھی اشارہ کرتا ہے کہ: آیت کا ظاہر، اسلوب اور اس کی تفسیر کا طریقہ یہ واضح کرتا ہے کہ اس آیت میں حکم "وجوب" (لازمی ہونے) کے درجے میں ہے، کیونکہ تحریر لین دین کرنے والوں کے لیے اعتماد اور ثبوت کا ایک ذریعہ (آلۂ استیثاق) ہے۔

۸۳- اس میں دیکھیں: القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع سابق (الطبعۃ الثانیۃ) ج ۳ ص ۳۷۷-۳۷۸ أبو السعود، تفسیر أبو السعود، مرجع سابق، ج ۱، ص ۲۶۹۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، (طبعۃ الشعب) ج ۱ ص ۴۹۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

تفصیلات قلم بند نہ کی جائیں تو گناہ لازم آئے گا(۸۴)۔

اگر معاہدہ مذکورہ نہج پر لکھا جائے گا تو وہ تحریر محض ثبوت نہیں رہے گی، بلکہ ظاہری طور پر معاہدے کی درستگی کے لئے لازمی شرط قرار پائے گی، کیونکہ ایسی صورت میں معاہدہ تحریر کرتے وقت بہت سے شرائط اور مسائل کی رعایت ضروری ہوجاتی ہے، تاکہ معاہدہ سے مربوط حیثیت اور مقصد کی تکمیل ممکن ہو، سب سے پہلی چیز جس کی رعایت معاہدہ کی تفصیلات لکھتے وقت ضروری ہے وہ یہ کہ معاہدہ جن زبانوں میں لکھا جائے کم از کم ان میں سے ایک عربی ہو کیونکہ عربی زبان اہم فوائد اور خصوصیات کی حامل ہے جن کا ذکر بعد میں آئے گا، ایسا اس وقت ہوسکتا ہے جب باہم معاہدہ کرنے والے فریقوں کے درمیان زبان کے بارے میں اختلاف ہو، یعنی ہر فریق کی زبان ایک دوسرے سے مختلف ہو، دوسرے الفاظ میں اللہ تعالی کے قول "**ومن آیاته .....واختلاف ألسنتكم وألوانكم**"(۸۵) سے یہ بات مستفاد ہوتی ہے کہ اسلام معاہدوں کو عربی زبان میں تحریر کرنے کا پابند نہیں کرتا، بلکہ ان تمام قانونی کاروائیوں کو مطلقا کسی بھی زبان میں لکھنے کی اجازت دیتا ہے(۸۶)، تو دوسری طرف معاہدہ کو عربی زبان میں لکھنا یا کم از کم اس کو

۸۴- السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج۵، ص۱۷۸۰۔ محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج۳، ص۱۰۰-۱۰۵۔ اسی طرح اس میں دیکھیں: ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج۱، ص۳۴۷۔

یہ (مصنف) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان "فَاكْتُبُوهُ" (تو اسے لکھ لو) کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تحریر ایک دستاویز (صَکّ) ہو، تاکہ انسان مدتِ ادائیگی کے وقت اسے یاد رکھ سکے، کیونکہ معاملے اور ادائیگی کی میعاد کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے، اس دوران بھول چوک کا امکان رہتا ہے۔ کیونکہ بھول جانا انسان کی فطرت میں شامل ہے، اور شیطان بعض اوقات انکار پر آمادہ کر دیتا ہے، اور اس دوران موت یا دیگر حادثات جیسے عوارض بھی پیش آسکتے ہیں۔ اسی لیے شریعت نے تحریر (کتابت) اور گواہی (اشہاد) کا حکم دیا تاکہ حقوق محفوظ رہیں اور نزاع نہ ہو۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص۴۸۵۔

۸۵- سورۃ الروم/ ۲۲۔

۸۶- اس کی مثال وہ بات ہے جو ابن قیم الجوزیہ نے ذکر کی ہے کہ: شریعت نے عقود (معاہدوں) کے الفاظ کے لیے کوئی خاص حد مقرر نہیں کی، بلکہ انہیں مطلق (عام) طور پر بیان کیا ہے۔ چنانچہ جس طرح معاہدے اُن الفاظ سے

معاہدہ تحریر کرنے اور اس کے متن کو قلم بند کرنے کے لئے ایک سرکاری زبان کے طور پر منتخب کرنا، عرب اور اسلامی قوت کا ایک اہم مظہر ہے، ساتھ ہی اس میں اسلامی مملکت کو حاصل ہونے والے فوائد کے پہلو سے یا اس کے اوپر عائد ذمہ داریوں کے نقطہ نظر سے معاہدے کے تحت طے ہونے والے ان حقوق اور ذمہ داریوں کے تعین میں درستگی اور انضباط کی ضمانت ہے، علاوہ ازیں اس سے شرعی احکام کی روشنی میں معاہدہ کی تصحیح ممکن اور آسان ہوجائے گی (۸۷)، اسی لئے بعض کا کہنا ہے کہ معاملات اور معاہدات کی تحریر میں عربی زبان کے استعمال کو اسلام کا شعار (۸۸)، اور اسلامی مملکت کے غلبہ وتفوق کو بروئے کار لانے کی ایک دلیل سمجھا جانا چاہئے، اس لئے بعض حضرات کے نزدیک بلاضرورت معاہدہ غیر عربی زبان میں لکھنے کو مکروہ سمجھا گیا ہے (۸۹)، جس طرح دیگر تمام احکام کو بلاوجہ غیر عربی زبان میں لکھنا ناپسندیدہ عمل سمجھا گیا ہے اسی طرح بعض حضرات کے نزدیک معاہدہ کا عربی میں لکھنا شرط کے درجے میں ہے (۹۰)۔

حقیقت یہ ہے کہ آیت کریمہ کی روشنی میں زبانوں کے اختلاف کو مدنظر رکھتے ہوئے اور فریقین کی زبان معاہدہ تحریر کئے جانے کے فوائد کو پیش نظر رکھتے ہوئے نیز اسلامی مملکت کی

منعقد ہوجاتے ہیں جو فارسی، رومی (یونانی/لاطینی) یا ترکی زبان میں دلالت (اشارہ) کرتے ہوں، تو عربی زبان کے اُن الفاظ سے معاہدوں کا منعقد ہونا بدرجہ اولیٰ اور زیادہ مناسب ہے، کیونکہ عربی شریعت کی اصل زبان ہے۔ ابن قیم الجوزیۃ، اعلام الوقعیین عن رب العالمین، القاہرۃ، مکتبۃ الکلیات الأہریۃ ۱۹۸۳ء، ج ۲، ص ۴۔

جیسا کہ ابن تیمیہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ: عقود (معاہدے) ہر اُس قول یا فعل سے صحیح ہوجاتے ہیں جو اُن کے مقصود پر دلالت کرے۔ نیز نہ تو اللہ کی کتاب میں، نہ رسول اللہ ﷺ کی سنت میں، اور نہ ہی صحابہ یا تابعین میں سے کسی سے یہ منقول ہے کہ انہوں نے معاہدوں کے لیے کسی خاص صفت، الفاظ یا کسی مخصوص طریقے کو مقرر کیا ہو، یا یہ کہا ہو کہ معاہدے صرف خاص صیغوں (الفاظ) سے ہی منعقد ہوں گے۔ ابن تیمیۃ، القواعد النورانیۃ الفقہیۃ، (تحقیق) محمد حامد الفقی، القاہرۃ، مکتبۃ السنۃ المحمدیۃ، ۱۳۷۰ھ، ص ۱۳۲-۱۳۳۔

۸۷- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، مرجع سابق، ج ۲۹، ص ۱۲۔ دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۳۵۔

۸۸- دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۱۵۰۔

۸۹- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، القاہرۃ، دار الرحمۃ للنشر والتفزیع، د. ت، ج ۲۹، ص ۱۲۔

۹۰- دکتور أحمد أبوالوفا، مرجع سابق، ص ۳۶-۳۸۔

شوکت اور کمزوری کی ان مختلف صورتحال کو بھی نظر میں رکھتے ہوئے، جن کی وجہ سے اصحاب اقتدار کی زبان میں تحریر شدہ معاہدوں کو قبول کرنے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے، ان تمام حالات کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا ممکن ہے کہ شرعا یہ بات طے ہے کہ عربی زبان اس معاہدہ کی دو زبانوں میں سے ایک زبان ہو، جو اسلامی مملکت غیر اسلامی ملک سے کرتا ہے، اس حالت میں حجیت کے لحاظ سے عربی زبان کا وہی مقام ہے جو دوسری زبان کو حاصل ہے، جبکہ اضطرار کی حالت میں فریقین کے لئے کسی ایسی تیسری زبان میں معاہدہ تحریر کرنے پر اتفاق کی جو ان دونوں زبانوں سے مختلف ہو اور معاہدہ کی توضیح یا اس کی تعمیل کے سلسلے میں کسی اختلاف کی صورت میں اس کو فیصلہ کن قرار دینے کی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

اسی طرح اسلامی مملکت کے لئے لازم ہے کہ اس کی ہمیشہ یہ خواہش رہے کہ عربی زبان ان سرکاری زبانوں میں سے ایک ہو، جسے کوئی اجتماعی یا مختلف پہلوؤں کے حامل معاہدہ کرنے کے لئے منتخب کیا جائے، جب تک کہ ضرورت اس کے برعکس کا تقاضا نہ کرے۔

جہاں ایک طرف یہ ضروری ہے کہ ہماری یہ دلچسپی ہونی چاہئے کہ معاہدہ عربی زبان میں تحریر کیا جائے، وہیں اس میں بھی دلچسپی ہونی چاہئے کہ معاہدہ میں استعمال ہونے والے الفاظ اپنی بناوٹ کے لحاظ سے بالکل واضح ہوں، اپنے مفہوم سے بالکل مطابقت رکھتے ہوں اور مقصود پر دلالت کرتے ہوں، اس طرح کہ اختلاف کی ادنی گنجائش نہ ہو، اور دوسرے فریق کے لئے معاہدہ کو کمزور کرنے اور مقصود کو چھوڑنے کا موقع نہ دیتے ہوں، دوسرے الفاظ میں معاہدہ لکھنے والے کو چاہئے کہ نہایت محتاط انداز میں معاہدہ تحریر کرے، اس طرح کہ کسی اعتراض کرنے والے کے لئے اعتراض کی ادنی گنجائش نہ ہو، اور اس طرح لکھے کہ فریقین میں سے کسی کے لئے کچھ کہنے کا موقع نہ ہو(۹۱)۔

۹۱- السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج۵، ص۱۷۸۱۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام، مرجع سابق، ص۴۸۵، ویشیر الی أن عدم مراعاة الدقة فی الکتبابة یترتب علیه بخس الحقوق۔

محرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسودہ میں جس طرح معاہدہ تحریر کرتے وقت میں آخری درجہ میں مسودہ کا خیال رکھے تاکہ یہ تحریر دوسرے فریق کی تحریر کے عین مطابق ہو، اس لئے کہ اگر وہ ذرا بھی جملوں کی ترتیب، اچھے الفاظ کے انتخاب میں اور ترکیب کی بلاغت میں انحراف کرے گا تو وہ دوسرے فریق کے کاتب کی تحریر کردہ دستاویز سے مختلف ہوجائے گی، اس وقت وہ لوگ اس تحریر میں درج تمام امور کا انکار کریں گے، اور سمجھیں گے کہ اس میں وہ ساری چیزیں درج ہیں جن پر ہمارا اتفاق ہی نہیں ہوا(۹۲)۔

معاہدہ کا مسودہ تیار کرنے میں درستگی اور وضاحت کے پہلو کی رعایت کے علاوہ یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ احتیاط سے تیار کی گئی دستاویزات سے مطلوبہ فائدہ اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب معاہدہ کرنے والے گروپ اور جماعتوں کی تعداد کے اعتبار سے معاہدہ کے نسخے تیار کئے جائیں اس طرح کہ ان میں سے ہر گروپ کو معاہدہ کی ایک ایک کاپی دے دی جائے، یہاں تک کہ جب دوسرا فریق کسی ایک شق پر اعتراض کرے تو اسے اپنے ہاتھ میں موجود کاپی سے رجوع کرنے کا حق ہو، اور اس کے ذریعہ اپنے مدمقابل کے خلاف دلیل قائم کرنے کا راستہ ہموار ہو(۹۳)۔

حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر معاہدہ کی دو کاپیاں تیار کرنے کا حکم دیا، ایک مسلمانوں کے لئے اور دوسری قریش کے لئے، تاکہ معاہدہ کی شرائط سے متعلق کسی قسم کا اختلاف یا تنازعہ ہو تو اسے دور کیا جاسکے(۹۴)۔

گذشتہ تمام تفصیلات کے علاوہ اسلامی مملکت کے لئے مناسب ہے کہ وہ غیر اسلامی

۹۲- القلقشندی، صبح الاعشی فی صناعۃ الانشأ، مرجع سابق، ج ۱۴، ص ۷۰-۷۱ وأیضا دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۳۹۔

۹۳- السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج ۵، ص ۱۷۸۱۔

۹۴- دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۳۵۔

ممالک کے ساتھ ہونے والے معاہدوں پر گواہ بنائے، کیونکہ گواہ بنانے سے انصاف کا قیام یقینی ہوجاتا ہے، اوراعتماد واحتیاط کا پہلو مستحکم ہوجاتا ہے، معاہدہ پر گواہ بنانے کی شرعی دلیل اللہ تعالی کا یہ قول ہے: ''جب آپس میں معاہدہ کرو تو گواہ بناؤ''، اس طرح حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے حدیبیہ کے معاہدہ پر دو گواہ بنائے، ایک مسلمانوں کی طرف سے اور دوسرا قریش کی طرف سے، تاکہ معاہدہ زیادہ سے زیادہ مستحکم ہو(۹۵)۔

۳- معاہدہ پر دستخط اور اس کی توثیق:

کسی معاہدہ کی توثیق یہ ہے کہ اس کی دفعات کا پابند ہونے کے لئے رضامندی کا اظہار کیا جائے، یہ معاہدہ کا سب سے آخری مرحلہ ہوتا ہے، اسی توثیق کے نتیجہ میں معاہدہ اسلامی مملکت اور دوسرے فریق یا فریقوں کے حق میں نافذ العمل ہوتا ہے۔

فقہ اسلامی میں اس بابت بہت اختلاف ہے کہ اسلامی مملکت کا غیر اسلامی مملکت کے ساتھ جو معاہدہ ہوتا ہے اس کی توثیق کی حیثیت لازمی شرط کی ہے، یا معاہدہ کے فوری طور پر قابل عمل ہونے کے لئے ان افراد کے دستخط کافی ہیں جو اسکے مجاز قرار دیئے گئے ہیں، ایک رجحان یہ ہے کہ شرعی قانون میں معاہدے کی توثیق معاہدے کا ایک اہم ترین عنصر ہے(۹۶)، اور اس رجحان کے حامی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اسلام میں معاہدہ کی توثیق مملکت کے دائرہ اختیار میں داخل نہیں، جیسے معاہدہ پر دستخط مکمل ہوا سکی تصدیق و وثیق بھی مکمل مانی جائے گی جب تک اس سے روکنے کا کوئی دوسرا شرعی جواز نہ ہو، مذکورہ رجحان کے لازم ہونے کی دلیل اللہ تعالی کا یہ قول ہے: ''اے ایمان والو! وہ کیوں کہتے ہو جو تم نہیں کرتے، اللہ تعالی کے یہاں سب سے زیادہ

۹۵- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۱۹۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، اثار الحرب فی الفقۃ الإسلامی، مرجع سابق، ص: ۶۳۹۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۴۸۰-۴۸۱۔

۹۶- دکتور فاضل زکی محمد، الفکر السیاسی العربی الإسلامی بین ماضیۃ وحاضرۃ، بغداد، دار الطبع والنشر الأہلیۃ، الطبعۃ الأولی ۱۳۹۱ھ/ ۱۹۷۰م، ص ۲۱۰-۲۱۱ (مشار الیہ فی دکتور أحمد أبو الوفا، مرجع سابق، ص ۵۰)۔

ناراضگی کی بات یہ ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرو نہیں'' (۹۷)، دستخط قول ہے اور تصدیق عمل ہے، تو عمل کا ہونا یعنی توثیق کا ہونا ضروری ہو جاتا ہے قول (دستخط) کو مؤکد کرنے کے لئے، ورنہ یہ عمل اللہ تعالی کی طرف سے ناراضگی کا سبب بنے گا، الا یہ کہ کوئی شرعی جواز ایسا ہو جو دستخط کے بعد توثیق سے مانع ہو (۹۸)۔

حقیقت میں دستخط ایک ایسا مادی تصرف ہے جو تصدیق و توثیق سے مختلف نہیں ہے، دونوں ہی عمل ہیں، یعنی دونوں کا مقصود معاہدہ کے مزاج یا اس سے متعلق افراد کی طرف سے معاہدہ کی دستاویزات پر دستخط کر کے اسے حتمی شکل دینا ہی ہے، خیر معاملہ کچھ بھی ہو خلاصہ یہ ہے کہ تصدیق اس اعتبار سے کہ وہ دستخط کے بعد کا عمل ہے، اور عام طور پر تصدیق و توثیق کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب معاہدہ کے دستخط پر ایک عرصہ گذر جاتا ہے جو فریقین کی طرف سے اس کا جائزہ لینے اور اسے ہر طرح سے درست کرنے کے لئے کافی ہے، اس لئے وہ ان قانونی اثرات پر مشتمل ہے جو معاہدے کو اس کے تمام فریقوں کے حق میں نافذ العمل بناتے ہیں، یہ تو ایک پہلو ہے، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس معاہدہ کی تصدیق کو واجب قرار دینا جس پر اسلامی مملکت نے دستخط کر دیا ہو دراصل افعال کی اقوال سے مطابقت ہے۔ اس رائے میں اگرچہ یہ قید لگا دی گئی ہے کہ جب تک کوئی ایسا شرعی جواز نہ ہو جو عدم تصدیق کا تقاضا کرتا ہو، اس کی وجہ سے اسلامی مملکت کا حق غصب ہوگا، اس مسئلہ میں اسلامی مملکت کا حال بھی بالعموم دوسرے فریقوں جیسا ہی ہے، کہ معاہدہ کا جائزہ لینے کے لئے مناسب وقت دیا جائے، جس میں وہ معاہدہ کی تمام شرائط کی پڑتال کر سکے، اور اس کی تحقیق کر سکے کہ معاہدہ مقاصد شریعت سے میل کھاتا ہے یا نہیں، اور جس صورت میں معاہدہ ہوا ہے اس سے مسلمانوں کے مصالح کی تکمیل ہوتی ہے یا نہیں، یہاں تک کہ جب معاہدوں کا جائزہ لینے کی مہارت رکھنے والے افراد کے سامنے یہ واضح

۹۷- سورۂ حجرات: ۱۔

۹۸- دکتور محمد طلعت الغنیمی، أحکام المعاہدات فی الشریعۃ الإسلامیۃ، الاسکندریۃ، منشأۃ المعارف، ۱۹۷۵، ص ۷۳؛ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۴۸۹۔

ہوجائے کہ معاہدہ مقاصد شریعت سے ہم آہنگ نہیں ہے یا مسلمانوں کے مصالح کا محافظ نہیں ہے، تو پھران پر لازم کہ معاہدہ کی تصدیق کر کے مستحکم نہ کریں، تا کہ اسلامی مملکت پر اس سلسلے کی کوئی ذمہ داری عائد نہ ہو، اسے قول وفعل کا تضاد نہ قرار دیا جائے جس سے شریعت نے روکا ہے، کیونکہ اس طرز عمل کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بنوغطفان کے ساتھ کئے معاہدہ سے رجوع فرمایا تھا، جبکہ آپ ﷺ نے اس کے تمام احکام وشرائط پر اتفاق فرمالیا تھا، اور ایسا اس وقت کیا جب آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا اور اس سلسلے میں اس نتیجہ تک پہنچ گئے کہ وہ شرائط جن پر اتفاق ہوا ہے ان سے مسلمانوں کی توہین ہوتی ہے جنہیں اللہ تعالی نے عزت وسربلندی عطا کی ہے اور جنہیں ہدایت سے سرفراز فرمایا ہے، وہ معاہدہ جس پر اسلامی ریاست کی طرف سے دستخط کی جا چکی ہے اس کی تصدیق وتوثیق ضروری ہے، اسے شرط سمجھا جائے یا پھر اس سے استثناء کو جائز قرار دیا جائے جبکہ استثناء کا جواز موجود ہو جو عدم تصدیق کا تقاضا کر رہا ہو، ایسے استثناء کا نتیجہ خاص طور پر اگر اس بات کو مدنظر رکھا جائے کہ اس میں واضح اور متعین شرعی جواز کے علاوہ سربراہ مملکت کے خیال کے مطابق شرعی پالیسی کے تقاضوں کو بھی شامل کرلیا جائے، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بین الاقوامی معاہدے کے قانون کے دائرہ کار میں توثیق اور دستخط کے درمیان کا تعلق اپنی اس حقیقی نوعیت کی طرف لوٹ آئے گا کہ دستخط ایک عام اصول کے طور پر دستخط کنندہ کو پابند نہیں کرتا، اور یہ معاہدہ کرنے والے فریقین اس وقت تک اس کے پابند نہیں ہوں گے جب تک کہ معاہدہ کی توثیق مکمل نہ ہوجائے، اسی طرح توثیق سے پرہیز کرنے والے فریق کو کسی طرح کی خلاف ورزی کا مرتکب قرار نہیں دیا جائے گا، یہ ساری چیزیں فطری طور پر محض معاہدہ پر دستخط کی وجہ سے اسلامی مملکت کے مدمقابل معاہدہ کو مؤثر نافذ العمل اور ضروری قرار دینے کے منافی نہیں ہیں، خاص طور سے اس وقت جب اس سلسلے کی اتھارٹی کی طرف سے دستخط کر دیا ہو، کیونکہ اسلامی ریاست میں خارجہ امور سے متعلق اتھارٹی کے درمیان تقسیم کار ہوتی ہے جو جس اتھارٹی سے متعلق دستخط ہے

اگراس نے دستخط کر دیا تو وہ ہر حال میں نافذ العمل ہوگا(۹۹)۔

دوسرے رجحان کا تعلق اس سے ہے کہ اسلامی شریعت میں معاہدہ کی توثیق کب ضروری ہوگی؟ تو معاہدہ محض اتفاق کر لینے کی وجہ سے شرعاً قابل نفاذ سمجھا جائے گا، اگرچہ اس کی توثیق اس اتھارٹی کی طرف سے نہ کی گئی ہو جسے حکومت کی طرف سے معاہدہ کرنے کا اختیار حاصل ہے، اور نہ ہی اسے تحریری شکل میں منتقل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ معاہدہ کرنے والوں کے توسط سے اس پر دستخط کی ضرورت ہے(۱۰۰)، اس رجحان کا قابل غور پہلو یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے معاہدہ کی پابندی لازم ہونے کی صورت میں بھی اس پابندی کو ثابت کرنے کے لئے معاہدہ کا لکھنا شرط نہیں ہے، اور وہ بھی ایسے وقت میں جب کہ مسائل پیچیدہ ہیں اور وہ مسائل جن کے لئے بین الاقوامی معاہدے کئے جاتے ہیں اس قدر پیچیدہ ہو گئے ہیں کہ ان کے لئے معاہدہ کو لکھنا نہ صرف یہ کہ وہ مؤثر ہے بلکہ معاہدہ کی درستگی کے لئے شرط لازم قرار دیا جاتا ہے، اور خاص طور پر جبکہ معاہدہ کی مدت طویل یا غیر متعین ہو(۱۰۱)۔

گذشتہ دونوں رجحانوں میں تیسرا رجحان اعتدال پر مبنی ہے جس میں یہ بات کہی گئی ہے کہ معاہدے کے نفاذ کے لئے معاہدہ کی توثیق ضروری ہے جبکہ اس پر خلیفہ یا سربراہ مملکت کا دستخط نہ ہوا ہو یا پھر وہ معاہدہ مسلمانوں کے کسی اہم مسئلہ سے مربوط ہو(۱۰۲)، سوائے اس صورت

۹۹- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۲۳ وراجع أیضا ماسبق، ص ۳۴-۳۶۔

۱۰۰- دکتور وہبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقۃ الإسلامی، مرجع سابق، ص ۶۳۹۔

۱۰۱- ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج ۱، ص ۶۳۹۔

۱۰۲- اس کی مثال وہ بات ہے جسے القلقشندی نے معاہدہ طے کرنے (ابرامِ معاہدہ) کے اختیار سے متعلق بیان کیا ہے، کہ: اس معاملے میں (یعنی معاہدہ کس کے ذریعے طے کیا جائے) مختلف حالات کے مطابق اختلاف ہوتا ہے، جو اس بات پر منحصر ہے کہ معاہدہ کس چیز پر کیا جا رہا ہے (یعنی معاہدے کا محل وموضوع کیا ہے)۔ پس اگر معاہدہ کسی بڑی سلطنت یا اہم علاقے جیسے ہند، روم یا اس جیسے دیگر ممالک کے ساتھ ہو، یا عام طور پر جنگ بندی (مہادنۃ مطلقاً) کا معاہدہ ہو، تو ایسا معاہدہ صرف امامِ اعظم (خلیفہ یا سربراہِ اعلیٰ) یا اُس کے نائبِ عام (یعنی وہ نمائندہ جسے سلطنت کے تمام امور میں مکمل اختیارات حاصل ہوں) ہی کے ذریعے درست طور پر طے پا سکتا ہے۔ لیکن اگر معاہدہ کسی مخصوص بستی،

کے جب معاہدے پر دستخط کرنے والے نمائندے کوسونپے گئے اجازت نامے میں واضح طور پر کہا گیا ہو کہ اس کو مملکت کی داخلی اتھارٹی کی طرف سے منظوری دیئے بغیر نافذ نہیں کیا جائے گا(۱۰۳)۔

حقیقت یہ ہے کہ معاہدہ کی توثیق کے اس مزاج کے پیش نظر کہ وہ دراصل ایک ذریعہ ہے جس کے توسط سے حکومت اس امر پر رضامندی ظاہر کرتی ہے کہ وہ معاہدہ کا پاس ولحاظ رکھے گی ، نیز اسلامی اصولوں اور خلافت راشدہ کے دور میں مسلمانوں سے متعلق تمام اہم امور کے بارے میں شوری کے وجوب کو سامنے رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ معاہدہ کی تصدیق معاہدہ کی تکمیل کے لئے اور اسلامی مملکت کے حق میں اس کے احکام کے نفاذ کے لئے لازمی شرط قرار دی جانی چاہئے، اس سلسلے میں تصدیق کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاہدوں کو انجام دینے کے لئے مجاز اتھارٹی کے ذریعہ معاہدے کی منظوری دی جائے، اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ تصدیق اور معاہدہ کے حوالہ سے دستخط ایک دوسرے سے خلط ملط نہ ہوجائیں، اس کا امکان اس صورت میں ہوتا ہے جب خود متعلقہ اتھارٹی مثلاً سربراہ مملکت معاہد سے اتفاق کرتے ہوئے اس پر دستخط کردے، تو اس صورت میں دستخط اور تصدیق دونوں ایک ہی عمل شمار کئے جائیں گے، جس کا مطلوبہ فائدہ حاصل ہوجائے گا، وہ یہ کہ اسلامی مملکت کی طرف سے معاہدہ نافذ سمجھا جائے گا۔ کبھی کبھی معاہدہ پر دستخط تصدیق سے ہٹ کر شمار کیا جاتا ہے، ایسا بالعموم اس وقت ہوتا ہے جب معاہدہ کرنے کی اتھارٹی کی طرف سے وہ مندوب حضرات جنہیں معاہدہ پر دستخط کی ذمہ داری دی گئی ہو، وہ اگر معاہدہ پر دستخط کردیں، تو وہ معاہدہ اسی وقت نافذ العمل ہوگا جب اس کی مجاز اتھارٹی کی طرف سے تصدیق کردی جائے، اسی طرح اس صورت میں جب تصدیق کا دائرہ اختیار اندرون مملکت دوحلقوں میں تقسیم ہو، جیسے کہ سربراہ مملکت اور پارلیمنٹ تو معاہدہ کے نافذ العمل ہونے کے لئے

گاؤں یا سرحدی علاقے کے متعلق ہو، تو اس صورت میں وہاں کے قریبی والی (گورنر یا حکام) کو اُن کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کا اختیار حاصل ہوسکتا ہے۔ القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج ۱۴، ۷۔

۱۰۳- دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۵۱۔

ایک ساتھ دونوں حلقوں کی تصدیق ضروری ہوجاتی ہے خواہ سربراہ مملکت نے ازخود معاہدہ سے اتفاق کرتے ہوئے دستخط کردیا ہو، اگر ایک طرف مذکورہ تفصیلات شریعت میں معاہدوں کے نفاذ سے متعلق عمومی اصول کی نمائندگی کرتے ہیں تو دوسری طرف استثنائی حالات میں ایسے معاہدہ کرنے کی ممانعت بھی نہیں (۱۰۴)، جو محض دستخط ہی سے نافذ العمل ہوجائیں کہ فریقین اس پر متفق ہوں گے، ایسا عام طور پر تکنیکی نوعیت کے معاملات سے متعلق کئے معاہدوں میں ہوتا ہے، جیسا کہ بعض نے بجا طور پر اس کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے ایسے معاملات میں جو معمول کی زندگی سے متعلق ہوتے ہیں (۱۰۵)۔

تیسرا مطلب

معاہدوں کی درستگی کی معروضی شرائط

اسلامی شریعت کی دفعات کے مطابق معاہدوں کی درستگی کے لئے لازمی معروضی شرائط میں معاہدوں کو انجام دینے کی صلاحیت کا ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس کی دفعات کی پابندی پر پوری طرح رضامندی اور کسی بھی طرح کے نقص جیسے کہ غلطی، دھوکا دہی اور جبر سے اس کا پاک ہونا ضروری ہے، ساتھ ہی معاہدہ کی مدت کی تعیین کے علاوہ معاہدہ کی دفعات کا اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے ہم آہنگ ہونا بھی ضروری ہے۔

۱۰۴- دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۵۱۔

۱۰۵- شاطبی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ: جو امور لوگوں کے درمیان جاری عمومی عادات میں سے ہوں، جیسے روزگار کمانے کے طریقے یا دیگر دنیاوی کوششیں، تو ان میں نیابت (کسی کی طرف سے عمل کرنا) درست ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنے سوا کسی دوسرے کی طرف سے ان امور کو انجام دے سکتا ہے، اور اُس کی طرف سے نمائندگی (نیابت) کرسکتا ہے ان کاموں میں جو اس شخص کے ساتھ خاص نہیں۔ چنانچہ کسی دوسرے کی طرف سے مفاد حاصل کرنے یا نقصان سے بچانے کے لیے، مدد، وکالت یا اسی جیسے دیگر طریقوں سے نیابت جائز ہے، کیونکہ یہ سب ایک ہی مفہوم کے تحت آتے ہیں۔ الشاطبی، الموافقات فی أصول الأحکام، (تعلیق) حسنین محمد مخلوف، دمشق، دار الکفر، ۱۹۸۰م، ج ۲، ص ۲۲۷۔

۱-معاہدہ کرنے کی اہلیت:

جیسا کہ سبھی جانتے ہیں کہ اہلیت سے مراد شرعاً وہ صلاحیت ولیاقت ہے جس کی وجہ سے انسان کے لئے ذمہ داریوں کا اٹھانا، حقوق کا حصول اور ان تصرفات کو انجام دینا ممکن ہوتا ہے جن کے احکام کا شریعت اپنے مخاطب کو پابند بناتی ہے، یہ صلاحیت کسی بھی ایسے معاہدہ کی درستگی کے لئے لازمی شرط کی حیثیت رکھتی ہے جسے اسلامی مملکت کسی بھی حکومت یا جماعت کے ساتھ انجام دینا چاہتی ہے، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اہلیت اسلامی مملکت کو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس کے پاس ان نمائندوں عناصر کا ایک گروپ ہوتا ہے جو امت مسلمہ کی صورت میں زمین میں دائمی طور پر رہائش پذیر ان عوام کی ترجمانی کرتا ہے جو سب کے سب کسی ایسی اتھارٹی یا حکمراں کے تابع ہوجاتے ہیں جو شرعی احکام کے مطابق ان کے لئے پالیسی بناتا ہے اور ان کے معاملات وامور کی تنظیم کرتا ہے، اور جب ان عناصر کی اہلیت اسلامی مملکت میں ثابت ہوجاتی ہے تو وہ اس بات کے مجاز قرار پاتے ہیں کہ وہ ان حکومتوں اور گروہوں سے جو اسلام کے پیروکار نہیں ہیں سرکاری تعلقات استوار کریں، اس میں دوسری چیزوں کے علاوہ دوسروں کے ساتھ معاہدہ کرنا بھی شامل ہے، اسلامی مملکت کے لئے دوسرے ممالک اور گروہ کے ساتھ جو اسلام کے پیروکار نہ ہوں حکومتی تعلقات میں شامل ہونے اور معاہدہ کرنے کی اہلیت کا جواز اس کے اندر مذکورہ شرائط کا پایا جانا ہے، اسی کے نتیجہ میں زمین پر بااختیار ہوتی ہے اور اسی کی وجہ سے اسے اتنی طاقت وقوت حاصل ہوتی ہے کہ دوسروں پر ان کا احترام اور اس کے وجود کا اعتراف کرنا واجب ہوتا ہے، اب اگر اس طرح وجود میں آنے والی اسلامی مملکت کی ضرورت ہو کہ وہ کسی قسم کی بین الاقوامی گروہ یا تنظیم میں شامل ہو غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں کے ساتھ، اور اسے معاصر بین الاقوامی تعلقات میں رائج ''بین الاقوامی قانون'' کے نام سے قائم نظام کا حصہ بننا پڑے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے دوسرے ممالک کے ساتھ معاہدے کے نتیجے میں وجود میں آنے والا بین الاقوامی قانونی نظام ہی بنیادی طور پر بین الاقوامی حیثیت کے حصول

کے لئے ضروری شرائط کی تعیین کا، اوران افراد یا اکائیوں کی تعیین کا ذریعہ ہے جن میں حصول کی یہ ساری شرائط پائی جاتی ہوں، اس سلسلے میں اسلامی شریعت کی طرف سے جو ذمہ داریاں اسلامی مملکت پر عائد ہوتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اسلامی مملکت کی یہ کوشش ہونی چاہئے کہ یہ بنیادیں اور وہ شرائط احکام شریعت کے تقاضوں سے نہ ٹکرائیں۔ چاہے معاملہ جیسا بھی ہو، اسلامی مملکت کی حقیقت اس سے آگے کچھ نہیں کہ وہ ایک معنوی فرد ہے جو عقل وارادہ سے محروم ہے، بلکہ اس کے ارادہ وعزم کی ترجمانی داخلی وخارجی دونوں سطح پر ذمہ دار سرکاری افراد و وسائل کے ذریعہ ہوتی ہے، اس حقیقت کا مطلب یہ ہے کہ معاہدے کو انجام دینے میں اہلیت کی شرط کا پایا جانا گویا ایسا مسئلہ ہے، جس کا تعلق اس آدمی میں پائی جانے والی قابلیت اور اہلیت سے ہے جسے اسلامی مملکت کے خارجہ امور کی ذمہ داری سپرد کی جائے گی۔ اس سلسلے میں حاکم یا جسے عرف عام میں خلیفہ یا امیر یا امام یا مملکت کا سربراہ کہا جاتا ہے وہی اسلامی مملکت میں معاہدوں کو انجام دینے کی اتھارٹی سے متعلق پہلا ذمہ دار ہوتا ہے، اور عام اصول یہ ہے کہ اسلامی مملکت میں مملکت کا سربراہ ہی دراصل مملکت کی نمائندگی اور بیرونی دنیا میں اس کے عزم وارادے کے اظہار کا فریضہ انجام دیتا ہے، جس میں غیر اسلامی جماعتوں اور حکومتوں سے معاہدہ کرنا شامل ہے، دلیل اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کا غیر مسلموں کے ساتھ کئے جانے والے معاہدوں سے متعلق طرز عمل ہے، جیسا کہ آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر قریش کے ساتھ معاہدہ کیا، اسی طرح آپ ﷺ نے یہودی قبائل اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ معاہدہ کیا، یہی حال ان معاہدوں کا بھی ہے جو حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ نے غیر اسلامی ممالک، اداروں اور قبائل کے ساتھ کئے (۱۰۶)، خلاصہ یہ کہ صلاحیت واہلیت کا حامل ہونا بطور شرط ضروری ہے، یا اگر آپ دوسرے الفاظ میں کہنا چاہیں تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ قانونی اختیار کا حامل ہونا اس شخص کے لئے ضروری ہے

۱۰۶- پچھلا صفحہ نمبر ۹ سے مراجعت کریں، اور اسی طرح اس میں بھی دیکھیں: محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق، ص ۴۴۰ وما بعدہا، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۱۹-۲۲۔

جوکسی غیر اسلامی مملکت کے ساتھ اسلامی مملکت کی طرف سے معاہدہ کرنے پر مامور کیا جائے۔

مگر چونکہ سربراہ مملکت کے لئے حقیقۃ اور عملا دشوار ہے کہ وہ تنہا اسلامی مملکت کے تمام خارجی امور کو انجام دے، تو منطقی اور فطری طور پر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مملکت کے سربراہ کو صرف ان معاملات سے متعلق معاہدوں کو انجام دینے کا مکمل طور پر مجاز کیا جائے جو اسلامی مملکت کے دیگر ممالک اور دیگر گروہوں کے ساتھ تعلقات کے لئے انتہائی اہم اور ضروری ہوں، جیسا کہ اس صورت میں جب کوئی معاہدہ کسی خطہ کی تقدیر یا غیر مسلموں کے ساتھ جنگ بندی سے متعلق ہو(۱۰۷)، اور ان معاملات سے ہٹ کر جو معاملات ہوں ان میں معاہدہ کرنے کی ذمہ داری دوسرے افراد جیسے وزیر اعظم، وزیر خارجہ یا کسی اور وزیر کو اس سے متعلق امور میں یا چیف آف آرمی کو یہاں تک کہ اسلامی مملکت کے سیاسی نمائندے یعنی نمائندہ کو دی جائے جو اس ملک میں تعینات ہو جس سے معاہدہ کرنے کی ضرورت ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ معاہدوں کو انجام دینے میں سربراہ مملکت کے ساتھ ان عہدیداروں کی شرکت کی سند اختیارات تفویض کرنے یا اس طرح کے امور کو انجام دینے میں خود سربراہ مملکت کی شرکت کے نظریہ سے ملتی ہے، یہ قرآن کریم کی اس آیت کے مطابق ہے: "**واجعل لی وزیرا من أهلی، هارون أخی أشددبه أزری وأشرکه فی أمری**" یعنی ایسے عہدیداروں کا ہونا ضروری ہے جو سربراہ کا مملکت کا ساتھ دے سکیں، حکومتی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں (۱۰۸)، اسی طرح اختیارات کی تفویض کے نظریہ کی بھی دلیل حدیث سے ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ کو بنو قریظہ کے مسئلہ میں حکم بنانے سے قبل فرمایا: "**علیکم العهد والمیثاق**" (تم عہد و پیمان کا پاس ولحاظ

۱۰۷- القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج ۱۴، ص ۱۳ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۰۸- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، (طبعۃ الشعب) ج ۵ ص ۲۷۷۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، مرجع، (الطبعۃ الثانیۃ)، ج ۱۱، ص ۱۹۱ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۴۷۳۔

رکھنا)، اوران کے بارے میں جوتم نے فیصلہ کیا ہے وہی صحیح فیصلہ ہے، آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ کی بنوقریظہ کے جنگجوافراد کے قتل کردیئے جانے اور بچوں کوقیدی بنانے کے سلسلے میں جو فیصلہ کیا اس کی تصدیق فرمادی، اس کا اظہار آپ ﷺ کے اس تبصرہ میں بھی ہوا، جو آپ ﷺ نے حضرت سعد بن معاذؓ کے فیصلہ سے متعلق فرمایا: ''تم نے سات آسمانوں کے اوپر سے دیئے گئے اللہ تعالی کے حکم کے مطابق فیصلہ کیا'' (۱۰۹)، اسی طرح آپ ﷺ نے اس فیصلہ کے تقاضوں کو نافذ کرنے کا حکم دیا، وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے ان لوگوں کو ایک خاتون جنہیں بنت حارث کے لقب سے پکارا جاتا تھا کے گھر میں قید کرنے کا حکم دیا، یہاں تک کہ ان کی گردن ماردی گئی، اسی طرح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ اسلامی فوجوں کے کمانڈروں کو دی جانے والی اپنی ہدایات میں یہ شق شامل فرماتے تھے کہ وہ محصور دیہات کے لوگوں کو خدا کے فیصلے کا تابع نہ بنائیں، بلکہ وہ انہیں اپنے فیصلے کا تابع بنائیں، کیونکہ انہیں نہیں معلوم کہ خدا کے فیصلے تک ان کی رسائی ہوئی یا نہیں (۱۱۰)۔

ساتھ ہی حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ ایک دن اپنے اس عمرہ کی ادائیگی کے بعد جس سے آپ ﷺ کو حدیبیہ کے موقع سے روک دیا گیا تھا، صحابہ کرام کے درمیان تشریف لائے، اور فرمایا: اے لوگو! اللہ تعالی نے مجھے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور پوری انسانیت کے لئے رحمت بنایا ہے، لہذا اختلاف نہ کرو، جس طرح حواریوں نے عیسی بن مریم کے سلسلے میں اختلاف کیا تھا، توصحابہ کرامؓ نے سوال کیا اے اللہ کے رسول ﷺ حواریوں نے کس طرح اختلاف کیا؟ آپ ﷺ نے فرمایا: انہوں نے انہیں وہ دعوت دی جو میں نے تمہیں دی، جسے وہ

۱۰۹- الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۲۱۔ ابن حجر العسقلانی، فتح الباری، بشرح صحیح البخاری، مرجع سابق، ج ۴، ص ۸۱۔ أبو یوسف، الخراج سابق، ص ۲۰۱۔ اور اسی طرح دیکھیں: أبوالسعود، تفسیر أبوالسعود، مرجع سابق، ج ۴، ص ۳۱۷۔

۱۱۰- الکمال بن الہمام، شرح فتح القدیر، القاہرۃ، مطبعۃ البابی الحلبی، ۱۳۸۹ھ/ ۱۹۷۰ء، ج ۷، ص ۳۱۵۔

قریب کے مشن پر بھیجتے تو وہ خوش اور مطمئن ہوجاتا، اور جسے دور کے مشن پر بھیجتے وہ اسے ناپسند کرتا، اور مشن کے معاملہ میں سست پڑ جاتا، چنانچہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اللہ تعالی سے اس کی شکایت کی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ جو سست ہو چکے تھے، ان میں سے ہر فرد اس قوم کی زبان بولنے لگا جس کی طرف اسے بھیجا جاتا (۱۱۱)۔

گذشتہ تفصیلات کا تقاضا یہ ہے کہ حکومت کے سربراہ کے لئے جائز ہے کہ وہ کسی اور کو اپنا نائب بنائے، یا اسے اپنے دائرہ اختیار سے متعلق امور کو انجام دینے اور مفوضہ کاموں کو زمین پر اتارنے کی ذمہ داری سپرد کرے، اس میں بلاشبہ اسلامی مملکت کے نام سے معاہدہ کرنا بھی شامل ہوگا، اور جسے ذمہ داری دی جائے یا نیابت کا فریضہ جس سے متعلق کیا جائے اس کے لئے مناسب ہے کہ وہ خوش دلی سے اس ذمہ داری کو قبول کرے، اور بغیر کسی حجت اور ٹال مٹول کے اس کے تقاضوں پر عمل کرے (۱۱۲)۔

فقہ اسلامی میں اس بات پر اجماع ہے کہ نائب بنانا ہر حال میں ضروری ہے اور اس سے بچنا بھی ممکن نہیں، کیونکہ سربراہ مملکت کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ تمام معاملات کو نپٹانے پر قادر ہو، اور نہ وہ تنہا تمام منصوبوں پر غور وخوض اور ان کا احاطہ کرسکتا ہے، اس لئے یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا معقول ضروریات میں شامل ہونا واضح ہے، اس میں کوئی بھی دانا و بینا شخص شک نہیں کرسکتا (۱۱۳)، مگر نائب یا جسے ذمہ داری دی گئی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس طرح کے

۱۱۱- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ص ۲۵۴۔ الطبری، تاریخ الطبری (تاریخ الأمم والملوک)، القاہرۃ، دار المعارف، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۷۶م، ج ۲، ص ۶۴۵۔ أحمد محمد أحمد، الجانب السیاسی فی حیاۃ الرسول ﷺ الکویت، دار العلوم، ط (۱) ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۱۔

۱۱۲- المرجع السابق، ص ۶۰۷، وأنظر کذلک: دکتور أحمد ابو الوفا محمد مرجع سابق، ص ۵۶، ۵۷۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۴۷۴-۴۷۵، ۴۸۱-۴۸۲۔

۱۱۳- عبد اللہ الجوینی، غیاث الأمم فی اجتیار الظلم (تحقیق)، دکتور محمد خلیل الطویل، رسالۃ دکتوراہ، کلیۃ الشریعۃ والقانون، جامعۃ الأزہر، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۵ء، ص ۶۸-۶۹ (مشار الیہ فی دکتور أحمد ابو الوفا، مرجع سابق، ص ۵۸) اور اسی

حالات میں نیابت کے حدود میں رہے، اور جو ذمہ داری دی گئی ہے اس کے تقاضوں کو بروئے کار لانا ضروری سمجھے، ایسا اس لئے تاکہ وہ معاہدہ جو اس نے کیا ہے اسلامی مملکت کے حق میں نافذ العمل ہو سکے بہ صورت دیگر فریق دوم معاہدہ کی توثیق سے انکار کر سکتا ہے، یا اسے درست ہونے اور اس کے حق میں نافذ العمل ہونے کو مسترد کر سکتا ہے، اس سلسلے میں بعض کی یہ رائے ہے کہ جو آدمی ان امور میں سے کسی میں (یعنی جن امور سلطنت میں اسے نمائندگی کی ذمہ داری دی گئی ہے) ان میں منصفانہ کردار ادا کرے، چنانچہ علم کی روشنی میں حکومتی فرض ادا کرے اور انصاف پر عمل پیرار ہے اور حتی الامکان اللہ اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتا رہے تو اسے نیک لوگوں میں شمار کیا جائے گا اور جو ظلم کرے، اور جہالت کے ساتھ حکومتی ذمہ داری انجام دے تو اسے ظالم و بدکار سمجھا جائے گا (۱۱۴)۔

اس جگہ اسلامی شریعت میں معاہدہ کرنے کی اہلیت سے متعلق گفتگو کے ذیل میں یہ اشارہ کر دینا مناسب ہے کہ ایک رائے کے مطابق شریعت کے عمومی احکام کے دائرہ میں معاہدہ کرنے سے وہ معاہدہ کسی عام فرد کے لئے منعقد ہو سکتا ہے جیسا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کوئی مسلمان غیر اسلامی حکومت کے افاد کے ساتھ یا اس کے محصورین کے ساتھ جن کی تعداد دس یا اس سے کم ہو، امان سے متعلق کوئی معاہدہ کرتا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ جسے امن دیا گیا ہو اس سے قتل وقتال کا حکم اٹھا لیا جائے (۱۱۵)، اور صورتحال اس وقت کی ہے جب وہ حکومت جس کے زیر سایہ وہ لوگ زندگی گزار رہے ہوں، اسلامی حکومت سے جنگ کر رہی ہو۔

اس رائے کے قائل حضرات اپنے مسلک کو ثابت کرنے کے لئے اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**المسلمون تتكافأدماؤهم، و**

طرح دیکھیں: الشاطبی، الموافقات، مرجع سابق، ج ۲، ص ۲۲۷۔

۱۱۴- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، مرجع سابق، ج ۲۸، ص ۶۸-۶۹۔

۱۱۵- محمد الشربینی الخطیب، مغنی المحتاج، القاہرۃ، البابی الحلبی ۱۳۵۲ھ، ۴/۲۳۶۔

هم يد على من سواهم، ويسعى بذمتهم أدناهم"(مسلمانوں کا خون آپس میں حرمت کے لحاظ سے برابر ہے، اور مسلمان دشمنوں کے خلاف ایک دوسرے کے معاون ہیں، ان میں ادنی کا آدمی بھی کسی غیر مسلم کو امان دے سکتا ہے، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:"**ذمة المسلمين واحدة، يسعى بها أدناهم، فمن أخفر مسلما، فعليه لعنة الله والملائكة والناس أجمعين لا يقبل الله منهم يوم القيامة صرفا ولا عدلا**" (۱۱۶) (مسلمانوں کا معاہدہ امن ایک ہے، ان میں کا ایک ادنی آدمی بھی کسی کو امن دے سکتا ہے، جو کوئی کسی مسلمان کے ساتھ عہد شکنی کرے گا اس پر اللہ فرشتے اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی اللہ ایسے شخص کا کوئی فرض ونفل عمل قبول نہیں فرمائے گا)۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ کے رسول ﷺ نے امن ومان کے اس معاہدہ کو باقی رکھا جو حضرت ام ہانیؓ نے ایک حربی سے کیا تھا، وہ اس طرح کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے ام ہانیؓ تم نے جس معاہدہ امن وامان کو جاری کیا اسے ہم نے بھی تسلیم کرلیا(۱۱۷)۔

مگر فرد کی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک فرد تنہا کسی اسلامی حکومت کی بیرون ملک نمائندگی کا اختیار نہیں رکھتا، جبکہ اسلامی حکومت کو قانونی طور پر اپنے شہریوں کے معاملات پر براہ راست عمومی اختیار حاصل رہتا ہے، اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے شہریوں کی طرف سے غیر مسلموں کے ساتھ کئے جانے والے امن وامان سے متعلق معاہدے کی نگرانی کرے، اس میں اس کا یہ اختیار بھی شامل ہے کہ وہ امن وامان کے کسی ایسے معاہدے کو بھی مسترد کردے جو اس کے عمومی مصالح سے ٹکرائے، ہماری رائے کے مطابق ان تمام تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ امان کے معاہدے اپنی حقیقت کے اعتبار سے ان معاہدوں یا کاروائیوں سے مختلف نہیں ہیں جو موجودہ دور میں بین الاقوامی قانون کے طور پر جانے جاتے

۱۱۶-۱۱۷- الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۳،ص ۲۸، ج ۸،ص ۲۸-۲۷۔

ہیں، انہیں بیرون ملک اسلامی حکومت کے سرکاری تعلقات کے زمرے میں شمار نہیں کیا جاتا ہے(۱۱۸)۔

۲-فریقین کی مکمل رضامندی:

اسلامی شریعت کے عمومی احکام اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ معاہدہ پر آمادہ فریقین کی طرف سے معاہدہ پر مکمل اطمینان اور رضامندی کا اظہار معاہدہ کے انعقاد کے لئے اور فریقین کے حق میں نتیجہ خیز اور درست ثابت ہونے کے لئے شرط لازم ہے، اس حقیقت کی طرف اللہ تعالی کے اس قول سے اشارہ ہوتا ہے''اگر وہ لوگ مصالحت کے لئے آمادہ ہوجائیں تو آپ بھی آمادہ ہوجائیں اور اللہ تعالی پر بھروسہ کرتے رہیں۔اللہ تعالی بھروسہ کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''۔

یعنی مصالحت کے لئے آمادگی گویا غیر مسلم فریق کی طرف سے اس بات کا اظہار ہے کہ اسے معاہدہ سے دلچسپی ہے اور اس پر مکمل اطمینان ہے، اور اس آمادگی کے مقابل اسلامی حکومت کی طرف سے بھی آمادگی یعنی طرفین کی طرف سے مکمل اطمینان کا اظہار جنگ وجدال کے خاتمہ کی صورت اور مصالحت ومفاہمت سے مکمل اتفاق کی صورت میں معاہدہ کے صحیح اور نتیجہ خیز ہونے کے لئے شرط لازمی کی حیثیت رکھتا ہے(۱۱۹)۔

معاہدہ سے مربوط مسئلہ میں اظہار اطمینان کا تقاضہ یہ ہے کہ اسلامی حکومت کو جن امور پر معاہدہ ہوا ہے، ان سے مکمل واقفیت ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ معاہدہ کے نتیجہ میں عائد ہونے والی ذمہ داریاں پوری طرح واضح ہوں اور بالکل متعین ہوں، تاکہ اسلامی مملکت کی رضامندی ان معاملات سے غیر متعلق رہے جو اس کے مصالح کو پورا نہ کرتے ہوں یا اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ٹکراتے ہوں، اس کی وضاحت اس حکم سے ہوتی ہے جو حضرت عمر بن خطابؓ نے مصر کے والی حضرت عمرو بن العاصؓ کو دیا تھا کہ اس درخواست کی جانچ

۱۱۸- أنظر فی ہذا المعنی: دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص، ۷۲ ۳۔

۱۱۹- الشوکانی، نیل الأوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۱۷، راجع ماسبق، ص ۹-۱۱۔

پڑتال کر لی جائے جو مصر کے قبطی رہنما مقوقس نے پیش کی تھی، جس کی خاص بات یہ تھی کہ مسلمان مقطم کے دامن میں واقع اراضی کو ستر ہزار دینار کے عوض بیچ دیں، باوجود یکہ وہ ایسا علاقہ ہے جس میں نہ کاشت کی جاتی ہے اور نہ وہاں سے پانی نکالا جا سکتا ہے، اور نہ اس سے کوئی دوسرا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے(۱۲۰)، اس جانچ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقوقس نے مذکورہ پٹی کو خریدنے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا یہ کہہ کر کہ اس سرزمین میں جنت کے پودے ہیں، حضرت عمرؓ نے اسے مسترد فرما دیا، اور یہ حکم صادر فرمایا کہ اس جگہ کو قبرستان بناؤ تا کہ مسلمانوں کو اس میں دفن کیا جا سکے(۱۲۱)۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ معاہد سے مربوط امور میں رضامندی کا اعتبار زبانی یا تحریری دونوں طرح سے کیا جاتا ہے، بشرطیکہ معاہدہ مستند طور پر کسی ایسے شخص کے ذریعہ کیا جائے جو معاہدہ کی پابندی سے متعلق اسلامی حکومت کی رضامندی کی نمائندگی کرنے کا اہل یا مجاز ہو، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا(۱۲۲)، اس سلسلے میں بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ لوگ قول و فعل میں اپنے اپنے رسم و رواج کے مطابق الگ الگ طریقوں سے اپنی رضامندی اور پسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں(۱۲۳)۔

معاہدہ کے سلسلے میں رضامندی کی شرط پر یہ مبنی ہے کہ اگر ایسا ہو جائے کہ اسلامی حکومت رضامندی کے عیوب جیسے دھوکہ دہی غلطی اور جبر سے متاثر ہو جائے تو اس سب کی بنیاد پر معاہدہ باطل قرار دیا جائے گا، جیسا کہ ہر حالت کا معاملہ ایک دوسرے سے علاحدہ ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے ذریعہ کیا جانے والا کوئی ایسا معاہدہ جس میں جبر، دھوکہ

۱۲۰-۱۲۱- ابن تغر بردی، النجوم الزاہرۃ فی معرفۃ ملوک مصر والقاہرۃ، القاہرۃ، وزارۃ الثقافۃ والارشاد القومی، ج۱، ص۳۶ (مشار الیہ فی: دکتور أحمد ابو الوفا، مرجع سابق، ص۶۸)۔

۱۲۲- مرجع سابق، ص۱۴۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۲۳- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، مرجع سابق، ج۲۹، ص۱۵۵۔ اور اسی طرح دیکھیں: ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق، ج۱، ص۳۰۷-۴۱۰۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص۴۹۲۔

دہی یا غلط بیانی ہو یا معاہدہ طے کرنے میں اس کے نمائندہ کے اعتماد کو مجروح کیا گیا ہو تو اس سے معاہدہ کی پابندی سے متعلق رضامندی کا پہلو متاثر ہوتا ہے، نتیجتاً اسلامی حکومت اس کی پابند نہیں رہ جاتی ہے(۱۲۴)۔

۳- معاہدہ کے مندرجات کا قانونی جواز:

اسلامی حکومت کا عمومی نظام چند ایسے احکام وقواعد کے مجموعہ پر مبنی ہے، جن کے تقاضوں سے انحراف کسی بھی ایسے بین الاقوامی معاہدہ میں درست نہیں، جو اسلامی ریاست ضرورتاً کسی غیر اسلامی مملکت کے ساتھ کرنے جارہی ہو، ان تقاضوں کو بین الاقوامی طور پر کئے جانے والے معاہدوں میں قانونی جواز کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، اس کا لب لباب یہ ہے کہ معاہدہ کا موضوع یا پھر معاہدہ میں شامل کوئی بھی حکم اسلامی نظام کے بنیادی قواعد کے تقاضوں کے مخالف نہ ہو(۱۲۵)، مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت پر لازم ہے کہ جب وہ غیر اسلامی جماعتوں یا حکومتوں کے ساتھ معاہداتی تعلقات تشکیل دینے کا پختہ ارادہ کرلے تو اس امر کو ملحوظ رکھے کہ معاہدہ کا موضوع اور اس کا مضمون شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ہم آہنگ رہے، بصورت دیگر اس حوالے سے اس کی کارکردگی قانونا عدم جواز کے داغ سے داغدار ہوجائے گی، اور ایسی صورت میں معاہدہ لازم نہ ہوگا، بلکہ اسے باطل سمجھنا لازم ہوگا، وہ اس طرح کہ گویا معاہدہ ہوا ہی نہیں۔

اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ٹکرانے والے امور سے متعلق معاہدہ کی حرمت پر درج ذیل آیات دلالت کرتی ہیں:

۱۲۴- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۰۰-۵۰۹، دکتور أحمد أبوالوفا محمد، مرجع سابق، ص ۶۴-۶۸۔

۱۲۵- محمود شلتوت، الاسلام عقیدۃ وشریعۃ، القاہرۃ، الإدارۃ العامۃ الثقافۃ الإسلامیۃ بالأزہر ۱۹۵۹، ص ۴۵۶ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۱۲۔

"حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما أهل لغیر الله به"(تم پر مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ذبح کئے جانے والے جانور حرام کر دیئے گئے)، "یأیهاالذین آمنوا إنما الخمر والمیسر والأنصاب والأزلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوه لعلکم تفلحون"(اے ایمان والو! یقیناً شراب، جوا، چڑھاوے اور پانسے شیطان کے گھنونے کام ہیں، ان سے پرہیز کرو تا کہ تم کامیاب ہوسکو)۔

ان آیات میں سودی لین دین یا شراب سے متعلق کاروبار اور خنزیر کے گوشت کے کاروبار کی نسبت سے جو حرمت کا حکم دیا گیا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ بیرونی سطح پر اسلامی حکومت کے لئے ممنوع ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ تجارتی لین دین سے متعلق کوئی ایسا معاہدہ کرے جس میں مذکورہ سامانوں میں سے کوئی سامان شامل ہو، اور اگر ایسا کیا گیا تو یہ معاہدہ باطل شمار ہوگا، اور عملاً اس کا کوئی اثر نہ ہوگا، اس سے بڑھ کر عدم جواز کی دلیل کیا ہوسکتی ہے کہ اس میں ظلم وزیادتی ہے اور اللہ تعالی کے حدود سے تجاوز شامل ہے، جو آئندہ اسلامی مملکت کے لئے ہلاکت اور گھاٹے کا سودا ثابت ہوسکتا ہے(۱۲۶)، حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے

۱۲۶- سید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۸۵ء) ج ۷ ص ۹۷۵-۹۷۸۔ الزمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الاقاویل فی وجوه التأویل، القاهرة، مطبعة الاستقامة، الطبعة الأول، ۱۳۶۵ھ، ۱۹۴۶ء، ج ۱ ص ۶۰۲، ۶۰۵، ۶۷۴- ۶۷۵، یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ خبائث (ناپاک چیزوں) کی حرمت، جن کا ذکر آیات میں کیا گیا ہے، دینِ کامل اور اللہ کی مکمل نعمت کا حصہ ہے۔ اسی لیے ان آیات کے بعد اسلام کو اللہ تعالیٰ کی رضا کا دین قرار دیا گیا، جبکہ دیگر مذاہب کے بارے میں یہ بات نہیں کہی گئی۔ یہ بھی اشارہ ہے کہ ان آیات میں شراب اور جُوا کی حرمت کو کئی پہلوؤں سے مؤکد (پختہ) کیا گیا ہے: ان جملوں کی ابتدا "إنّما" جیسے الفاظ سے کی گئی، جو زور اور حصر (تاکید) کا مفہوم رکھتے ہیں، انہیں بتوں کی عبادت کے ساتھ ملا دیا گیا، نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے: "شراب پینے والا گویا بت پرست ہے"، ان کو رجس (نجس وناپاک) قرار دیا گیا، ان کو شیطان کا عمل کہا گیا، حالانکہ شیطان سے صرف خالص شر ہی صادر ہوتا ہے، ان سے اجتناب (دور رہنے) کا حکم دیا گیا اور اسے کامیابی (فلاح) کا ذریعہ قرار دیا گیا، اور یہ بھی بیان کیا گیا کہ ان کے نتائج میں سے ایک یہ ہے کہ وہ شراب و جوا کھیلنے والوں کے درمیان دشمنی اور بغض پیدا کرتے ہیں، اور یہ کہ وہ اللہ کے ذکر اور نماز کے اوقات کی پابندی سے روک دیتے ہیں۔ ابن العربی، أحکام القرآن، مرجع سابق ۲/ ۵۲۷۔

ارشاد فرمایا: ''مسلمان اپنے شرائط کے پابند ہیں سوائے اس شرط کے جو حرام کو حلال کر دے یا حلال کو حرام قرار دے''، اسی طرح آپ ﷺ سے یہ قول منقول ہے کہ ''ہر طرح کی صلح جائز ہے سوائے اس صلح کے جو حرام کو حلال کر دے یا حلال کو حرام بنا دے''، آپ ﷺ کا یہ بھی فرمان ہے کہ ہر ایسی شرط جو اللہ کی کتاب سے ثابت نہ ہو وہ باطل ہے، گرچہ اس طرح کی سو شرطیں ہوں، اللہ کا فیصلہ زیادہ مبنی برحق ہے اور اللہ کی شرط زیادہ مضبوط ہے(۱۲۷)، اسی کے ساتھ آپ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ صلح حدیبیہ کی مذاکراتی گفتگو کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، وہ لوگ خدا کے مقدسات کے احترام کے لئے کسی بھی منصوبہ کے متعلق درخواست کریں گے تو میں اس پر آمادہ ہو جاؤں گا''(۱۲۸)۔

یہ روایات اور دیگر صحیح احادیث کے عموم اور اطلاق کا تقاضا ہے کہ اسلامی احکام کی برتری تسلیم کرتے ہوئے انہیں ترجیح دی جائے، اور اس طرح کے کسی بھی معاہدہ کو خاطر میں لائے بغیر رد کر دیا جائے، مگر ان میں جو معاہدہ ان احکام کے مطابق ہو، اس پر عمل کو ضروری سمجھا جائے، اور اس میں شامل مضمون و مواد کو قابل عمل شمار کیا جائے، اور جو ان احکام کے مخالف ہو اسے باطل سمجھا جائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اعمال کے اچھے یا برے ہونے کا تعین، جیسا کہ کچھ اہل علم نے درست فرمایا ہے- استدلال کے طریقوں سے نہیں ہوتا بلکہ منقول قانون یعنی شریعت کی روشنی میں ہوتا ہے، تو اچھا عمل وہ ہے جسے شریعت اچھا قرار دے اور اس کی ترغیب دے،

وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ کسی معاہدے کو پورا کرنا (وفا کرنا) اسی وقت لازم ہوتا ہے جب وہ کتاب اللہ کے مطابق ہو۔ اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے عہدوں اور شرطوں کو پورا کریں، جب تک ان میں کوئی ایسی بات ظاہر نہ ہو جو کتاب اللہ کے خلاف ہو۔

۱۲۷- مجموع فتاوی ابن تیمیۃ، مرجع سابق، ج ۲۹، ص ۱۷۵، ومابعدہا. السیوطی، الجامع الصغیر، من حدیث البشیر النذیر، (تحقیق) ناصر الألبانی، بیروت، المکتب الإسلامی، ۱۹۸۲ء، ج ۲ ص ۷۷۔ القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج ۱۴، ص ۷-۸۔

۱۲۸- پچھلا صفحہ نمبر ۱۷ تا ۱۸ سے مراجعت کریں۔

اور برا عمل وہ ہے جس سے شریعت روکے اور اس کی مذمت کرے (۱۲۹)۔

تاہم یہ واضح رہے کہ اسلامی شریعت کی دفعات کے مطابق معاہدوں کو انجام دینے میں قانونی جواز کی شرط کا منجملہ اور تفصیل کے ساتھ پورا ہونا ضروری ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ جس طرح معاہدہ کے موضوع کل کی حیثیت سے قانونا جائز ہونا ضروری ہے، اسی طرح اس جواز کا معاہدہ میں شامل احکام میں سے ہر حکم کے لئے ثابت ہونا بھی لازمی ہے، مگر جواز کی شرط نہ پائے جانے کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات معاہدے کے موضوع کے حوالے سے اس میں موجود کسی بھی حکم کی نسبت سے مختلف ہوں گے، ایک حالت میں چونکہ معاہدہ کے سلسلے میں جواز مفقود ہے تو اس کا اثر یہ ہوگا کہ معاہدہ باطل سمجھا جائے گا، گویا معاہدہ عملا وجود پذیر نہیں ہوا، دوسری حالت میں معاہدہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ٹکرانے کی وجہ سے جزوی حکم کے کالعدم ہونے کے باوجود فریقین کے لئے نافذ اور قابل عمل سمجھا جائے گا (۱۳۰)۔

وہ حالتیں جن میں معاہدہ کا موضوع شرعی طور پر قانونی حیثیت نہیں رکھتا اور اس لئے معاہدہ کو کالعدم سمجھا جائے گا ان میں غیر اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی ریاست کا طے کردہ وہ معاہدہ بھی شامل ہے جس کے مطابق غیر اسلامی ملک کو اسلامی حکومت کے زیر اثر علاقوں میں بڑے خطرات پر مشتمل سرگرمیاں انجام دینے مثلاً اسلامی حکومت کی سرزمین پر ایٹمی تجربہ کرنے یا پھر جوہری فضلہ کو دفن کرنے کی اجازت دی جائے، اس میں اسلامی حکومت کے ذریعہ انجام دیئے جانے والے وہ معاہدات بھی شامل ہیں جن کا موضوع یہ ہو کہ شرعی نقطہ نظر سے حرام سمجھے جانے والے مواد اور سامان کے باہم تبادلہ پر دونوں ممالک متفق ہوجائیں، اسی طرح وہ معاہدے بھی باطل ہیں جن کی رو سے نشہ آور اشیاء کے امپورٹ یا سودی قرضوں کے سلسلے میں دو

۱۲۹- أبو حامد الغزالی، المنقول من تعلیقات الأصول (تحقیق) محمد حسن ہیتو، دمشق، دار الفکر، ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء، ص ۴۸۵۔ ابن قیم الجوزیۃ، أعلام الموقعین عن رب العالمین، مرجع سابق، ج ۱، ص ۳۴۵ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۳۰- الشافعی، الأم، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۱۰۔ دکتور وہبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقۃ الإسلامی، مرجع سابق، ص ۱۴۴۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام، مرجع سابق، ص ۱۴۴۔

مما لک نے باہم اتفاق کیا ہو، یہ عدم جواز اس صورت میں بھی ہے جب ایک اسلامی ملک کسی ایسے فوجی، تجارتی یا اقتصادی بین الاقوامی معاہدہ میں شریک ہو جس میں کسی دوسرے اسلامی ملک سے جنگ شامل ہو(۱۳۱)، اس قانونی عدم جواز کے تحت ایسے کسی معاہدہ میں شامل وہشق بھی ہے جس کے مطابق معاہدہ کے غیر مسلم فریق کو مقدس مقامات میں داخل ہونے کی اجازت دیدی جائے، یہ اللہ تعالی کے اس قول کے بالکل برخلاف ہے ''اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں وہ لوگ اس سال کے بعد مسجد حرام کے بالکل قریب نہ ہوں''، مشرکین کو ان مقامات مقدسہ سے روک دینا یہ حکم عمومی ہے جو مقصود بالذات ہے، مشرکین میں پائے جانے والے ممانعت کے سبب کی بنیاد پر اور وہ ہے شرک کی معنوی نجاست جو ان میں موجود ہوتی ہے، کیونکہ ان لوگوں کو ان جیسے مقامات مقدسہ میں اگر داخل ہونے کی اجازت دیدی جائے گی تو ان کا تقدس پامال ہوجائے گا، اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کی شان وشوکت کا اظہار لازم آئے گا(۱۳۲)، اسی طرح ایسے معاہدے کے جزوی طور پر باطل ہونے کی نشاندہی کرنے والی ایک صورت معاملہ وہ بھی ہے جس میں اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومت کے ساتھ اس قسم کا کوئی اتفاق کر لیتی ہے جس کی رو سے مسلم فریق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ کوئی خاتون اگر اس کے پاس مسلمان ہوکر آئے تو اسے غیر اسلامی مملکت کی طرف لوٹا دے، یا اس معاہدہ میں یہ صراحت کردی جاتی ہے کہ ایسی غیر اسلامی حکومت جس سے معاہدہ کیا گیا ہے اس کی گرفت میں موجود مسلم قیدیوں کی رہائی کا مطالبہ نہ کیا جائے، یا اس بات کی صراحت کردی جائے کہ غیر اسلامی حکومت میں موجود حکام کو

۱۳۱- دکتور محمد الصادق عفیفی، الإسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۲۲۷-۲۴۹-۲۵۷۔ دکتور محمد علی الحسن، العلقات الدولیۃ فی القرآن والسنۃ، عمان، مکتبۃ النہضۃ الإسلامیۃ، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۲ء ص ۲۸۶، ۲۸۸-۳۵۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۳۲- دکتور محمد صادق عفیفی۔ الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، پچھلا مرجع، صفحہ نمبر ۱۴۴ اور ۱۵۰۔ اور اسی طرح دیکھیں: ابن کثیر وتفسیر القرآن الکریم، پچھلا مرجع، (طبعۃ الشعب)، جلد ۴، صفحہ نمبر ۸۲ تا ۸۴۔ القرطبی، الجامع لأحکام القرآن، (الطبعۃ الثانیۃ)، جلد نمبر ۸، صفحہ نمبر ۱۰۳ تا ۱۰۹۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، جلد ۲، صفحہ نمبر ۲۶۱ تا ۲۶۲۔

اس بات کی کھلی چھوٹ ہے کہ وہ جس طرح چاہیں رعایا پر ظلم کریں اس کا خون بہائیں، یہ ظالمانہ کاروائی پر ایک طرح کا تعاون سمجھا جائے، جو کتاب وسنت کی صراحت کے مطابق سراسر ظلم ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''زمین میں اصلاح کے بعد بگاڑ نہ پیدا کرو''، اسی طرح سے اللہ تعالی نے فرمایا: ''جو کوئی اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے''، نیز ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''اپنے بھائی کی مدد کرو اگر چہ وہ ظالم ہو (اسے ظلم سے روک کر) یا مظلوم ہو (اس کی مدد کر کے)'' اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے افضل جہاد ظالم بادشاہ کے روبرو کلمہ حق کا اظہار ہے'' (۱۳۳)۔

-کلی یا جزوی طور پر شرعی احکام سے متصادم معاہدہ کے حوالے سے فریق ثانی کے حقوق-

اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ اسلامی شریعت میں معاہدہ کی جامع اور متفق علیہ تعریف جو اسلامی اور غیر اسلامی مملکتوں کے باہمی تعلقات کی حقیقت سے پوری طرح ہم آہنگ ہے اس کی رو سے باہمی معاہدات کو منظّم کرنے والا یہ قانون مشترکہ ارادوں اور طرفین کی باہمی رضامندی کا نتیجہ ہے بشرطیکہ اسلامی مملکت اس بات کی پابند رہے کہ یہ ''متفقہ قانون'' اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے متصادم نہ ہو۔

بالفاظ دیگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی حکومت سے معاہدہ کرنے والے غیر اسلامی فریق کو اسلامی شریعت کے احکام کا پابند نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اسلامی شریعت کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ وہ ایک ایسے داخلہ دستور یا عمومی قانون کی حیثیت رکھتی ہے جس کے احکام کی رعایت اور جس کے تقاضوں کی تکمیل اسلامی حکومت پر ان تمام معاہدات میں جو وہ غیر مسلم ممالک اور

۱۳۳- ابن قیم الجوزیۃ، اعلام الموقعین عن رب العالمین، مرجع سابق، جلد ۱، صفحہ نمبر ۳۸۱ تا ۳۸۲۔ القلنشدی، صبح الاعشی، پچھلا مرجع، جلد نمبر ۱۴، صفحہ نمبر ۷ تا ۸۔ دکتور محمد صادق عفیفی، الاسلام والمعاهدات الدولیۃ، مرجع سابق، صفحہ ۱۴۴ اور ۱۵۰۔ دکتور احمد ابوالوفا، مرجع سابق، صفحہ ۷۳ تا ۷۴۔

اداروں کے ساتھ طے کرتی ہے، فرض ہے(۱۳۴)،اس کے نتیجہ میں اسلامی مملکت کے ساتھ معاہدہ کرنے والے دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ کا سوال اس وقت زیر بحث آئے گا جب یہ ثابت ہوجائے کہ دونوں فریق کے درمیان طے پانے والا معاہدہ اپنے موضوع یا اس میں موجود کسی بھی شق میں اسلامی شریعت کے عمومی دفعات کے تقاضے سے متصادم ہے،یعنی اس صورت میں جب یہ واضح ہوجائے کہ اس معاہدہ میں اسلامی ریاست کے داخلی آئین کی ایک شق کی خلاف ورزی کی گئی ہے، یہ سوال ان حالات میں زیادہ شدت کے ساتھ اٹھے گا جب اسلامی مملکت غلبہ وقوت سے محروم ہو اور عملی صورت حال اسے ان معاہدوں پر مبنی تعلقات میں فریق بننے پر مجبور کرے جن کے طے کرنے، نافذ کرنے اور جن کو ختم کرنے کا اختیار ایک ایسے بین الاقوامی قانون کو ہو جو بنیادی طور پر اس کے بنانے والوں کی مرضی اور ان کی مشترکہ رضامندی پر مبنی ہو جیسا کہ معاصر بین الاقوامی تعلقات میں یہ صاف نظر آ رہا ہے۔

درحقیقت دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ جو کہ اس طرح کے معاملات میں اسلامی حکومت کے ساتھ معاہدہ کرتا ہے، دو بنیادی مفروضوں کو جنم دیتا ہے، جن میں سے ہر ایک کے اپنے عناصر ہیں جن پر وہ قائم ہے، اور احکام وضابطے ہیں جن کے ذریعہ وہ منضبط ہوتا ہے، جو درج ذیل طریقے پر انجام پاتا ہے۔ پہلا مفروضہ یہ اس حالت میں ظاہر ہوتا ہے جس میں اسلامی شریعت سے کلی یا جزئی طور پر ٹکرانے والا معاہدہ دوطرفہ ہوتا ہے، جسے اسلامی مملکت غیر اسلامی مملکت کے ساتھ انجام دیتی ہے، اس طرح کے معاہدہ کی معاہدہ کو انجام دینے والے ماہرین کی طرف سے تصدیق کردی جاتی ہے اور اسے اسلامی حکومت کی طرف سے نافذ کردیا جاتا ہے، اور کبھی کبھی وہ فریقین میں سے کسی کی طرف سے بھی توثیق نہ ہونے کی وجہ سے نافذ نہیں ہو پاتا۔

پہلی حالت میں معاہدہ کو مطلقا باطل سمجھا جائے گا، جبکہ وہ کلی طور پر اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے ٹکراتا ہو، اور اسے جزوی طور پر باطل سمجھا جائے گا جبکہ اس کی کوئی ایک شق ان

۱۳۴- پچھلے صفحہ نمبر ۳۲ تا ۳۳ سے مراجعت کریں۔

عمومی احکام کے تقاضوں سے میل نہ کھاتی ہو، اور معاہدہ میں فریق ثانی کے حقوق کا تحفظ نیک نیتی کے پہلوؤں پر منحصر ہوگا، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر خلاف ورزی ہوئی ہے تو شرعی قانون کی عمومی دفعات میں سے کسی ایک کی صریح خلاف ورزی ہے، یا یہ خلاف ورزی اتنی واضح ہے کہ دوسری حکومت جس سے معاہدہ کیا گیا ہے، کے لئے بآسانی یا بغیر کسی مشقت کے واقفیت ممکن ہے، یا وہ اگر معمول کی دیکھ بھال ہو تو اس خلاف ورزی کو جاننے پر قادر ہو، اگر یہ سب کچھ غیر اسلامی مملکت کی طرف سے ہو جو معاہدہ کی ایک فریق ہے تو اسے بدنیتی کی دلیل سمجھا جائے گا، جس کی وجہ سے معاہدہ کی تنفیذ کے مطالبہ کا حق ساقط ہو جائے گا، اس سے قطع نظر کہ اسلامی شریعت کی دفعات کیا ہیں، جو اسلامی مملکت کے داخلی قانون کی نمائندگی کرتی ہیں (۱۳۵)، صورت حال بالکل مختلف ہوگی اگر خلاف ورزی کا تعلق کسی ایسے معاملے سے نہ ہو جو اسلامی شریعت کے دائرہ کار میں دوسرے فریق کے لئے واضح اور ظاہر ہو، کیونکہ اسے اس غیر اسلامی مملکت کے حق میں جس کا معاہدہ اسلامی حکومت سے ہو چکا ہو عذر سمجھا جائے گا، اور اسے نیک نیتی کی دلیل شمار کیا جائے گا، اور وہ غیر مسلم ملک شرعی قانون کی دفعات کے مطابق معاہدے کو کالعدم قرار دینے والے حکم کے نتیجے میں اسے ہونے والے نقصانات یا منافع سے محرومی کے معاوضے کا حقدار ہوگا، ایسی حالت میں نقصان اٹھانے والی حکومت کے لئے سب سے بہتر معاوضہ یہ ہے کہ وہ اسلامی حکومت کے ساتھ نئے مذاکرات میں شامل ہو جائے تا کہ ایک دوسرا ایسا معاہدہ کرنا ممکن ہو، جو اسلامی شریعت کی دفعات کے مطابق ہو، اور جس سے دونوں فریق کے مصالح کی تکمیل ممکن ہو۔

اور اگر ایسی حالت ہے کہ معاہدہ کا کالعدم ہونا یا اس کا فساد کسی ایک شرط پر یا اس دوطرفہ معاہدہ میں شامل دفعات میں سے کسی ایک دفعہ سے متعلق ہو اور معاہدہ کی تصدیق کر دی گئی ہو، نیز اسے اسلامی مملکت کے حق میں قابل نفاذ بھی قرار دیا گیا ہو تو ایسا معاہدہ فریقین کے

۱۳۵- اس کے قریب تر وہ احکام ہیں جو 1969 کے ویانا معاہدہ قانون میں بیان کئے گئے، دکتور محمد سامی عبدالحمید، اصول القانون الدولی العام، الجزء الاول، اسی طرح: القاعدة الدولية، الاسكندرية، الثقافية الجامعية، ۱۹۸۶ء (التصدیق الناقض علی المعاهدات) دیکھیں۔

لئے نافذ اور قابل عمل سمجھا جائے گا، ایک شرط اور ایک دفعہ کو مستثنیٰ سمجھتے ہوئے، کیونکہ معاہدہ کے کالعدم ہونے کا معاملہ صرف اسی ایک حکم یا شرط سے متعلق ہے، معاہدہ کے تمام دفعات پر اس کے اثرات کا مرتب ہونا چونکہ ناممکن ہے، اس لئے اسلامی مملکت کے داخلی قانون کے نقطہ نظر سے جزوی بطلان کا حکم معاہدہ کرنے والے دونوں فریقوں کے درمیان دوبارہ مذاکرات کا ذریعہ ثابت ہوگا، جسے ناجائز حکم باطل شرط کے معاملہ کو درست کرنے کی تمہید اور اس سے متعلق امور کو اس طریقہ پر منظّم کرنا شمار کیا جائے گا کہ شریعت کی عمومی دفعات سے کوئی ٹکراؤ نہ ہو۔

لیکن اس صورت میں کہ دوطرفہ معاہدہ اسلامی شریعت کی دفعات کے ساتھ مکمل یا جزوی طور پر متصادم ہو اور اس کی توثیق نہ ہونے کی وجہ سے اسلامی مملکت کی طرف سے اب تک نافذ قرار نہ دیا گیا ہو تو (۱۳۶) اس حالت کے مقابلے کے لئے کسی طرح کی دشواری یا مشکلات پیش نہیں آئے گی، اس لئے کہ اسلامی مملکت میں اختیار رکھنے والوں کے لئے ایسی صورتحال میں معاہدہ کی توثیق وتصدیق سے بچنے کا موقع مل جائے گا، اس کے بغیر کہ انہیں کسی دوسرے ایسے معاہدے سے متعلق جس میں کلی یا جزوی ٹکراؤ نہ ہو اتفاق کرنے کے مقصد سے نئے مذاکرات میں شامل ہونے سے رکنا پڑے۔

اگر معاہدہ جزوی طور پر شریعت کی دفعات سے متصادم ہو تو مزید آسانی ہوجائے گی، کیونکہ ایسی صورت میں معاہدہ کی تصدیق کرتے وقت معاہدہ سے متعلق اپنے تحفظ کا اظہار کرنا اسلامی مملکت کے لئے آسان ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت اس شرط یا شق کے اطلاق کو روکتے ہوئے جو شریعت کی دفعات سے متصادم ہے، معاہدہ کی توثیق وتصدیق کرے گی، گرچہ اس سلسلے میں اسلامی مملکت کا طرز عمل درحقیقت دقیق معنی تحفظ پر مبنی نہیں ہے، بلک ایک نیا ایجاب ہے جو معاہدے کے دوسرے فریق کو پیش کیا گیا ہے، یہاں تک کہ اگر دوسرے فریق نے

۱۳۶- یہ بات معلوم ہے کہ معاہدہ ایک عمومی اصول کے طور پر اس وقت تک فریقین کے درمیان نافذ نہیں ہوگا جب تک اس کی توثیق نہ کرلی جائے، الا یہ کہ خود معاہدہ میں ہی اس بات پر اتفاق کرلیا گیا ہو کہ وہ صرف متعلقہ ذمہ دار یا مجاز شخص کے دستخط کے ساتھ ہی مؤثر و نافذ ہوگا۔

اسے قبول کرلیا اور اس پر اپنی رضامندی ظاہر کردی تو اس سے معاہدہ منعقد ہوجائے گا، اور فریقین کے حق میں لازم مانا جائے گا (۱۳۷)۔

مذکورہ معنی میں ایسے دوطرفہ معاہدہ سے متعلق تحفظ کی دلیل جس کی تصدیق نہ کی گئی ہو، وہ مشورہ ہے جو حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ کو دیا تھا، جب انہوں نے اہل روم سے وہ معاہدہ کیا تھا جس کا تعلق شام کے علاقے میں ان حضرات کے قیام کو منظم کرنے والے احکام سے تھا، اس معاہدہ میں لازمی طور پر دو شقیں شامل کرائی گئیں: ایک یہ کہ وہ یعنی رومی مسلمان قیدیوں کو نہ خریدیں گے اور دوسرے یہ کہ جو کسی مسلمان پر حملہ آور ہوگا اس کا معاہدہ ختم کردیا جائے گا، حضرت عبدالرحمٰن بن غنمؓ نے شام میں قیام پذیر رومیوں کو ان کی جگہ باقی رکھا ان دونوں شرطوں کے تقاضوں کے مطابق (۱۳۸)۔

دوسرا مفروضہ: دوسرے مفروضہ کا تعلق اس حالت سے ہے جس میں اسلامی شریعت کی عمومی دفعات سے متصادم معاہدہ اجتماعی نوعیت کا معاہدہ ہو، یا ایسا معاہدہ ہو جس میں متعدد فریق ہوں اور اسلامی مملکت ایک فریق ہو۔

ایسی صورت میں اگر اب تک اسلامی مملکت کی طرف سے معاہدہ کی توثیق نہ ہوئی ہو اور وہ کلی طور پر اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے متصادم ہو، اور ایسا اس صورت میں بھی ہوتا

۱۳۷- تحفظ ایک یک طرفہ ارادے سے کیا گیا قانونی تصرف ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ معاہدے کی بعض شقوں (احکام) کو اُس فریق پر لاگو ہونے سے مستثنیٰ کردیا جائے جس نے تحفظ اختیار کیا ہو۔ فقہائے کرام کے نزدیک راجح رائے یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون میں معاہدات پر تحفظ (Reservation) کی جو صورت پائی جاتی ہے، وہ اسلامی فقہ میں "عقد کے ساتھ مشروطیت" (یعنی معاہدے کے ساتھ شرط لگانے) کے تصور کے مماثل ہے۔ اس سلسلے میں مراجعت کریں: دکتور محمد طلعت، احکام المعاہدات فی الشریعۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۱۰۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔ دکتور محمد سامی عبدالحمید، سابقہ مرجع، (التحفظ علی المعاھدات)۔ دکتور عبدالغنی محمود، التحفظ علی المعاھدات الدولیۃ فی القانون الدولی والشریعۃ الاسلامیۃ، القاھرۃ، دارالنھضۃ العربیۃ، ۱۹۸۶، صفحہ نمبر ۱۷ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۳۸- ابن قیم الجوزی، احکام اھل الذمۃ (تحقیق)، صبحی الصالح، مطبعۃ جامعۃ دمشق، ۱۳۸۱ھ/۱۹۶۱م، صفحہ ۶۵۷ اور اس کے بعد کے صفحات، اور گذشتہ صفحہ نمبر ۱۴ سے بھی مراجعت کریں۔

ہے جب اس معاہدہ کا مقصد کسی اسلامی مملکت یا دیگر اسلامی ممالک سے خارجہ تعلقات کے کسی میدان میں لڑنا ہوتا ہے، ایسی حالت میں اسلامی مملکت پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اس طرح کے معاہدہ کی توثیق نہ کرے، اس لئے کہ اس کے لئے کسی بھی حال میں روا نہیں کہ وہ اس طرح کے معاہدہ میں بطور فریق شامل ہو، کیونکہ وہ اسلامی شریعت کی بلند واہم بنیادوں سے متصادم ہے، یعنی مسلمانوں کو پیش آنے والے خطرات سے مقابلہ آرائی کی خاطر باہمی تعاون واخوت اور یکجہتی کے اصول سے متصادم ہے، مگر جب تصادم معاہدہ میں شامل کسی دفعہ یا کسی شق تک منحصر ہو، اور یہ تحفظات کو نہ روکتا ہو تو اسلامی مملکت شریعت سے متضاد شق یا دفعات پر تحفظات کے ساتھ معاہدے کی فریق بن سکتی ہے۔

اس کی مثال مصری حکومت کا وہ طرز عمل ہے جو اس نے معاہدہ کی شق (۱۶) سے متعلق تحفظ کا اظہار کرتے ہوئے ۱۹۷۹ میں عورتوں کے خلاف امتیازی سلوک کی تمام تر شکلوں کے خاتمہ سے متعلق معاہدہ کی توثیق کی رشتہ ازدواج کے دوران اور اس کے بعد عورتوں اور مردوں کو مساوی قرار دیا گیا تھا، اس کا تحفظ معاہدہ کی اس شق سے متعلق تھا جس کے تحت مصری حکومت نے جو تحفظ پیش کیا وہ یہ تھا کہ اسلامی شریعت میاں بیوی کے درمیان مساوات قائم رکھتی ہے، تاہم بعض معاملات ایسے ہیں جن میں مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں خصوصی حیثیت حاصل ہے، ان اسباب کی بناء پر جنہیں خود شریعت نے عورتوں کے ساتھ خصوصی برتاؤ اور سلوک کے متعلق قابل ترجیح سمجھا ہے، جس طرح مصر نے اسی معاہدے کے آرٹیکل (۲) پر تحفظات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ یہ آرٹیکل سابقہ دفعہ سے منسلک ہے مگر وہ اسلامی قانون سے متصادم نہ ہونے کی شرط سے مشروط ہے (۱۳۹)۔

مگر جب اسلامی مملکت معاہدہ کی توثیق کردے، یا اجتماعی معاہدے میں شریک ہوجائے، یا ایسے معاہدے میں جس کے کئی فریق ہوں اور توثیق یا شمولیت کے بعد اسلامی مملکت

۱۳۹- نص تحفظ مصری اس میں دیکھیں:

کے سامنے یہ واضح ہو کہ معاہدہ کلی یا جزوی طور پر اسلامی شریعت کی عمومی دفعات سے متصادم ہے، تو ایسی صورت میں اسلامی مملکت کے لئے لازم ہے کہ وہ معاہدہ سے الگ ہوجائے، چاہے معاہدہ کا اسلامی شریعت سے تصادم جزوی ہو یا کلی، اگر چہ اسلامی مملکت کے لئے جزوی تصادم کی حالت میں معاہدہ کا ایک فریق بننا جائز ہے جبکہ ضرورت کا بھی تقاضا ہو کہ وہ معاہدہ میں ایک فریق کے طور پر باقی رہے، جس سے مسلمانوں کے عمومی مصالح جیسے منافع کا حصول اور مفسدہ کے خاتمہ کی تکمیل ممکن ہو سکے، تاہم جب ایسی ضرورت باقی نہ رہے، تو اسلامی مملکت کے لئے اتنا ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ معاہدے میں ایسی ترمیم کرے جو شرعی احکام سے متفق ہو، اور اگر وہ ایسے اجزاء میں ترمیم کرنے پر قادر نہ ہو تو پھر معاہدہ سے نکل جائے۔

بعض حضرات اس کی مثال اقوام متحدہ کے چارٹر میں اسلامی ممالک کے الحاق سے دیتے ہیں جو کہ پوری عصر حاضر کی عالمی برادری کا بنیادی قانون سمجھا جاتا ہے، چارٹر اپنے موضوع اور مقصد کے لحاظ سے اگر چہ شریعت اسلامی کے عمومی احکام سے متفق نظر آتا ہے، مگر وہ بعض احکام میں اسلامی شریعت سے متصادم ہے، خاص طور سے ان بڑے ممالک کو برتری اور امتیاز دینے کے حوالے سے جو غیر اسلامی ہیں یہ امتیاز اصلاً متصادم ہوتا ہے اس وجوبی حکم سے کہ برتری ہمیشہ اسلامی مملکت کو حاصل ہوگی، اللہ کے اس ارشاد گرامی کو عمل میں لاتے ہوئے "**ولا تهنوا ولا تحزنوا وأنتم الأعلون إن كنتم مؤمنين**" (۱۴۰) مگر ضرورتاً اور معاشی وعسکری کمزوری کی جس صورتحال سے اسلامی ممالک دوچار ہیں اس کی وجہ سے اسلامی مملکتوں کے لئے حد درجہ ضروری ہوجاتا ہے کہ وہ اس طرح کے چارٹر میں شامل ہوں، یہاں تک کہ انہیں طاقت وقوت

Human Rights International Instruments, Signatures, Ratifications Accessions, etc,IJuly 1982, st/Hr/4/Rev.4, UN. New York 1982.P.91 (سابقہ مرجع صفحہ نمبر ۹۴ میں دکتور احمد ابوالوفا محمد سے منقول ہے)۔

۱۴۰- سورۃ آل عمران ۱۳۹، اور اس میں دیکھیں: القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، (الطبعۃ الثانیۃ)، جلد ۴، صفحہ ۲۱۶ تا ۲۱۷۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ض ا صفحہ نمبر ۴۱۸۔ ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق،

حاصل ہوجائے، اور وہ شریعت کے عمومی دفعات کے مطابق ترمیم کرنے پر قادر ہوجائیں، یا پھر اقوام متحدہ سے دوری بنانے پر(۱۴۱)۔

یہ بات اہم ہے کہ اسلامی مملکت غیر اسلامی مملکتوں کے ساتھ کئے گئے دوطرفہ اور اجتماعی معاہدوں کے ذریعہ تعلقات کو منظّم کرنے سے متعلق دفعات پر عام حالات میں عمل کرنے کی پابند ہے، اگرچہ معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے معاہدہ میں خیانت ہو، اسلامی حکومت معاہدہ کے معاملے میں غیر اسلامی حکومت کی نیکی نیتی کو مدنظر رکھے گی بشرطیکہ معاہدہ شریعت کے عمومی اصول سے متصادم نہ ہو، یا اس کے ذریعہ کسی ایک فریق کو کوئی نقصان لاحق نہ ہو، جب معاہدہ کے شرائط اور ارکان پائے جائیں تو اس پر عمل واجب ہوگا، اس طرح کے احکام کی شرعی بنیادیں قرآن کریم کی متعدد آیات واحادیث میں پائی جاتی ہیں، ساتھ ہی خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی مملکت کا طرز عمل اور سب سے بڑھ کر وہ اصولی قواعد وضوابط جنہیں فقہاء نے کتاب وسنت کے احکام پر مستنبط کیا ہے ہمارے لئے اس بابت رہنما ثابت ہوں گے، جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**ولا تقولوا لمن ألقى اليكم السلام لست مؤمنا**"، "**وأوفوا بالعهد إن العهد كان عنه مسئولا**"،"**ان الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها**"۔"**والذين هم لأماناتهم وعهدهم راعون**"۔

ارشاد نبوی ﷺ ہے:"**لاضرر ولاضرار**"(نہ تکلیف پہنچانا درست ہے اور نہ تکلیف اٹھانا)، آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا:"**وعلى اليد ما أخذت حتى تؤديه**" (جو آپ نے لیا ہے وہ آپ کے ذمہ ہے جب تک کہ آپ اسے ادا نہ کردیں)، اسی طرح سے آپ ﷺ نے فرمایا:" جو تمہارے پاس امانت رکھے اسے امانت ادا کردو، اور جو آپ کے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو"، آپ ﷺ یہ بھی فرمایا:" مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں

جلد ا صفحہ نمبر ۴۱۹ تا ۴۲۰۔

۱۴۱- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام مرجع سابق صفحہ ۵۱۹ تا ۵۲۰۔

ظاہر پر لوگوں کا محاسبہ کروں اور اللہ تعالی اندرون کا نگراں ہے'' (۱۴۲)، ساتھ ہی فقہاء اصول کا اس پر اجماع ہے کہ نقصان کو دور کیا جائے گا، اور اضطرار کی وجہ سے دوسرے کا حق ختم نہ ہوگا (۱۴۳)۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکت کے ساتھ کئے گئے معاہدہ اور شرعی احکام کے درمیان کلی اور جزئی طور پر پیدا ہونے والے تصادم کو حل کرنے کے سلسلے میں جو احکام گذشتہ سطروں میں بیان کئے گئے ہیں، ان کی دلیل ہمیں نیک نیتی ایفائے عہد، امانت کی ادائیگی اور دفع مضرت جیسی بنیادوں میں ملتی ہے، یہ وہ اصول ہیں جن کی طرف گذشتہ آیات واحادیث اور قواعد میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔

۴- معاہدہ کی مدت:

معاہدے اپنی مدت کے اعتبار سے تین قسموں میں منقسم ہیں، کچھ معاہدے دائمی ہوتے ہیں جن کے احکام دوامی طور پر فریقین پر نافذ ہوتے ہیں، کچھ معاہدے عارضی ہوتے ہیں جن کے احکام طے شدہ مدت کے بعد ختم ہوجاتے ہیں، کچھ معاہدے زمانی تحدید سے آزاد ہوتے ہیں، ایسے معاہدوں میں وہ شق شامل نہیں ہوتی جس سے انہیں عارضی یا دوامی بنانا ممکن ہوسکے (۱۴۴)، ان تمام تر تفصیلات کے باوجود مفسرین کی آراء اور ان کا مسلک گذشتہ معاہدوں میں سے کسی نوع کے معاہدہ بھی اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکت کے ساتھ شرکت کی شرعی حیثیت کے سلسلے میں مختلف ہیں، جنہیں درج ذیل تفصیلات سے سمجھا جا سکتا ہے:

۱۴۲- بالترتیب دیکھیں: سورۃ النساء/ ۵۸، ۹۴ سورۃ الاسراء/ ۳۴، سورۃ المومنون/ ۸۔ اور اسی طرح دیکھیں: السیوطی، اسباب النزول، مرجع سابق، جلد ا صفحہ ۱۰۱ تا ۱۰۲۔

۱۴۳- عز الدین بن عبد السلام، قواعد الاحکام فی ترتیب مصالح الآثام، (تطبیق) طہ عبد الرؤف سعد، القاھرۃ، مکتبۃ الکلیات الازھریۃ، ۱۹۹۱م، ج ۲، ص ۱۵۳ اور اس کے بعد کے صفحات۔ دکتور جمال الدین عطیۃ، التنظیر الفقھی، د، ن، طبع ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء، ص ۸۷ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۴۴- دکتور احمد ابو الوفا محمد، مرجع سابق، ص ۹۷۔

اول-متعینہ مدت کے لئے کئے گئے معاہدے:

اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کے درمیان متعینہ مدت کے لئے کئے جانے والے معاہدہ کی مشروعیت کے سلسلے میں فقہاء اور مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا، اس مکمل اجماع کی وجہ قرآن کریم کی وہ آیتیں اور وہ روایتیں ہیں جن میں اس قسم کے معاہدوں کو جواز فراہم کیا گیا ہے، اس سلسلے میں اللہ کا یہ قول ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے: "**فأتموا اليهم عهدهم إلى مدتهم**" (چنانچہ ان کے ساتھ ان کے عہد کو ان کی مدت تک پورا کرو)، جو اس ارشاد ربانی کے سیاق میں ہے: "**إلا الذين عاهدتم من المشركين ثم لم ينقصوكم شيئا**" (سوائے ان مشرکین کے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا، اور انہوں نے تم سے کسی چیز میں کمی نہیں کی) یہ دلیل ہے اس چیز کی کہ وہ معاہدے جنہیں غیر مسلموں کے ساتھ انجام دینا اسلامی مملکت کے لئے جائز ہے یہ وہ معاہدے ہیں جن کی مدت متعین ہوتی ہے، اور مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس معاہدہ کے احکام کی تعمیل کریں، جب تک دوسرا فریق ایسے معاہدوں کی شرائط کی پاسداری کرتا رہے، یہاں تک کہ معاہدہ کے لئے متعین کی گئی مدت ختم ہوجائے (۱۴۵)، اسی طرح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جب کسی کا کسی قوم سے معاہدہ ہو تو وہ اسے ہرگز نہ توڑے اور نہ ہی اسے سخت کرے جب تک کہ اس کی میعاد ختم نہ ہوجائے، یا برابری کی بنیاد پر ان کا معاہدہ ان کے حوالے کردیا جائے (۱۴۶)، یعنی دوسرے فریق کی خلاف ورزی کی وجہ سے اسے ختم کردیا جائے، اس حدیث میں اسلامی ریاست کے ذریعہ غیر اسلامی حکومت سے کئے گئے معاہدہ کو ختم کرنے کے دو طریقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، پہلا طریقہ

۱۴۵- اس سے مراجعت کریں: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، (طبعۃ الشعب) ج ۴، ص ۵۳؛ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، (الطبعۃ الثانیۃ)، ج ۸، ص ۱۷۔ ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۷۴م،) ج ۲، ص ۹۰۰۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۲، ص ۲۴۲ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۴۶- رجوع کریں: سنن ابوداود اور سنن ترمذی۔

یہ ہے کہ معاہدہ کے جاری رہنے کی جو مدت متعین کی گئی تھی وہ پوری ہوجائے، اور اس مدت کے دوران اسلامی مملکت معاہدہ کے تقاضوں پر عمل پیرا رہے، حدیث کے اس حکم "**حتی یمضی أمده**" (یہاں تک کہ اس کی مدت مکمل ہوجائے) پر عمل کرتے ہوئے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اگر دوسرا فریق معاہدہ کے احکام کی خلاف ورزی کرے تو اسلامی مملکت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ اسے ختم کردے، مگر اس شرط پر کہ معاہدہ کا طوق اتار پھینکا جائے اور اس کا اعلان بھی کیا جائے تا کہ حدیث میں جو "**حتی ینبذ الیهم علی سواء**" کہا گیا ہے اس پر عمل ہوجائے (۱۴۷)، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے حدیبیہ کے مقام پر قریش کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس کی مدت بھی دس سال متعین کی گئی تھی، اس سے دو بنیادی طریقوں پر استدلال کیا جاسکتا ہے، جن کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاہدے جائز ہیں بشرطیکہ معاہدہ عارضی ہو اور مدت متعین ہو نہ کہ دائمی ہو (۱۴۸)۔

تاہم اگر ایک طرف مفسرین اور فقہاء کے درمیان مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان متعینہ مدت کے معاہدوں کو انجام دینے کی قانونی حیثیت پر اتفاق تھا، تو دوسری طرف ان کے درمیان اس مدت کے تعین کے بارے میں اختلاف ہوا جس میں اسلامی مملکت کے لئے جائز نہیں کہ اس سے زائد مدت کے لئے معاہدہ کرے، اس سلسلے میں دونوں اہم بنیادی رجحانات کے درمیان اس طرح تفریق کی جاسکتی ہے:

پہلے رجحان کا خلاصہ یہ ہے کہ متعینہ مدت کے لئے معاہدوں کو بروئے کار لانا، اسلام میں ایک اچھا عمل شمار کیا گیا ہے اور اس کی اجازت دی گئی ہے، مگر معاہدہ کے لئے مدت کی تعیین کا معاملہ مسلمانوں کی طاقت وقوت اور کمزوری کے لحاظ سے مختلف ہوگا، اگر مسلمان اتنے طاقتور ہیں کہ وہ غیر مسلموں کو اپنی شرائط کا پابند بنا سکتے ہیں، اور اگر وہ دعوت اسلامی پر لبیک نہ کہیں اور

۱۴۷- الخطابی، معالم السنن، بیروت، دار الکتب، ۱۹۸۱ء۔

۱۴۸- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، صفحہ ۵۱۱۔

معاہدہ کی مقررہ مدت کے درمیان اگر دعوت اسلامی کی مخالفت کریں تو انہیں دھمکی بھی دے سکتے ہیں، تو ایسی حالت میں معاہدہ کی کم سے کم مدت یہ ہے کہ وہ چار مہینے کے عرصہ پر مشتمل ہو، چار مہینے سے بڑھ کر نہ ہو(۱۴۹)، اس رجحان کے قائلین اپنے نقطہ نظر پر قرآن کریم کی اس آیت کریمہ سے استدلال کرتے ہیں، ''برآء ة من الله ورسوله إلى الذين عاهدتم من المشركين فسيحوافي الأرض أربعة أشهر واعلموا أنكم غيرمعجزى الله وأن الله مخزى الكافرين'' اس آیت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب مسلمانوں کو مکمل طاقت وقوت حاصل ہو تو ایسی صورتحال میں مشرکین کو چار مہینے تک مہلت دی جائے، جس میں انہیں اپنی جان اور مال کے سلسلے میں اطمینان ہو جائے، اس طرح کہ وہ اس دورانیہ میں توبہ کر لیں، شرک سے دور ہو جائیں، اور مسلمان بن جائیں، مگر جب مدت ختم ہو جائے، اور وہ اسلام میں داخل نہ ہوں، تو ایسی صورت میں یہ سمجھا جائے گا کہ گویا ان کی گمراہی اور کفر پر ان کا اصرار اور ان کی طرف سے دعوت اسلامی کی مخالفت کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہ گئی ہے، لہذا اب وہ ذلت اور رسوائی کے مستحق ہیں(۱۵۰)، اسی طرح حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے گذشتہ آیت کے نزول کے بعد فتح مکہ کے سال چار مہینے کے لئے صفوان بن امیہ سے صلح کی(۱۵۱)۔

لیکن معاملہ بالکل اس کے برعکس ہوگا اگر مسلمان کمزور ہوں اور ان کے بس میں نہ ہو کہ وہ مشرکین کی طاقت وقوت میں برابری کر سکیں جس سے ان کے لئے مشرکین پر غلبہ پانا ممکن ہو سکے، تو اس طرح کی صورتحال میں جتنی مدت کے لئے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کا معاہدہ

۱۴۹- ابن کثیر، تفسیر القرن العظیم، (طبعۃ الشعب)، ج ۴ ص ۴۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔ القرطبی، الجامع لاحکام القران، مرجع سابق، (الطبعۃ الثانیۃ) ج ۸، ص ۹۳ اور اس کے بعد کے صفحات۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۸۵م) ج ۳، ص ۱۵۸۶ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۵۰- دکتور محمد صادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۲۴۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۵۱- دکتور وہبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۵۵۔

کرنا روا ہوسکتا ہے وہ مدت دس سال سے زائد کی نہ ہوگی، صلح حدیبیہ اس مسئلہ میں سب سے بڑی دلیل ہے، جو آپ ﷺ نے قریش کے ساتھ کی تھی، جیسے ہی معاہدہ کی مدت دس سال سے زائد ہو ساری چیزیں جو معاہدہ سے متعلق تھیں وہ بالکل (کالعدم) قرار پائیں گی، اگرچہ مسلمانوں کے مصالح کے پیش نظر سال بہ سال معاہدہ کی تجدید کرنا جائز ہوگا (۱۵۲)۔

دوسرا رجحان معاہدہ کی مدت کی تعیین کے سلسلے میں ہے، اس رجحان کے قائل حضرات کا کہنا ہے کہ معاہدہ کو عارضی کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس کے لئے ایک مدت کی تعیین کردی جائے، چاہے وہ مدت لمبی ہو یا مختصر ہو مگر اس کا مطلب ایک متعین کی پابندی نہیں ہے۔

بلکہ اس سلسلے میں اساس اسلام اور مسلمانوں کا مفاد ہے (۱۵۳)، اس رائے کے قائل حضرات کے دلائل خلاصہ کے طور پر یوں پیش کئے جاسکتے ہیں کہ اللہ تعالی کے قول "**فإذا انسلخ الأشهر الحرم، فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم**" میں جو حکم وارد ہوا ہے وہ عمومی نوعیت کا ہے، اور حدیث میں اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے دس سال کے لئے حدیبیہ کے معاہدہ کے سلسلے میں جو عمل ثابت ہے، اس سے آیت مذکورہ کے حکم عمومی کی تخصیص ہوجاتی ہے، اور تخصیص کا یہ مفہوم اس بات پر بھی محمول ہے کہ مسلمانوں کا مفاد جنگ کی بہ نسبت معاہدہ سے زیادہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اور یہ مفاد جس طرح سے دس سالوں میں حاصل ہوسکتا ہے اسی طرح دس سال سے زائد عرصہ میں یا اس سے کم عرصہ میں بھی حاصل ہوسکتا ہے (۱۵۴)، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ معاہدہ حدیبیہ سے جو بنیادی قاعدہ مستنبط کرنا ممکن ہے، وہ یہ کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان معاہدہ جائز ہے، رہا مسئلہ معاہدہ کی شرائط اور اس کی مدت کا تو وہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے صادر ہونے والے حکم کے تحت آتے ہیں "**أنتم أعلم بأمور**

۱۵۲- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج۸، ص ۴۰۔الشافعی، الام، مرجع سابق، ج۴، ص ۱۰۷۔القلقشندی، صبح الاعشی، مرجع سابق، ج ۱۴، الشوکانی، نیل الاوطار، مرجع سابق، ج۸ ص ۵۲۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۳۶۴ تا ۳۶۵۔

۱۵۳-۱۵۴- الرملی، نھایۃ المحتاج الی شرح المنھاج، مرجع سابق، ج۸، ص ۱۰۱ تا ۱۰۲۔

دنیا کم" (تم لوگ اپنے دنیاوی معاملات کا زیادہ علم رکھتے ہو) چونکہ اصل توجہ مملکت کے مفاد پر ہے، اس لئے منطقی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس مفاد کو آزاد رکھیں، اسے متعینہ مدت کے ساتھ مقید نہ کریں، خاص طور پر مدت کی تعیین کے قائل حضرات میں وہ لوگ بھی شامل تھے جو یکے بعد دیگر ے متواتر طور پر آنے والی مدت کے لئے معاہدہ کی تجدید کے قائل تھے (۱۵۵)۔

دوم- غیر متعینہ مدت کے لئے کئے گئے معاہدے:

گزشتہ سطور میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ (غیر متعینہ مدت کے لئے کئے گئے) معاہدے وہ ہوتے ہیں جن میں معاہدہ کے عارضی ہونے یا دائمی ہونے کی صراحت نہیں ہوتی، فقہاء اور مفسرین کی آراء اسلامی اور غیر اسلامی مملکتوں کے درمیان اس نوع کے انجام دیئے جانے والے معاہدوں کی شرعی حیثیت کے متعلق ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

اس سلسلے میں مفسرین اور فقہاء کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے اس کا سبب دراصل مطلق (غیر متعینہ مدت کے لئے کئے گئے) معاہدہ کی ماہیت اور وہ کس حد تک دائمی معاہدہ سے مختلف ہے اور کس حد تک اس سے میل کھاتا ہے، کے متعلق ہر فریق کے نقطہ نظر کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا سمجھا جاتا ہے، جو لوگ مطلق معاہدوں کو دائمی معاہدوں کی طرح ہی قرار دیتے ہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ معاہدہ کی یہ دوسری قسم ممنوع ہے، اس طرح کہ فقہاء اور مفسرین یہ سمجھتے ہیں کہ مطلق معاہدوں کی صورتحال اس سلسلے میں دائمی معاہدوں کی ہوتی ہے، اس لئے انہیں شرعاً حرام شمار کیا جائے گا، بالخصوص اس وقت جبکہ اسلامی مملکت نے لازمی طور پر مطلق معاہدہ کیا ہو، کیونکہ لزوم ایسی صورتحال میں معاہدہ کو دائمی حیثیت دے دیتا ہے جو شرعاً درست نہیں ہے (۱۵۶)۔

مذکورہ نقطہ نظر کے بالکل خلاف مفسرین اور فقہاء کی ایک دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ

۱۵۵- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۱۱ تا ۵۱۲۔

۱۵۶- دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص: ۳۶۰ تا ۳۶۱۔

معاہدہ کا مطلق ہونا معاہدہ کے دائمی ہونے سے مختلف ہے، گویا دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں، یہاں سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جب معاہدہ کا دائمی ہونا حرام قرار پاتا ہے تو معاہدہ کی مدت کا مطلق ہونا بایں طور کہ اس کی کوئی مدت متعین نہ کی گئی ہو جائز ہے، جب تک اس سے مسلمانوں کو فائدہ ہوتا رہے گا جیسا کہ ارباب حل وعقل کا اندازہ ہوتا ہے، اور جب مصلحت کے تقاضے کو بروئے کار لاتے ہوئے اسے منسوخ کرنا ممکن ہو تو اسے منسوخ کر دیا جائے (۱۵۷)، اس نقطہ نظر کے قائل حضرات اپنے مسلک کی درستگی کی خاطر حدیث سے ثابت شدہ واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تمام مشرکین کے ساتھ جو معاہدے کئے (جیسے کہ آپ ﷺ نے اہل خیبر سے معاہدہ کیا) وہ سب مطلق معاہدے تھے نہ کہ عارضی تھے اور جائز تھے لازم نہ تھے، اس کی دلیل اللہ کے رسول ﷺ کا وہ قول ہے جو اس معاہدے میں شامل تھا "**نقر کم ماشئنا**" (جب تک ہم چاہیں گے آپ حضرات سے کئے گئے معاہدہ کو رہنے دیں گے)، یا آپ ﷺ نے فرمایا: "**ماأقر کم اللہ**" (جب تک اللہ تعالی آپ کو رہنے دے گا)، یا آپ ﷺ کا یہ ارشاد مبارک: "**أنا متی شئنا أخرجناکم منها**" (ہم جب چاہیں گے آپ کو یہاں سے نکال دیں گے)، آپ ﷺ کے اس حکم کی تائید خود آپ ﷺ کے اس فرمان سے ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنی وفات حسرت آیات کے وقت حکم دیا تھا کہ یہود ونصاری کو جزیرۃ العرب سے نکال دیا جائے، جو حضرت عمر بن خطابؓ کے دور حکومت میں عملاً ممکن ہوا (۱۵۸)۔

۳- دائمی معاہدے:

اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکتوں کے ساتھ کئے جانے والے دائمی

۱۵۷-۱۵۸- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام مرجع سابق، ص ۵۱۲ تا ۵۱۳۔ دکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۵۶۔ اور اس کے بعد کے صفحات۔ دکتور محمد صادق عفیفی، الاسلام والمعاھدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۲۴۹ تا ۲۵۶۔

معاہدوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں جو رائے دی جاتی ہے وہی دراصل اسلامی قانون میں معاہدوں کی مدت کے بارے میں مفسرین اور فقہاء کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کی بنیاد ہے، وہ اس طرح کہ ان میں سے ہر فریق کا نظریہ مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات کی اصل نوعیت و ماہیت کے بارے میں ایک دوسرے سے مختلف ہے، لہذا وہ حضرات جو اس کے قائل ہیں کہ اس طرح کے تعلقات کی اصل ماہیت یہ ہے کہ مسلمانوں کی طرف سے غیر مسلموں کو مکمل طور پر دعوت دی جا چکی ہو، اور اسلامی مملکت کو جتنی طاقت وقوت چاہئے تھی وہ مل چکی ہو، تو پھر غیر مسلموں کو اختیار دیا جائے گا کہ وہ یا تو اسلام قبول کر لیں یا قتال کے لئے تیار رہیں، یا نہیں تو انہیں اختیار دیا جائے گا کہ یا تو اسلام میں داخل ہو جائیں نہیں تو جزیہ وقتال کے لئے تیار رہیں، ان حضرات کا کہنا ہے کہ سوائے عقد ذمہ کے دائمی طور پر کوئی معاہدہ کرنا اسلامی قانون میں جائز نہیں ہے، ایسا اس لئے بھی ناجائز ہے کہ دائمی معاہدے میں جہاد ناقابل عمل قرار دینا اور مسلمانوں کی کمزوری کو دوام عطا کرنا لازم آئے گا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایسا کتاب وسنت کے صریح حکم کی خلاف ورزی ہوگی، جیسا کہ اللہ تعالی کے قول "**فإذا انسلخ الأشهر الحرم فاقتلوا المشركين حيث وجدتموهم**" سے اور آپ ﷺ کے ذریعہ کفار قریش کے ساتھ صرف دس سال کی مدت کے لئے کئے گئے معاہدہ سے واضح ہے(۱۵۹)۔

رہی بات ان لوگوں کی جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی بنیاد مصالحت پر ہے جب تک کہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آئے جو جنگ وجدال کی صورتحال پیدا کرے، چنانچہ یہ حضرات معاہدوں کو دائمی مانتے ہیں، وہ اس طرح کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان دائمی طور پر صلح کرنا جائز ہے، بغیر اس کے کہ غیر مسلموں سے جزیہ کا مطالبہ

۱۵۹- رجوع کریں: الدراسة المتعلقة بالاساس الشرعي للعلاقات الخارجية للدولة الاسلامية، اور اسی طرح دیکھیں: الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازھار، (تحقیق) محمد ابراہیم زاید، بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولی، ۱۴۰۲ھ/ ۱۹۸۵ء، ج ۴، ص ۵۶۵۔

کیاجائے(۱۶۰)، یہ حضرات اللہ تعالی کے اس قول "**وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله**" سے مستفاد مفہوم ہے، سے استدلال کرتے ہیں، ان کا استدلال اللہ تعالی کے اس قول سے ہے:"**فإن اعتزلوكم فلم يقاتلوكم والقوا اليكم السلم، فما جعل الله لكم عليهم سبيلا**"، اسی طرح یہ آیت کریمہ "**فما إستقاموا لكم فاستقيموا لهم**" بھی ان کی ایک دلیل ہے، اس کے علاوہ دوسری آیتیں بھی ہیں جو اس رجحان کے حامل افراد کی نگاہ میں اس چیز کو واضح کرتی ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ اس وقت تک دائمی صلح ممکن ہے جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ مصالحت پر قائم رہیں، اور دعوت اسلامی سے اپنی دشمنی ثابت نہ کریں اور نہ ہی اسلامی مملکت کے دشمن کے طور پر اپنی کارکردگی کا اظہار کریں، بلکہ اسلامی مملکت کے ساتھ اسلامی مملکت کے دشمنوں کے خلاف کھڑے رہیں(۱۶۱)۔

مدت معاہدہ کی تعیین سے متعلق آراء کا جائزہ-تحقیق وتنقید:

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں ہمیشہ کے لئے کئے جانے والے معاہدوں کی شرعی حیثیت کی تعیین اور معاہدوں کے لئے متعینہ مدت کی تحدید کے وجوب کی حیثیت کا صحیح اندازہ لگانا اسی وقت ممکن ہے، جب اسلامی مملکت کے ذریعہ غیر اسلامی مملکتوں اور ان جماعتوں سے جو اسلام کے پیروکار نہیں ہیں تعلقات استوار کرنے کی اصل ماہیت کے سلسلے میں مفسرین اور فقہاء کے درمیان پائے جانے والے عمومی رجحانات کا جائزہ لیا جائے، اس سلسلے میں جس نتیجہ تک ہم پہنچے ہیں وہ یہ بتاتا ہے کہ یہ اصول دعوت پر مبنی ہے تاکہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی حالت خواہ پرامن نوعیت کی ہو یا لڑائی کی ہو، اسلامی دعوت کے بارے میں غیر مسلموں کے

۱۶۰- دکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص نمبر ۳۵۶۔

۱۶۱- دکتور محمد اصادق عفیفی، الاسلام والمعاھدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۱۶۱۔ دکتور وھبۃ الزحیلی، آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۴۵۔ محمد ابو زھرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام القاھرۃ، الدار القومیۃ للطباعۃ والنشر، ۱۹۶۴ء، ص ۷۸۔

موقف کے مطابق متعین ہو سکے (۱۶۲)، اس کے علاوہ اس حقیقت کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ اسلامی مملکت کا ذمیوں سے کیا جانے والا معاہدہ جس کے ماتحت اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے معاملات کرتی اور ان سے متعلق امور کو منظّم کرتی ہے، ممکن ہے کہ اسلامی ریاست کے ذریعہ اس کی یکطرفہ مرضی سے جاری کردہ اقدام کی شکل اختیار کرلے، اس صورت میں جب ذمی اسلامی حکومت اور ذمیوں پر مشتمل اتھارٹی کے درمیان لڑائی کے بعد اسلامی حکومت کی ماتحتی اختیار کریں اور کبھی کبھی یہ عہد ذمہ خصوصی معاہدہ کی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے، اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب ذمی یہ مطالبہ کریں کہ انہیں اسلامی مملکت کا شہری اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے تسلیم کرلیا جائے، اور اسلامی حکومت اسے منظور بھی کرلے، اور کبھی یہ عہد بین الاقوامی معاہدہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، جب اسلامی حکومت غیر مسلم ملک کو اس ملک میں قائم نظام اور اسلامی حکومت کے درمیان صلح اور مذاکرات کے طریقے پر کاربند رہتے ہوئے فتح کرلے، وہ اس طرح کہ صلح کے معاہدہ میں غیر مسلم ملک اس بات پر اتفاق کرلے کہ وہ اسلامی حکومت کی پاسداری پر راضی رہے گا، اور جب اسلامی حکومت اپنے دشمنوں سے برسر پیکار ہوگی تو وہ اسلامی حکومت کے ساتھ کھڑا رہے گا، جبکہ بقیہ دیگر افراد اپنے مذہب اور اس کلچر پر کاربند رہیں گے جس پر وہ لوگ فتح مکمل ہونے سے پہلے کاربند تھے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آخری صورت حال کو چھوڑ کر جس میں عہد ذمہ بین الاقوامی معاہدہ کی شکل اختیار کرلیتا ہے، اسلامی مملکت کے ساتھ غیر اسلامی مملکتوں اور جماعت کے تعلقات کو دعوت پر مبنی قرار دینے کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان دیگر تمام دائمی معاہدے حرام قرار پاتے ہیں۔

کیونکہ ایسی صورت حال میں بنیادی مفروضہ یہ ہے کہ دعوت کا کام مسلسل قائم ودائم رہے گا، جب تک وہاں ایسے غیر مسلم رہیں گے جو ایک منظّم سیاسی اتھارٹی کے تابع رہیں، اور ایسا

۱۶۲- رجوع کریں: تاسیس العلاقۃ بین المسلمین وغیرھم فی الدراسۃ المتعلقۃ بالاساس الشرعی والمبادء الحاکمۃ للعلاقات الخارجیۃ للدولۃ الاسلامیۃ۔

اس وقت تک رہے گا جب تک کہ پوری کی پوری آبادی دین اسلام کی طرف لوٹ نہ آئے، اور اسلام کے جھنڈے تلے اور اس کی قیادت وسیادت کے ماتحت زندگی گزارنے کا فیصلہ نہ کرلے۔

گذشتہ سطور کے مفہوم مخالف سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ عارضی معاہدے جائز ہیں، اگرچہ وہ صورت کے اعتبار سے دائمی ہوں، کیونکہ گذشتہ آراء کے ضمن میں جس رائے کی طرف ہمارا میلان ہے، وہ یہ ہے کہ عارضی معاہدوں کی مدت کے سلسلے میں کوئی شرط یا حکم توقیفی موجود نہیں ہے، کیونکہ مدت کی تعیین کا مسئلہ چاہے مدت لمبی ہو یا مختصر اس سربراہ مملکت کی صواب دید پر موقوف ہے جو اسلامی مملکت اور عامۃ المسلمین کے عمومی مصالح کے پیش نظر رکھتے ہوئے اسے طے کرے گا، اس لئے کہ وہ معاہدہ حدیبیہ جو دس سالوں کے لئے کیا گیا تھا اس معاہدہ کو انجام دینے میں اللہ کے رسول ﷺ کا جو طریقہ کار تھا اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ معاہدہ کی مدت کی تعیین کو واجب سمجھتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ کیا جانے والا ہر ایسا معاہدہ جس کی مدت طے کردی گئی ہو جائز ہے، مگر اس سے یہ مستفاد نہیں ہوتا کہ دس سال کی مدت پر اس طرح غور کیا جائے کہ وہ توقیفی مدت ہے جس کی پابندی تمام احوال میں ضروری ہے، اور مسلمانوں کے مصالح سے قطع نظر جو کبھی اس کا تقاضا کر سکتے ہیں کہ اس متعینہ مدت کی پابندی سے (مدت کو کم کرکے یا اس میں اضافہ کرکے) اس سے نکل جانا چاہئے، اس مسئلہ کی مزید وضاحت اس واقعہ سے ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے باوجودیکہ معاہدہ حدیبیہ کی مدت دس سال متعین کردی گئی تھی، معاہدہ کے محض دو سال بعد مشرکین سے جنگ کی، جب ثابت ہوگیا کہ ان کی طرف سے معاہدہ کی دفعات اور اس احکام کی خلاف ورزی کی گئی ہے (۱۶۳)۔

۱۶۳- پچھلا صفحہ نمبر ۵۷ سے مراجعت کریں۔

تیسرا مبحث

تجارتی اور اقتصادی لین دین اسلامی ریاست
کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

تیسرا مبحث

تجارتی اور اقتصادی لین دین اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے دائرہ میں تجارت اور اقتصادی معاملات کی خصوصی اہمیت ہے، اسلام نے تجارت کی ترغیب دی ہے، اور اسلامی سماج کی اندرونی زندگی کی درستگی نیز سماج کے افراد کی ضرورتوں کی تکمیل اور سماج اور دیگر غیر اسلامی سوسائٹیوں کے درمیان تعلقات کی راہ ہموار کرنے کے لئے اسے اہم ضروری انسانی سرگرمیوں میں شمار کیا ہے، اور یہ اس کردار کے پیش نظر ہے جو وہ تجارت اور دیگر معاشی سرگرمیوں جیسے صنعت اور زراعت کو فروغ دینے میں ادا کرتا ہے، ساتھ ہی تجارتی لین دین سے دعوت اسلامی کی تبلیغ کا اور اسلامی ممالک اور دیگر جماعتوں کے درمیان نظام وعقائد کے اختلاف کے باوجود تعلقات کو مستحکم کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے، اور اتنا ہی نہیں اس کے ساتھ نقل وحمل اور مواصلات کے ذرائع میں ہونے والی ترقی اور اس کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان فاصلے کم ہونے کی حقیقت بھی شامل ہے، جبکہ غیر ملکی تجارت سے جڑے مسائل پیچیدہ اور متنوع ہوتے ہیں، جو ان مسائل سے نمٹنے کے لئے متعدد بین الاقوامی معاہدوں میں اسلامی ممالک کے شامل ہونے کا تقاضا کرتے ہیں، ان تمام امور کا تقاضا ہے کہ اسلامی مملکت بین الاقوامی برادری کے ارکان کے ساتھ مشترکہ مفاد کے حصول اور منافع کے تبادلہ کے لئے تعاون وانتظام کے فریم ورک میں شرکت کرے، ان ہی ضروریات نے ان خارجہ تجارت اور اقتصادی لین دین کو ایک ایسا اہم ذریعہ بنا دیا ہے جس کے توسط سے اسلامی مملکت صلح اور جنگ کے مواقع پر غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں سے تعلقات منظّم اور مستحکم کرتے وقت مدد لیتی رہتی ہے۔

فطری طور پر اس وقت جائزہ میں ممکن نہیں کہ اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکتوں کے درمیان اقتصادی معاملات اور تجارتی لین دین کے جو مسائل اور موضوعات ہیں ان سب کا احاطہ کیا جا سکے یہ معاملات خوراک اور لباس کے ضروری تقاضوں سے شروع ہوتے، تحفظ اور سلامتی کے تقاضوں سے گزرتے اور تحسین یا عوامی فلاح و بہبود کے دائرہ کار پر ختم ہوتے ہیں، یہ سارے معاملات زمان و مکان کے احوال و محرکات کے زیر اثر ہوتے ہیں، یا اس سے متعلق جو انسان کی متعدد متنوع اور نہ ختم ہونے والی متجدد تخلیقی صلاحیتوں کی ترقی سے متاثر ہوتے ہیں، یہاں تعامل و تبادل کے سلسلے میں جو کہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کا ایک اہم ذریعہ ہیں، اسلامی شریعت کے ان عمومی قواعد کی تعیین تک محدود ہوگا، جو اس ذریعہ کو اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکتوں اور اسلام کو نہ ماننے والی جماعتوں کے باہمی تعلقات کو منظّم کرنے اور اس کی فعالیت کو منضبط کرتے ہیں، اور ایسا درج ذیل طریقے پر ہوتا ہے۔

پہلا مطلب

اسلام میں بیرون ملک تجارت کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت

متعدد قرآنی آیات جو تجارت کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت پر دلالت کرتی ہیں، چاہے اس کا تعلق اسلامی معاشرہ کے اندرونی تعلقات سے ہو، یا اسلامی ملک اور ان ممالک اور جماعتوں کے باہمی روابط سے جو اسلام کے پیروکار نہیں ہیں، سے اسلامی مملکت کے استوار ہونے والے تعلقات کے ساتھ خاص ہو، جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وأحل الله البيع وحرم الربا**" (اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام)، "**وما أرسلنا قبلك من المرسلين إلا أنهم ليأكلون الطعام ويمشون فى الأسواق**" (اے محمد ﷺ تم سے

پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے ہیں وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے)،"**یأیھاالذین آمنوا، اذا نودی للصلاۃ من یوم الجمعۃ، فاسعوا إلی ذکر اللہ،وذروا البیع، ذلکم خیرلکم، إن کنتم تعلمون، فإذا قضیت الصلاۃ فانتشروا فی الأرض وابتغوا من فضل اللہ**"(اے لوگوں جو ایمان لائے ہو، جب پکارا جائے نماز کے لئے جمعہ کے دن تو اللہ کے ذکر کی طرف دوڑو اور خرید وفروخت چھوڑ دو، یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم جانو، پھر جب نماز پوری ہوجائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو)،"**وضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت آمنۃ مطمئنۃ یأتیھا رزقھا رغدا من کل مکان فکفرت بأنعم اللہ فأذاقھااللہ لباس الجوع والخوف بما کانوا یصنعون**"(۱۶۴)(اللہ ایک بستی کی مثال دیتا ہے وہ امن واطمینان کی زندگی بسر کررہی تھی اور ہر طرف سے اس کو بفراغت رزق پہنچ رہا تھا کہ اس نے اللہ کی نعمتوں کا کفران شروع کردیا تب اللہ نے اس کے باشندوں کو ان کے کرتوتوں کا یہ مزا چکھایا کہ بھوک اور خوف کی مصیبتیں ان پر چھا گئیں)، یہ ساری آیتیں اس بات پر دلالت کررہی ہیں کہ تجارت معاشی سرگرمی کے طور پر ایک مباح عمل ہے، ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت کررہی ہیں کہ تجارت کی کتنی اہمیت ہے اور تجارت کرنیوالے کے لئے اس کا کس قدر نفع ہے؟ اور سماج کا اس میں کتنا فائدہ ہے؟ یہاں تک کہ اسے رسولوں کے کاموں میں شمار کیا گیا، اسی طرح گذشتہ سطور میں مذکور آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ تجارت کا اس طریقے پر فروغ کہ اس کے ذریعہ پرامن اور پرسکون ماحول میں کثیر مقدار میں سامان کی دستیابی اور ان کے حصول پر آنے والے اخراجات کی کم سے کم مقدار کی ضمانت ہونی چاہئے تاکہ سماج کے افراد کے لئے خوشحالی یقینی ہوسکے، اور سماج ترقی سے ہمکنار ہوکر ایک عظیم کارنامہ انجام دے سکے(۱۶۵)، مذکورہ آیتوں میں مزید دو آیتوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے، جس میں

۱۶۴- بالترتیب دیکھیں: سورۃ البقرۃ/ ۲۷۵، سورۃ الفرقان/ ۲۰، سورۃ الجمعۃ/ ۹، سورۃ النحل/ ۱۱۲۔

۱۶۵- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج۱۹، ص ۵۵۔ الالوسی، روح المعانی، فی تفسیر القرآن العظیم

ایک آیت "هو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعا" ہے، اور دوسری آیت "ألم ترأن الله سخرلکم ما فی الأرض جمیعا"(۱۶۶)، دونوں آیتیں یہ واضح کرتی ہیں کہ اللہ تعالی نے کائنات کی تمام چیزیں مخلوق کے کنٹرول میں دیدی ہیں، اور اسے یہ حکم دیا ہے کہ وہ کائنات کے وسائل اور صحت بخش اشیاء سے فائدہ اٹھائے، اور اس حق میں تمام انسان برابر ہیں، اس حوالے سے ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی، اور نہ قوم او رقوم کے درمیان امتیاز برتا جاسکتا ہے، ظاہر ہے یہ سارے مفید کام لوگوں کی صلاحیتوں میں تفاوت اور ان کی ضروریات میں تنوع کی روشنی میں اضافی مال کے تبادلے اور ضروریات کو پورا کرنے کے لئے تجارتی لین دین کو لازم اور ضروری ٹھہراتے ہیں(۱۶۷)۔

اگر ایک طرف اسلام میں شریعت کے طے کردہ حدود وضابطے کے مطابق تجارتی معاملات اور تبادلے کو منظّم کرنے کی افراد انسانی کو پوری آزادی دی گئی ہے، تو دوسری طرف کائناتی اسباب ووسائل کو انسانی کنٹرول میں دینے اور تمام لوگوں کے لئے مقام کے اعتبار سے وسائل وامکانات کی فراہمی کے پیش نظر نیز ایک دوسرے سے فاصلے پر واقع صوبوں اور جگہوں اور ان احوال کو سامنے رکھتے ہوئے جو اسلامی ریاست کے افراد کو ان کے تعدد اور ان کی ضروریات کے تنوع کے لحاظ سے پیش آسکتے ہیں، حصول رزق کے اسباب کو عام کرنے سے متعلق حکمت الٰہی کا یہ تقاضا ہوا کہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام اسلامی مملکت اور غیر اسلامی ممالک اور جماعتوں کے باہمی تجارتی لین دین کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں۔

والسبع المثانی، القاهرة المطبعة المنیریة، د، ت، ج ۱۵، ص ۱۱۷۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۲، ص ۶۳۸۔ ۶۴۰، ج ۳، ص ۲۷۲، ج ۴، ص ۱۵۳۲ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۶۶- سورۃ البقرۃ/ ۲۹، سورۃ الحج/ ۶۵۔

۱۶۷- اس میں دیکھیں: الزمخشری، الکشاف مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۲۱ تا ۱۲۳، ج ۳، ص ۱۶۸ تا ۱۶۹۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، طبعۃ (۱۹۵۲ء) ج ۱، ص ۲۵۱ تا ۲۶۱، ج ۱۲، ص ۹۲ تا ۹۳۔

دوسرے الفاظ میں اسلامی مملکت اور غیر اسلامی ریاست کے درمیان تجارتی تعلقات کے نتیجے میں ہونے والے لین دین سے جو افراد انسانی کی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے، درآمدات کے ذریعہ زندگی کے تقاضوں اور مطالبات میں پیدا ہونے والی کمی کی تلافی ہوتی ہے، اسی طرح منفعت حاصل ہوتی ہے، اور جو مصنوعات صرف اسلامی مملکت میں تیار ہوتی ہیں انہیں ایکسپورٹ کرنے کی وجہ سے منافع حاصل ہوتے ہیں، نیز یہ کہ حفظ نفس، حفظ عمل اور حفظ مال بلکہ دعوت اسلامی کی نشر واشاعت جو اسلامی شریعت کے کلی مقاصد کہلاتے ہیں، کی تکمیل ہوتی ہے، یہ سارے امور تقاضا کرتے ہیں کہ شریعت اسلامی اور غیر اسلامی مملکتوں کے درمیان اقتصادی تعاون اور تجارتی لین دین سے متعلق اباحت کے حکم کو عمومی اصول کا درجہ دے بشرطیکہ یہ شریعت کے ان حدود وضابطوں کے دائرہ میں انجام دیئے جائیں جو مذکورہ امور سے متعلق طے کئے گئے ہیں (۱۶۸)۔

وہ قرآنی آیات جن سے اسلامی مملکت کے لئے خارجہ تجارت کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے، وہ درج ذیل ہیں:

"لاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين"، اسی طرح اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"وضرب الله مثلاً قرية كانت آمنة مطمئنة يأتيها رزقها رغدا من كل مكان فكفرت بأنعم الله فأذاقها الله لباس الجوع والخوف بما كانوا يصنعون"**، فرمان الہی ہے: **"وطعام الذين أوتوا الكتاب حل لكم وطعامكم حل**

۱۶۸- ابوحامد الغزالی، احیاء علوم الدین، القاهرة، ۱۳۳۴ھ، ج ۲، ص ۵۶ تا ۵۸۔ دکتور عبدالکریم زیدان، احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام بغداد، مکتبۃ القدس، ۱۹۸۲ء، ص ۶۲۶۔ دکتور محمد صبحی محمصانی، مرجع سابق، ص ۱۵۳ تا ۱۵۴۔ دکتور محمد صادق عفیفی، الاسلام والمعاهدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۲۲۶ تا ۲۲۷۔
دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۲۷۶ تا ۲۷۷۔ دکتور مجید خدروی، مرجع سابق، ص ۲۹۷۔

لهم''،''**يأيها الذين آمنوا إنما المشركون نجس فلا يقربو المسجد الحرام بعد عامهم هذا، وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله إن شاء**''(۱۶۹)۔

ان آیات سے مجمل طور پر جو حکم مستفاد ہوتا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اس میں پہلی آیت میں جو لفظ ''بر'' ہے وہ اپنے مفہوم کی وسعت کے لحاظ سے اپنے اندر ہدیہ، ہبہ اور بیع وشراء کی شکلوں کو سموئے ہوئے ہے، اور لین دین کی یہ ساری شکلیں غیر مسلموں سے تجارت کی انواع میں شامل ہیں، جیسا کہ دوسری آیت میں بتلایا گیا کہ مذکورہ گاؤں میں ہر جگہ سے رزق آتا تھا، جس سے یہ گنجائش نکلتی ہے کہ آیت مذکورہ کو خارجہ تجارت کے مباح ہونے کی دلیل بنایا جائے، اس لئے کہ وہ مقامات جہاں سے ضروریات کے سامان آنے کا تذکرہ ہے، آیت میں مطلق اور ہر طرح کی تحدید سے آزاد ہیں(۱۷۰)، اسی طرح سے تیسری آیت کا تقاضا ہے کہ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لئے حلال ہے اور مسلمانوں کا کھانا ان کے لئے حلال ہے، تو مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان اقتصادی اور تجارتی لین دین کو مباح قرار دینا زیادہ مناسب اور عمومی احکام کے دائرہ میں ہوگا(۱۷۱)، رہی بات یہ کہ متأخر الذکر آیت میں جو ''نہی'' کا حکم وارد ہوا ہے، جس کا تعلق اس سے ہے کہ مشرکین کو مقدس مقامات میں داخل ہونے سے روک دیا جائے اور مسلمانوں کو اس حکم کے تقاضوں کا پوری طرح پابند بنا دیا جائے، اگرچہ اس کی وجہ سے منافع فوت ہوں اور خسارہ برداشت کرنا پڑے، اور بالآخر مسلمانوں اور مشرکوں کے درمیان تجارتی لین

۱۶۹- بالترتیب یہ دیکھیں: سورۃ الممتحنۃ/ ۸ سورۃ النحل/ ۱۱۲، سورۃ المائدۃ/ ۵ سورۃ التوبۃ/ ۲۸۔

۱۷۰- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۱۰ (طبعۃ ۱۹۵۲) ص ۱۹۴۔ ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۷۴)، ج ۲، ص ۱۵۵۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹ تا ۲۰۔

۱۷۱- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۵، ص ۲۰۔ محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۵ ص ۱۴۹ تا ۱۵۰۔ ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹ تا ۲۰۔ محمد صبحی محمصانی، مرجع سابق، ص ۱۵۴ تا ۱۵۵۔

دین کا خاتمہ ہوجائے، تو اس کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی سرگرمیوں کا تبادلہ اور مشترک اقتصادی منصوبوں میں ان کے ساتھ شامل ہونا جس سے اسلامی مملکت کو فائدہ ہورہا ہو عمل ممنوع نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا خود اس آیت میں مباح سمجھا گیا ہے، جب تک مسلمان اس آیت میں موجود ممانعت کی دفعات پر عمل کرتے رہیں گے، یعنی مسلمان مشرکوں کے ساتھ ایسے تعلقات نہ قائم کرلیں، جن کی رو سے مشرکوں کو اجازت دی جائے یا انہیں اس پر قدرت دے دی جائے کہ وہ مقدس مقامات میں داخل ہوجائیں (۱۷۲)، گذشتہ تفصیلات میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی کے قول "**أولم نمكن لهم حرما آمنا، يجبى اليه ثمرات كل شئ رزقا من لدنا**" سے اور اس قول "**لإيلاف قريش إلفهم رحلة الشتاء والصيف، فليعبدوا رب هذا البيت الذى أطعمهم من جوع وآمنهم من خوف**" (۱۷۳) سے جو عموم اور اطلاق مستفاد ہوتا ہے وہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تجارت کو مباح سمجھا جائے، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان جو تجارتی لین دین ہے اس کے دائرہ کو وسعت دی جائے، اس سے اسلامی مملکت کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ پڑوس کے علاقوں میں پیدا ہونے والے تمام میوہ جات اور دیگر سامانوں کو حاصل کرسکے، نتیجۃً مسلمان دوسروں پر بوجھ یا ان کے محتاج نہ بنیں گے (۱۷۴)۔

۱۷۲- ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۷۴م)، ج ۲، ص ۹۱۲ تا ۹۱۷۔ سید قطب، فی ظلال القرآن، (طبعۃ ۱۹۷۴ء) ج ۳، ص ۱۶۱۸ تا ۱۶۱۹۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاهدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص ۱۵، ابن قیم الجوزیۃ، احکام اهل الذمۃ، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۷۵ تا ۱۷۷۔ دکتور محمد صبحی محمصانی، مرجع سابق، ص ۱۵۵ تا ۱۵۶۔

۱۷۳- سورۃ القصص/ ۵۷، سورۃ قریش۔

۱۷۴- الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۳، ص ۴۲۲ تا ۴۲۳، ج ۴، ص ۸۰۱ ۸۰۰۔ اور وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ سورہ قریش کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے حبشہ والوں کو ہلاک کردیا، جن کا قریش نے سامنا کیا

احادیث کا ذخیرہ بہت سے ایسے شواہد اور واقعات سے بھرا پڑا ہے، جن سے اسلامی مملکت کے اندرون میں یا اسلامی اور غیر اسلامی ممالک اور اداروں کے درمیان تجارت کی اہمیت اور اس کی شرعی حیثیت کا علم ہوتا ہے، روایت سے یہ بات ثابت ہے کہ جب حضرت ثمامہؓ نے (جو کہ اسلام قبول کر چکے تھے) مکہ کے قریش سے گیہوں روک لیا، یہاں تک کہ وہ تنگ آ گئے، اور اللہ کے رسول ﷺ کو اس سلسلے میں لکھا تو آپ ﷺ نے حضرت ثمامہؓ کو ان لوگوں کی طرف گیہوں بھیجنے کا حکم دیا اس موقع پر حضرت ثمامہ نے کہا تھا: اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں ثمامہ کی جان ہے، تمہارے پاس یمامہ کا ایک دانہ بھی نہیں آ سکتا (اور یمامہ مکہ کا دیہات ہے)، جب

تھا، تا کہ لوگ اس واقعے سے عبرت پکڑیں اور قریش سے نرمی برتیں، ان سے زیادہ ہیبت اور احترام کے ساتھ پیش آئیں، یہاں تک کہ قریش کے لئے ان کے سفر میں امن قائم ہو جائے، اور کوئی ان پر حملہ کرنے یا انہیں لوٹنے کی جرأت نہ کرے، جبکہ دیگر لوگ ایسے تھے کہ ان پر حملے کئے جاتے اور انہیں اچک لیا جاتا تھا۔ ابو السعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج ۴، ص ۲۴۰، ج ۵، ص ۹۰۴۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۵، ص ۲۰۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق ج ۲، ص ۱۹ تا ۲۰۔

"آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں، اور اہلِ کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے—" اس آیت سے مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان جائز تبادلے اور اقتصادی لین دین کی مشروعیت ظاہر ہوتی ہے، جب تک کہ وہ اسلامی شریعت کے عام احکام کی حدود میں ہو۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی بیان کی جاتی ہے کہ اہلِ خیبر نے رسول اللہ ﷺ کو بھنی ہوئی بکری (شاۃ مصلیۃ) بطور ہدیہ پیش کی، اور انہوں نے اس کا بازو زہر آلود کیا تھا، تو نبی اکرم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام نے اسے کھانے کا ارادہ کیا، اور آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ آیا انہوں نے اس میں سے وہ چربی نکالی ہے جسے وہ خود حرام سمجھتے ہیں یا نہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی ثابت ہے کہ ایک یہودی نے رسول اللہ ﷺ کی میزبانی کی اور جو کی روٹی پیش کی، اور مسلمان اہلِ کتاب کو بھی اپنا کھانا کھلا سکتے ہیں، بطور احسان، بدلے یا مہمان نوازی کے۔

جہاں تک اُس حدیث کا تعلق ہے: "نہ کسی غیر مؤمن کو اپنا ساتھی بنا، اور نہ تمہارا کھانا کوئی مگر متقی کھائے"، تو یہ حدیث نفل اور استحباب پر محمول ہے، وجوب پر نہیں۔

اور ان تمام باتوں کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اہلِ کتاب کا کھانا اسلامی شریعت کی ممنوعہ اشیاء میں شامل نہ ہو، جیسے شراب وغیرہ۔ اسی طرح دیکھیں: محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، جلد ۵ صفحہ نمبر ۱۴۹ تا ۱۵۰۔

تک کہ آپ ﷺ اجازت نہ دے دیں(۱۷۵)، اسی طرح حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ابوسفیان کے پاس پانچ سو دینار بھیجے، جس وقت قریش قحط سالی کے شکار تھے، تا کہ قریش کے فقراء اور مساکین کے درمیان انہیں تقسیم کر دیا جائے(۱۷۶)، آپ ﷺ کا فرمان ہے: سامان ضرورت لانے والے کو روزی دی جاتی ہے، اور ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار ہوتا ہے، اسی طرح آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''جو غلہ لانے والا، دوسرے شہر سے اناج لاتا ہے، اور اس کو اس دن کی قیمت کے مطابق بیچتا ہے تو اللہ تعالی کے نزدیک وہ شہداء کے مقام پر فائز ہوگا''(۱۷۷)، ظاہر ہے کہ دونوں روایتوں میں ''جالب'' کا مفہوم اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر وہ شخص شامل ہے جو سامان امپورٹ کرے یا اسلامی مملکت کے اندرون میں ایک علاقہ سے دوسرے علاقہ تک اس قسم کی خدمات انجام دے، اسی طرح وہ عملہ بھی شامل ہے جو ان سامانوں کو امپورٹ کرے یا غیر اسلامی ملک سے اسلامی ملک تک یہ خدمات فراہم کرے، اور اس سے بڑھ کر کوئی اور دلیل نہیں ہوسکتی کہ آپ ﷺ نے دوسری حدیث کے اخیر میں اللہ تعالی کا یہ قول ''**وآخرون يضربون في الأرض يبتغون من فضل الله**''(۱۷۸) پڑھ کر سنایا، اسی کے ساتھ حدیث سے یہ بھی ثابت ہے جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے خیبر کے لوگوں کے ساتھ زمین کی کھیتی کے بدلے فصلوں یا پھلوں میں سے ایک حصہ پر معاملہ کیا، اور انہیں اس پر زیادہ قادر اور اہل سمجھا(۱۷۹)، حضرت عبداللہ ہوزی سے روایت ہے کہ ان کی ملاقات مؤذن رسول اللہ ﷺ حضرت بلالؓ سے ہوئی، انہوں نے پوچھا: بلال! اللہ کے رسول ﷺ جس دن سے مبعوث ہوئے اس دن سے وفات تک کا آپ ﷺ کا خرچہ کیسا تھا؟ انہوں نے

۱۷۵-۱۷۶-السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، جلد ۱، صفحہ نمبر ۷۰۔ السرخسی المبسوط، مرجع سابق، جلد ۱۰ صفحہ نمبر ۹۲۔

۱۷۷-۱۷۸-۱۷۹-القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، جلد ۱۹، صفحہ نمبر: ۵۵۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۲۷۸ تا ۲۷۹۔

جواب دیا: آپ ﷺ کے پاس کچھ بھی نہ تھا، میں نے ہی ایسا کیا کہ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی انسان مسلمان ہوکر آتا اور آپ اس کو ننگا دیکھتے تو مجھے حکم دیتے، میں جاتا، قرض لیتا، اور اس کے لئے چادر خریدتا پھر اسے اوڑھاتا اور کھلاتا، یہاں تک کہ ایک آدمی میرے سامنے آیا، جو مشرک تھا، اور کہنے لگا: اے بلال اللہ نے مجھے وسعت دی ہے، میرے علاوہ کسی سے قرض مت لینا(۱۸۰)، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا''، حدیث پاک سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: رزق کے دس حصوں میں سے نو حصے تجارت میں ہیں، جیسا کہ دوسری روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا: سب سے پاکیزہ کمائی ان تاجروں کی کمائی ہے، جو گفتگو کریں تو جھوٹ نہ بولیں، جب امانت ان کے حوالے کی جائے تو خیانت نہ کریں، جب خریداری کریں تو عیب نہ نکالیں، اور جب بیچیں تو تعریف نہ کریں، اور جب ان کے ذمہ کسی کا حق ہو تو دینے میں ٹال مٹول نہ کریں، اور جب ان کا حق کسی کے ذمہ ہو تو اس پر سختی نہ کریں''(۱۸۱)۔

ان تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ آیات واحادیث میں مذکور اطلاق وعموم کا تقاضا یہ ہے کہ تجارت کو مباح سمجھا جائے، اور اسلامی مملکت کے لئے دونوں میدانوں خارجی اور داخلی ہر جگہ برابر تجارتی لین دین کی اہمیت کو یقینی بنایا جائے، بشرطیکہ یہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام کی پابندی کے دائرہ میں ہو، اسی لئے یہ دیکھا گیا ہے کہ مسلمان تجار نے خلفائے راشدین کے زمانہ میں غیر اسلامی ممالک کے ساتھ سامان کے درآمد اور برآمد کی صورت میں تسلسل سے تجارت کی، مگر اس سلسلے میں کہیں سے ان کی نکیر نہیں کی گئی(۱۸۲)، اسی طرح جمہور فقہاء کے

۱۸۰- سنن ابی داود، اور پچھلے مرجع سے مراجعت کریں، جلد نمبر ۲، صفحہ نمبر ۱۵۲ تا ۱۵۳۔ عمدۃ القاراء، مرجع سابق، جلد نمبر ۱، صفحہ نمبر ۱۸۲، ویشیر الی ما روی عن عائشة رضی الله عنها من أن رسول الله ﷺ، اشتری طعامًا من یهودی الی أجل ورهنه درعًا من حدیدٍ.

۱۸۱- المنذری، الترغیب والترہیب، القاہرۃ، مکتبۃ الدعوۃ الاسلامیۃ، د، ت، جلد ۳، صفحہ نمبر: ۲۸۔

۱۸۲- ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، جلد نمبر ۱ صفحہ نمبر ۱۶۶ اور اس کے بعد کے صفحات۔ اور وہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اہلِ میثاق، جو کہ اہلِ حرب (یعنی اسلامی ریاست کے ساتھ جنگی حالت میں رہنے

نزدیک گذشتہ اصولی دلائل میں شامل عموم واطلاق کی تائید پر اجماع ہو چکا ہے، اس طرح کہ مسلمانوں کے لئے کپڑے، غلے اور مکان کی ضرورت کی تکمیل کا ذریعہ صرف یہی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ لین دین کریں جن کے پاس یہ مصنوعات موجود ہیں (۱۸۳)، حتمی تجزیہ کے طور پر

والے) میں سے ایک قوم تھے، انہوں نے حضرت عمر بن خطابؓ کو خط لکھا کہ وہ انہیں اسلامی سرزمین میں تجارت کی اجازت دیں، اور وہ ان سے عشر (یعنی تجارت پر مقرر کردہ ٹیکس) لے لیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ سے مشورہ کیا، تو صحابہ کرام نے اس کی اجازت دینے کا مشورہ دیا۔ پس وہ اہلِ حرب میں سب سے پہلے لوگ تھے جن سے عشر وصول کیا گیا۔ اسی طرح یہ بھی دیکھیں: دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۲۸۳۔ دکتور عبدالکریم زیدان، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۶۲۳ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۱۸۳- موفق الدین ابن قدامہ وشمس الدین ابن قدامہ المقدسی، المغنی والشرح الکبیر، بیروت، دار الکتاب للنشر والتوزیع، ۱۹۸۳ء، ج ۱۰ ص ۵۴۱، ۵۶۴، اور وہ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ اگر کوئی حربی (یعنی دشمن ملک سے تعلق رکھنے والا غیر مسلم) بغیر کسی امان کے اسلامی سرزمین میں داخل ہو اور دعویٰ کرے کہ وہ تاجر ہے، اور یہ رواج عام ہو کہ ان کے تاجر ہمارے یہاں آتے ہیں، تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا جب تک کہ وہ اپنے ساتھ سامانِ تجارت لایا ہو، کیونکہ انہوں نے اس بنیاد پر اسلامی سرزمین میں داخلہ لیا کہ انہیں امن حاصل ہے، یہ اس جیسا ہے جیسے کسی مسلمان کے اشارے پر داخل ہوں۔

اسی طرح امام احمد بن حنبلؒ کے قول کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ: اگر کچھ لوگ سمندر میں سفر کر رہے ہوں اور دشمن ملک کے مشرک تاجران پر غالب آجائیں اور اسلامی علاقوں کا رخ کریں، تو نہ ان پر حملہ کیا جائے گا اور نہ ہی ان سے قتال کیا جائے گا۔ پس جو بھی تجارت کی نیت سے دارالحرب سے دارالاسلام میں داخل ہو، اس سے خرید و فروخت کی جائے گی اور اس سے کسی چیز کے بارے میں باز پرس نہ کی جائے گی۔

"الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، القاھرۃ، ۱۳۲۸ھ، ج ۷، ص ۱۰۲۔ الشیرازی، المھذب، القاھرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۴۳ھ، ج ۲، ص ۲۸۱۔ ابو حامد الغزالی، احیاء علوم الدین، مرجع سابق، ج ۲، ص ۵۸۔ الماوردی، الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ، القاھرۃ، المکتبۃ التوفیقیۃ، ۱۹۷۸ء، ص ۲۹۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔ ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸۔ دکتور عبدالکریم زیدان، مرجع سابق، ص ۶۲۶ اور اس کے بعد کے صفحات۔ دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۹۷ اور اس کے بعد کے صفحات۔ **ویشیر الی أن ثمۃا تجاھا فی الفقه لا یوافق علی توجح المسلمین الی دار الحرب وذلک تجنبًا، لخضوع التجار المسلمین لقانون غیر اسلامی او فتنتھم فی دینھم.** مالک المدونۃ الکبری، (بروایۃ سحنون)، القاھرۃ، ۱۳۲۲ھ، ج ۱۰ ص ۱۰۲ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن رشد المقدمات الممھدات، ج ۲، القاھرہ، ۱۳۲۵ھ، ص ۲۸۵ اور اس کے بعد کے صفحات۔ ابن حزم، المحلی، مرجع سابق، ج ۷، ص ۳۴۹۔

ان سب کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی مملکت اور دیگر غیر اسلامی ممالک کے باہمی تجارتی اور اقتصادی لین دین کے بارے میں عمومی اصول، اسلامی مملکت کے اندرون میں ہونے والے تجارتی لین دین کی طرح اللہ تعالی کے اس حکم "وأحل الله البيع" میں موجود حکم عمومی کے مصداق کے طور پر حلت واباحت پر قائم ہیں، اس لئے ایسی صورتحال میں فطری طور پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی اتھارٹیز کی مرور زمانہ کے ساتھ اس سمت میں ہمت افزائی کی جائے کہ وہ غیر مسلم افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے ساتھ اقتصادی لین دین اور تجارتی تعلقات میں شامل رہیں، اس حوالے سے حقائق اور تاریخی شواہد اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اسلامی حکام نے دارالاسلام کو غیر ملکی تاجروں کیلئے کھولنے، ان کو دیئے گئے داخلے کے اجازت نامہ کا احترام کرنے اور ان کو ان کی رہائش گاہوں اور ان کی سرزمین کے اندر نقل وحرکت کے لئے شریعت اسلامی کے عمومی احکام اور ثابت شدہ تعلیمات کے مطابق تحفظ فراہم کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، فقہاء اور مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے ہر حال میں ضروری ہے کہ وہ غیر اسلامی ممالک کے ماتحت قائم کمپنیوں کو اور دیگر پناہ گزینوں حضرات کو مکمل تحفظ فراہم کرے، یہاں تک کہا گیا ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے جائز نہیں کہ وہ پناہ گزینوں کو بغیر ان کی خواہش کے ان کی حکومت کے حوالے کرے، اگرچہ اس کے ذریعہ کسی مسلم قیدی کی رہائی ممکن ہو رہی ہو، بلکہ اسلامی حکومت کے لئے ایسی صورتحال میں بھی جائز نہیں کہ وہ مملکت میں مقیم کسی پناہ گزیں کو حوالے کرے جب اس پناہ گزیں کو حکومت کی طرف سے دھمکی ملے کہ اگر آپ نے ہمارے شہری واپس نہیں کئے تو ہم آپ کے خلاف جنگ کا اعلان کردیں گے (۱۸۴)۔

سچ یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی لین دین کے کی اباحت نیز بلند اخلاق کے ذریعہ اسلامی مملکت کی بیرونی تجارت کی ترقی اسی طرح اسلامی ممالک کے باہر مسلمانوں کے حسن

۱۸۴- ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مرجع سابق، ص ۶۲۶۔ دکتور محمد صبحی محمصانی، مرجع سابق، ص ۱۵۴ تا ۱۵۵، دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰۔

سلوک نے وسطی ایشیاء، ہندوستان، جنوبی اور مشرقی ایشیا، مشرقی افریقہ اور خط استواء پر موجود افریقی ممالک میں اسلام کو پھیلانے میں اہم رول ادا کیا، یہاں تک کہ یہ کہنا صحیح ہوگیا کہ عالم اسلامی کا رقبہ تجارت اور ثقافتی تعلقات کے توسط سے ان سرحدوں سے آگے بڑھ گیا جو جنگی فتوحات کے نتیجہ میں قائم کی گئی تھیں (۱۸۵)، اس کے علاوہ غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی تبادلے نے اسلامی ریاست کی بیرونی تجارت کے لئے اشیاء اور خدمات کی پیداوار اور بینکاری کے طریقوں کے استعمال سمیت وسیع آفاق کھول دیئے (۱۸۶)۔

دوسرا مطلب

اسلامی ریاست میں بیرون ملک تجارت کے حدود وضوابط

اگر ایک طرف گذشتہ تفصیلات کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے بیرونی تجارت کے حلال وحرام ہونے کی دلیل اسلامی شریعت کے اصولی مصادر میں موجود ہے، نیز یہ کہ معاہدہ وہ ذرائع تشکیل دیتا ہے جن کے توسط سے اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکتوں اور جماعتوں کے درمیان تجارتی لین دین ہوتے ہیں، چاہے یہ لین دین دونوں طرف سے افراد کے ذریعہ کئے جاتے ہوں یا پھر فریقین کی طرف سے متعلقہ حکومتوں کے ذریعہ، تو دوسری طرف یہ بھی تمام صورتوں کے پیش نظر، ضروری ہے کہ وہ خصوصی اور بین الاقوامی معاہدے جو اس طرح کے لین دین کو مکمل کرنے کی خاطر کئے جاتے ہیں، اپنے موضوع اور تمام شرائط واحکام کے اعتبار سے شریعت اسلامی کے عمومی احکام کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں، عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ

۱۸۵-۱۸۶- دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۳۰۵ تا ۳۰۷ اسی طرح دیکھیں، المراجع المشار الیھا فیہ للتدلیل علی ازدھار العلاقات التجاریۃ بین المسلمین وغیرھم وتاثیر ذلک فی نشر الدین الاسلامی۔

غیر اسلامی جماعتوں اور ممالک کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے تبادلہ کو منظّم کرنے کے سلسلے میں اسلامی شریعت کے عمومی احکام کی درج ذیل صورتیں ہیں:

۱-تجارتی اور اقتصادی لین دین میں اسلامی ممالک اور جماعتوں کو ترجیح دینا:

امت اسلامیہ کی صحیح صورتحال اس چیز کا انکشاف کرتی ہے کہ پوری ملت متعدد اسلامی مملکتوں اور اداروں میں بٹی ہوئی ہے، جن میں سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنی قیادت اور آزادی وخودمختاری کو برقرار رکھے ہوئے ہے، بہ شمول ان تمام نتائج اور اثرات کے جن میں سب سے اہم علاقائی بنیادوں پر وفاداری اور قومیت کا رشتہ قائم کرنا ہے، اسی کے پہلو بہ پہلو امت اسلامی اخوت کے اس بندھن میں بھی بندھی ہوئی ہے جس میں یہ سارے ممالک اور ادارے شامل ہیں، اسلامی ممالک میں قانون سازی کے ذرائع بھی ایک سے زائد ہیں، یہاں تک کہ قانون اس حصے کے حوالے سے بھی جس پر اصل ماخذ سے تحقیق کر لی گئی ہے، قانون سازی کا امکان رہتا ہے اور ہر قانون کا دائرہ اس ملک تک محدود ہے، جہاں سے اسے جاری کیا گیا ہے، پھر یہ ہوتا ہے کہ اسلامی مملکتوں کے درمیان قانون سازی اور دائرہ اختیار کے درمیان تنازعہ کی صورتحال پیدا ہو جاتی ہے(۱۸۷)۔

تاہم اسلامی قانون، یہاں تک کہ اسلامی امت کے اندر تکثیریت اور تقسیم کی حقیقت سے متعلق، بہت سے اصولوں سے بھرا ہوا ہے، جو اسلامی ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کو اس طرح منظّم کرتے ہیں جن سے ان کے تعاون اور اتحاد کی گارنٹی ملتی ہے، اور جو بالآخر انہیں یکجہتی کے ثابت شدہ اصولوں تک پہنچا دیتے ہیں، اس سلسلے میں عمومی قاعدہ کا پہلا حصہ یہ ہے کہ بیرونی تجارتی لین دین میں اولیت اور فوقیت مسلمانوں کو دی جائے، اس طرح کہ غیر اسلامی ممالک اور جماعتوں کے ساتھ اس طرح کے تعلقات کی گنجائش صرف ضرورت کے وقت

۱۸۷- دکتور جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ، القاھرۃ، مطبعۃ المدنیۃ، الطبعۃ الاولی ۱۳۰۷ھ/۱۹۸۸ء، ص ۲۷۴ تا ۲۷۵۔

ہو، اور مسلمانوں کے ان عمومی مصالح کے تقاضوں کے مطابق ہوں جن سے ان کی ضروریات کی تکمیل وابستہ ہو، اسلامی ممالک اور ادارے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے، فوائد کے تبادلے اور آپس میں ہم آہنگی اور انضمام کے حصول کے لئے سب سے اہم ہیں، تاکہ ایسا اقتصادی اتحاد وجود میں آئے سرمائے، سامان اور محنت کے عوامل کی منتقلی میں موجود رکاوٹوں کو ختم کرے اور ٹیکس، پیداوار اور کرنسی سے متعلق پالیسیوں میں یکسانیت پیدا کرے، اس کے علاوہ یہ اقتصادی تعاون اسلامی ممالک کے وسائل کا کارگر استعمال اور تمام ممالک اور ریاستوں کے حق میں مسلمانوں کے مفاد اور مصالح کے تکمیل کا بھی ضامن ہے(۱۸۸)۔

اسلامی شریعت کے اصولی مصادر ایسے دلائل اور شواہد سے بھرے پڑے ہیں جو خصوصا اسلامی جماعتوں اور اسلامی ممالک کے درمیان باہمی اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے شروع پر زور دیتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض**"،"**والذين تبوؤا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجرإليهم ولايجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤثرون على انفسهم ولوكان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئک هم المفلحون**"،مختلف اسلامی ممالک کی طرف منسوب افراد کے باہمی تجارتی تعلقات کے سلسلے میں جبکہ حج کے موقع پر ان کی ایک دوسرے سے ملاقات ہو، ارشاد ربانی ہے:"**ليس عليكم جناح أن تبتغوا فضلا من ربكم**" کیونکہ اس زمانے میں یہ بات عام تھی کہ اس موقع پر تجارت ممکن ہی نہیں، اسی طرح اللہ تعالی کا فرمان ہے:"**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض**"،"**وأولوا الأرحام بعضهم أولى ببعض**"(۱۸۹)۔

۱۸۸- دکتور محمد عبدالمنعم عفر، النظام الاقتصادی الاسلامی، د،ن، ۱۳۹۹ھ/ ۱۹۷۹ء، ص ۱۴۹ تا ۱۵۱۔ دکتور محمود محمد بابلی السوق الاسلامیۃ المشترکۃ، بیروت، دارالکتب اللبنانی، ط(۱) ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۳ تا ۱۱۰، ۱۵۷ تا ۱۶۸۔

۱۸۹- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، (طبعۃ ۱۹۵۷م)، ج ۳، ص ۲۵۹ تا ۲۶۱۔

یہ اور دوسری بہت سی آیتیں ہیں جن سے یہ حکم صادر ہوتا ہے کہ تجارتی لین دین، اقتصادی معاملات اور تعاون دینے اور لینے کے سلسلے میں آغاز مسلمانوں سے کی جائے تا کہ اسلامی جماعتوں اور اسلامی ممالک کے عمومی مصالح کی تکمیل ہو سکے، مسلمانوں میں ضرورت مند لوگوں کی حاجت روائی ہو سکے اور وہ نقصانات جو غیر اسلامی جماعتوں اور ممالک سے تعاون لینے کی وجہ سے پیدا ہو سکتے ہوں انہیں دور کیا جا سکے۔

اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**لقد كان لسبأ فی مسكنهم آية جنتان عن يمين وشمال، كلوا من رزق ربكم واشكروا له، بلدة طيبة ورب غفور، فأعرضوا فأرسلنا عليهم سيل العرم وبدلناهم بجنتيهم جنتين ذواتی أكل خمط وأثل وشئ من سدر قليل، ذلک جزيناهم بما كفروا وهل نجازی الا الكفور، وجعلنا بينهم وبين القری التی باركنا فيها قری ظاهرة وقدرنا فيها السير سيروا فيها ليالی وأياما آمنين، فقالوا ربنا باعد بيننا وبين أسفارنا وظلموا أنفسهم فجعلناهم أحاديث ومزقنا هم كل ممزق إن فی ذلک لآيات لكل صبار شكور**''(۱۹۰)۔

ان آیتوں میں اس جانب اشارہ ہے کہ اللہ تعالی نے ملکہ سبا کی مملکت کو سرسبز اراضی

الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج۱، ص ۲۴۵۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کچھ عرب لوگ حج کے دنوں میں تجارت کو گناہ سمجھتے تھے۔ جب عشرہ ذوالحجہ آتا، تو وہ خرید و فروخت چھوڑ دیتے اور ان کے لیے کوئی بازار نہ لگتی۔ وہ ان لوگوں کو جو تجارت کے لیے نکلتے "داج" کہتے، اور ان کو حاجی نہیں سمجھتے تھے۔ لیکن جب اسلام آیا، تو اس نے ان پر سے یہ گناہ کا تصور ختم کیا اور ایسی تجارت کو جائز قرار دیا جو عبادت میں رکاوٹ نہ بنے۔ ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ان سے سوال کیا، مگر انہوں نے جواب نہ دیا، یہاں تک کہ آیت "لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ"... نازل ہوئی۔ پھر انہوں نے اس شخص کو بلایا اور فرمایا: "اب تم حاجی ہو۔" اور حضرت عمرؓ نے فرمایا: " کیا ہماری روزی کا ذریعہ حج کی تجارت کے علاوہ کچھ اور تھا؟" اسی طرح دیکھیں: ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج۱، ص ۲۴۴۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج۱، ص ۱۳۱، ج ۳، ص ۱۲۶، ج ۴، ص ۱۷۶۳ تا ۱۷۶۴۔

۱۹۰- سورۂ سبأ (۱۵ تا ۱۶)۔

جس میں وافر مقدار میں پیداوار ہوتی تھی اور جس کا حاصل کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا بھی آسان تھا سے مالا مال فرمایا تھا، یہ ان کی معاشی ضروریات کے لئے کافی ووافی اور اطمینان بخش تھیں، مگر جب ان لوگوں نے اللہ تعالی کی نعمتوں کی ناشکری کی تو ان کی کھیتی اور درختوں پر ایسی مصیبت آئی کہ پیداوار کم سے کم ہونے لگی، جو ان کی ضروریات کی تکمیل کے لئے ناکافی تھی، اس کی وجہ سے وہ باہر سے سامان درآمد کرنے پر مجبور ہوئے، اللہ تعالی نے انہیں ہدایت دی کہ وہ اس چیز کو ابتداء میں ایسے شہروں میں تلاش کریں جہاں ایمان کا بول بالا ہو اور توحید کی حکمرانی ہو، اس کی دلیل قرآنی آیت: ''**من القری التی بارکنا فیها**'' (یعنی وہ گاؤں جن میں ہم نے برکت دی ہے) سے مستفاد مفہوم ہے، مگر جب وہ لوگ مسلسل نعمتوں کی ناشکری کرتے رہے تو ہر نعمت کو کھو بیٹھے، گویا ہر چیز سے محروم ہوگئے، اور ان کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ خاردار وادیوں کا سفر کریں، اور زندگی کے گزارہ کے لئے اور اپنی قوم کی ضروریات کی تکمیل کے لئے مشقتوں کا سامنا کریں (۱۹۱)۔

گذشتہ تفصیلات میں اتنا اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی کے قول: ''**وتعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**'' میں اس جانب اشارہ ہے کہ اسلامی ممالک اور جماعتوں کے درمیان اقتصادی اور تجارتی لین دین میں تعاون کرنا واجب ہے، کیونکہ ایسا کرنا بھی نیکی کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کام موجودہ وقت میں جبکہ بہت سے معاشی گروہ اور بلاکس قائم ہو چکے ہیں، زیادہ ضروری اور ناگزیر ہوگیا ہے، جن کی موجودگی میں ترقی کرنے اور جن کے مقابلے کی سوائے اس کے کوئی اور سبیل نہیں کہ اجتماعی عمل اور یکجہتی کو فروغ دیا جائے (۱۹۲)۔

۱۹۱- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۱۹، ص ۸۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ۵۳۰ تا ۵۳۵۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۳، ص ۵۷۵ تا ۵۷۸۔ ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج ۴، ص ۳۴۵ تا ۳۴۸۔ اور اسی طرح دیکھیں: دکتور عبدالمنعم عفر، مرجع سابق، ج ۴، ص ۵۶ تا ۵۷۔

۱۹۲- ابن کثیر تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۴، ص ۳۳۷ تا ۳۳۸، ۳۵۷ تا ۳۵۸۔ محمد رشید رضا، تفسیر

رہی بات سنت کی تو یہ ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مؤمن مؤمن کا آئینہ ہوتا ہے اور مؤمن مؤمن کا بھائی ہوتا ہے اس کی جائیداد کی حفاظت کرتا ہے، اور پیچھے سے اس کے لئے کھڑا رہتا ہے''، ''مومن مومن کے لئے اس عمارت کی طرح ہے جس کے اجزاء آپس میں پیوست ہوتے ہیں''، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''مومن جب تک اپنے بھائی کی مدد کرتا ہے اللہ تعالی اس وقت تک اس کی مدد کرتا رہتا ہے''، اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''مومن کی مثال آپس میں محبت کرنے اور ایک دوسرے پر رحم وکرم کرنے کے سلسلے میں ایک جسم کی ہے، جس کے کسی ایک عضو کو اگر تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم بخار اور بے خوابی سے کراہ اٹھتا ہے'' (۱۹۳)۔

یہ دوسری قسم کی روایتیں بھی مسلمانوں سے تجارتی اور اقتصادی تعلقات کے آغاز پر زور دیتی ہیں، ایسا اس لئے کہ یہ شرعا بھی درست نہیں اور عقلا بھی متصور نہیں کہ ایک جسم جس کے اپنے کچھ اجزاء بکھرے ہوئے ہوں وہ توانائی اور غذائی وسائل کسی اور جسم تک کیسے پہنچا سکتا ہے، اس سے تو خود اس جسم کے دیگر اعضاء نقصان اور محرومی سے دوچار ہوجائیں گے۔ یہی صورت حال اس وقت بھی اٹھ کھڑی ہوگی جب ضرورت مند اسلامی ممالک کی ضرورتوں کو نظر انداز کر کے امداد وتعاون کا پورا رخ غیر مسلم ممالک اور اداروں کی طرف پھیر دیا جائے گا، اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علاحدگی سے اس جسم واحد کے اعضاء جس کی نمائندگی اسلامی مملکت کی شکل میں ہوتی ہے، مزید بکھر جائیں گے اور ٹوٹ پھوٹ کے شکار ہوجائیں گے، بلکہ اس کی وجہ سے اس جسم واحد ہی کا خاتمہ ہوجائے گا، اور صورت حال مکمل اس کے برعکس ہوگی، اگر تعاون کا یہ سلسلہ اور تجارتی لین دین کا یہ معاملہ اسلامی ممالک کے درمیان ہو، ایسی صورت میں اس بات کا

المنار، مرجع سابق، ج ۵، عدد ۲۶، ص ۱۰۷۔

۱۹۳- کنز العمال، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۴۱ صحیح البارری، مرجع سابق، صحیح مسلم، مرجع سابق، ج ۶، ص ۱۳۹ تا ۱۴۱۔ السیوطی، الجامع الصغیر، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۵۵۔

امکان ہے کہ امت مسلمہ کو درپیش مسائل اور ان کو لاحق نقصانات کا خاتمہ ہوجائے، اس کے نتیجہ میں پوری امت ترقی کر کے ایک طاقتور قوم کی سطح پر پہنچ جائے گی اور مستحکم پوزیشن حاصل کرلے گی (۱۹۴)۔

اس کے علاوہ آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت منذرؓ کو خط لکھا یہ کہتے ہوئے کہ میں نے قدامہ اور ابوہریرہؓ کو آپ کے پاس بھیجا ہے، آپ ان دونوں کو جو کچھ آپ کے پاس آپکی زمین کا جزیہ جمع ہوا ہے دیدیں (۱۹۵)، اسی طرح حضرت عمرؓ سے ثابت ہے کہ جب بھوک مری عام ہوئی، اور اہل حجاز قحط سے متاثر ہوئے تو انہوں نے شہروں میں تعینات گورنروں کو خط لکھ کر ان سے تعاون کی اپیل کی، چنانچہ تسلسل کے ساتھ لوگوں نے مدد کی، ابوعبیدہ بن جراحؓ چار ہزار سواریوں پر مشتمل غلہ لے کر آئے، حضرت عمرو بن العاصؓ نے بحر احمر کو درست کرادیا، اور اس کے راستہ سے غلہ مدینہ بھیجا، نتیجہ یہ ہوا کہ بحران ختم ہوگیا، ملک کا بھلا ہوا، اور اللہ تعالی نے بندوں کو دوبارہ زندگی عطا کی (۱۹۶)، اس کاروائی کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک امداد پہنچانا جائز ہے، باوجودیکہ اس زمانہ میں اسلامی شہر کم تھے، اور معاش کا معیار قریب قریب ایک جیسا تھا، اسی طرح خوشحالی اور تنگدستی کا معاملہ بھی یکساں تھا۔

تو ایک رائے یہ ہے کہ آج عالم اسلام کی جو عمومی صورتحال ہے وہ یہ ہے کہ امت اسلامیہ مالدار ممالک اور غریب ممالک کے خانوں میں بٹ چکی ہے، جو بالکل ابتدائے اسلام کی صورتحال سے مختلف ہے، لہذا ایسی صورتحال میں اسلامی ممالک کے درمیان باہمی امداد کی منتقلی کو ایک لازمی اور ناگزیر مسئلہ قرار دیا جائے گا (۱۹۷)۔

۱۹۴- دکتور محمد الشحات الجندی، قواعد التعبۃ الاقتصادیۃ فی القانون الدولی والفقہ الاسلامی، القاھرۃ، دار النھضۃ العربیۃ، ۱۹۸۵م، ص ۲۱۲۔

۱۹۵- محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۸۷۔

۱۹۶- ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ، قاھرہ، المطبعۃ الازھریۃ، الطبعۃ الاولی، ۱۳۰۱ھ، ج ۲، ص ۳۷۳ تا ۳۷۴۔

۱۹۷- دکتور محمد الشحات الجندی، مرجع سابق، ص ۲۲۰۔

سابقہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ گذشتہ سطروں میں مذکور آیات، احادیث اور اسلامی حکومتوں کے عملی نمونے اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ تجارتی، اقتصادی تعلقات کے قیام اور اس کے دائرہ کار کو وسعت دیتے وقت ترجیح مسلمانوں کو دی جائے گی، اسی طرح خارجی امداد اور تعاون کے سلسلے میں بھی مسلمانوں ہی کو اولیت حاصل ہوگی۔

اس کے بہت سے مظاہر اور شواہد ہیں کہ اسلامی مملکت جبکہ اس کی تعداد ایک سے زائد ہو، اسلامی قانون پر عمل کرتے ہوئے تجارتی لین دین اور غیر ملکی اقتصادی معاملات میں مسلمانوں کو ترجیح دے سکتی ہے، اس سلسلے میں جو پہلی چیز ذہن میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک کے درمیان اجتماعی ذمہ داری، یکجہتی اور باہمی انحصار کے اصول پر عمل پیرا ہونا چاہئے، وہ اس طرح کہ اسلامی ممالک کے سربراہان اور افراد خود کو اپنے اور دنیا کے باقی اسلامی ممالک کا ذمہ دار سمجھیں، کیونکہ اللہ تعالی کے حقوق اور فرد کے حقوق سے متعلق احکام کے سلسلے میں جماعت پر عائد ذمہ داریاں، وہ صرف ایک حکومت کی سرحدوں میں مقید جماعت تک محدود نہیں بلکہ اپنے مفہوم کی وسعت کے لحاظ سے پوری امت مسلمہ کو محیط ہیں (۱۹۸)، اسلامی حکومتوں کی اجتماعی ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے درمیان سماجی برابری ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ممالک مالی فرائض سے متعلق لین دین کے تعلقات میں زکاۃ پر کاربند رہیں (یعنی اس کی صحیح وصولی ہو اور وہ صحیح مصرف میں خرچ ہو)، جسے اللہ تعالی نے شرعی عبادتوں کی سطح پر قائم رکھتے ہوئے اپنے تقرب کا وسیلہ، نعمت کے شکرانہ کے طور پر واجب کی ادائیگی کا ذریعہ، اور دولت کو زوال سے بچانے کا آلہ بنایا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وإذتأذن ربكم لئن شكرتم لأزيدنكم ولئن كفرتم إن عذابى لشديد**''، اسی طرح رب کریم کا فرمان ہے: ''**كيلا يكون دولة بين الأغنياء منكم**''، ''**والذين يكنزون الذهب والفضة ولا ينفقونها فى سبيل الله فبشرهم**

۱۹۸- دکتور جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۲۷۵۔

بعذاب أليم يوم يحمى عليها فى نار جهنم فتكوى بهاجباههم وجنوبهم وظهورهم هذا ماكنزتم لأنفسكم فذوقوا العذاب بما كنتم تكنزون"۔

آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: جو دینار یا سونے چاندی کے بغیر ڈھلے ہوئے ڈلے جمع کرلے اور اسے اللہ تعالی کے راستہ میں خرچ نہ کرے تو اسے ذخیرہ اندوزی سمجھا جائے گا، جس کے ذریعہ قیامت کے دن اسے داغا جائے گا، اسی طرح آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: جب مسلمان ضرورتمند ہوں تو پھر مال پر کسی کی ملکیت نہیں ہوتی ہے، ارشادنبوی ﷺ ہے: میں تمہارے پاس صرف خیر لے کر آیا ہوں، میں تمہارے پاس اس غرض سے آیا ہوں کہ تم صرف ایک اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور اپنے مالداروں سے مال لو اور اسے فقراء کی طرف لوٹاؤ" (۱۹۹)۔

تمام احادیث وآیات جنہیں گذشتہ سطروں میں درج کیا گیا، وہ اسلامی مملکت پر ایک سے زائد ہونے کی صورت میں جیسا کہ موجودہ وقت کا نظام دیکھنے کو مل رہا ہے، لازم کرتی ہیں کہ وہ باہمی امداد کے لئے اٹھ کھڑے ہوں، اور اپنے سرمایہ اور وسائل کو اصلا تمام مسلمانوں کی ملک سمجھیں، اس طرح کہ سرمایہ کے اعتبار سے مالدار ممالک محفوظ اموال کی زکاۃ نکالیں ان اسلامی ممالک کے لئے جو تنگدستی اور فقر کی زندگی جینے پر مجبور ہیں، اور خیرات، امداد، اور امداد کی وہ رقوم جو مالدار ممالک کی ضرورت سے زائد ہوں، سب سے پہلے ضرورت مند اسلامی ممالک کی طرف بھیجی جائیں، بشرطیکہ زکاۃ اور امداد کی رقوم کسی بینک یا فنڈ میں جمع کردی جائیں، جیسے اسلامک ڈپلومنٹ بینک جو اسلامی کانفرنس تنظیم کے ماتحت ہے، اس طرح کہ زکاۃ کی یہ ساری رقوم ایک منظّم ادارہ جاتی فریم ورک کے اندر ترقیاتی ضروریات کے مطابق غریب اسلامی ممالک کے

۱۹۹- سورۃ ابراھیم/ ۷، سورۃ التوبۃ/ ۳۴ تا ۳۵، اور یہ دیکھیں: ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۷۴ء)، ج ۲ ص ۹۲۸ اور اس کے بعد کے صفحات۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۸ ص ۱۱ تا ۱۲۔ اسی طرح دیکھیں: السیوطی، الجامع الصغیر، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۵۶، مرجع سابق، کنز العمال ۱/ ۳۱۔

درمیان خرچ کردی جائیں، اس کے علاوہ مذکورہ بالا آیات اور احادیث اس طرف بھی اشارہ کرتی ہیں کہ اسلامی ممالک اقتصادی آزادی حاصل کریں، اور غیر مسلموں پر معاشی انحصار کے بندھن سے چھٹکارا پانے کے لئے محنت کریں، تاکہ مسلمانوں کو سیاسی فیصلہ سازی کی آزادی ملے، اور کسی بھی ایسی بیرونی جارحیت کے خلاف جو مسلمانوں کی دولت اور وسائل کو نشانہ بنائے متحد ہونا ممکن ہو سکے۔ ان وسائل پر اسلامی ممالک کی خودمختاری کو یقینی بنانے اور مسلمانوں کی مشترکہ مصالح میں ان کی سرمایہ کاری کے لئے یکجہتی اور اتحاد کافی ہے(۲۰۰)، اسلامی ممالک کے لئے سماجی برابری اور یکجہتی پر کاربند رہنے کے ضمن میں اس پہلو کی طرف اشارہ کرنا زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے کہ اگر ایک اسلامی ملک کے مالدار حضرات غریبوں کے مالی حقوق ادا کرنے سے غفلت برتیں گے تو ایسی صورت میں حکومت مداخلت کرتے ہوئے انہیں مجبور کرے گی کہ وہ ان کے مالی حقوق ادا کریں، جس طرح حضرت ابوبکرؓ نے ارتداد کی جنگ میں مانعین زکاۃ سے قتال کیا، یہ خیال کہ متعدد خودمختار اسلامی ممالک کے درمیان اس پر عمل کرنا دشوار ہے امیر ممالک کے لئے کوئی ایسا راستہ اور سہارا نہ بنے جس سے ان کے لئے گذشتہ آیات وروایات کے احکام کے تقاضوں کے مطابق غریب اسلامی ملک سے متعلق اپنی ذمہ داریوں سے پہلوتہی کا بہانہ نہ بن جائے(۲۰۱)۔

بیرونی تجارت اور اقتصادی تعلقات کے میدان میں مسلمانوں کو ترجیح دینے کے حوالے سے ایک دوسرا پہلو بھی ہے، اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ممالک میں ان کے درمیان تجارتی ترجیحات کے ایک جامع عمومی نظام کا ہونا ضروری ہے، تاکہ افراد کی نقل وحرکت

۲۰۰- محمد ابوزھرۃ، الوحدۃ الاسلامیۃ، بیروت، دار الرائد العربی، ۱۹۹۰م، ص ۳۰۱ تا ۳۰۳۔ عبدالحق الشکبری، التنمیۃ الاقتصادیۃ فی المنھج الاسلامی، کتاب الامۃ عدد(۱۷) ط ۱ رجب ۱۴۰۸ھ/ فبریر ۱۹۸۸م، ص ۶۰ تا ۶۱، ۹۰ تا ۹۶۔ دکتور جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۳۷۵ تا ۳۷۶۔

۲۰۱- عبدالحق الشکری، مرجع سابق، ص ۹۲۔

اور سرمایہ کی منتقلی سے متعلق پابندیوں اور رکاوٹوں کو دور کیا جا سکے، پھر اسلامی اقوام و افراد کو روزگار، ملازمت، تجارت اور سرمایہ کاری کے مواقع میں ترجیح دی جائے، اور اسلامی ممالک اس مقصد کو حاصل کر سکیں جسے عصری معاشی لغت میں ''اجتماعی خود انحصاری'' کہا جاتا ہے، نیز ان ممالک کے درمیان وہ چیز پیدا ہو جائے جسے عصری اقتصادی تعلقات میں ''مشترک منڈی'' کہا جاتا ہے، جس میں اسلامی ممالک کی سرزمین پر پیداواری عوامل کی نقل وحرکت پر کسی طرح کی پابندی یا رکاوٹ نہ ہو، اسی طرح اس کے نتیجہ میں تمام اسلامی اقوام کو یہ موقع مل جائے کہ وہ بہ آسانی اپنی ضروریات کے سامان اور خدمات حاصل کر سکیں بغیر کسی تکلیف کے اور مشقت کے (۲۰۲)، اس سلسلے میں بعض حضرات کی رائے ہے کہ ٹیکس اور اس کی دوسری صورتیں ذخیرہ اندوزی ہی کی ایک قسم ہے، جو اللہ کے رسول ﷺ کے قول ''ذخیرہ اندوزی کرنے والا گنہگار رہوتا ہے اور منڈی میں مال لانے والے کو روزی ملتی ہے'' کی خلاف ورزی تک پہنچا دیتی ہے، اسی طرح بعض کا یہ کہنا ہے کہ دار الاسلام میں مسلمانوں کی مصنوعات پر فیس کی وصولی اسلام کی سرزمین میں مسلمانوں کے حقوق کے ساتھ ناانصافی اور ظلم ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس صورت میں انتشار اور تقسیم کی وہ صورت حال برقرار رہتی ہے، جس کا سامنا اسلامی امت آزاد اور خودمختار ریاستوں کی صورت میں ایکدوسرے کے مدمقابل کر رہی ہے، چنانچہ ماوردی کی رائے ہے کہ دار الاسلام میں ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل کئے جانے والے سامان پر عائد کیا جانے والا ٹیکس حرام ہے، شریعت نہ اسے مباح سمجھتی ہے، نہ اجتہاد کی رو سے اس کی کوئی گنجائش ہے، نہ یہ ملکی پالیسیوں کا حصہ ہے اور نہ اس میں کوئی انصاف ہے (۲۰۳)۔

۲۰۲- دکتور محمود بابلّی، مرجع سابق، ص ۱۵۷، اور اس کے بعد کے صفحات۔ محمد ابوزھرۃ، الوحدۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۳۰۴ تا ۳۰۵، عبدالحق الشکبری، مرجع سابق، ص ۱۵۴ تا ۱۵۵، دکتور جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۲۷۶۔

۲۰۳- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۲۸۔ محمد ابوزھرۃ، الوحدۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۳۰۷۔

اگر ایک اسلامی شریعت کے عمومی احکام اسلامی ممالک کو بالخصوص ان بڑے معاشی بلاک کے ہوتے ہوئے جو ہماری موجودہ دنیا میں امتیازی حیثیت کے مالک ہیں، پابند بناتے ہیں کہ وہ ایک جامع اقتصادی اتحاد کے لئے تعاون، ہم آہنگی اور مشارکت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے مثبت اقدامات کریں، تو دوسری طرف علماء نے اسلامی ممالک کی مطلوبہ اقتصادی نشاۃ اور اس کے جامع اتحاد کی شرائط کے طور پر متعدد امور کو بڑی اہمیت دی ہے۔ لہذا ان کے مطابق سب سے پہلے ہمیں دنیا بھر کے تمام مسلمانوں کے درمیان اسلامی اخوت کے رشتے کو مضبوط کرنا چاہئے، وہ اس طرح کہ مسلمان شہری جب اپنے ملک سے چاہے وہ اسلامی ہو یا ایک ایسا ملک ہو جہاں وہ معاہدہ کے تحت رہائش پذیر ہو یا ایک ایسا ملک ہو جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہو، نکل جائے اور دوسرے کسی اسلامی ملک میں منتقل ہو جائے، اور وہ اس دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دے تو اسے اس ملک کی شہریت دی جائے گی، دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ کسی بھی مسلمان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک اسلامی میں بغیر کسی قید وشرط کے شہریت اختیار کرے، سوائے اس صورت کے کہ وہ متعلقہ اسلامی ملک میں ایک محدود مدت کے لئے ہی قیام پذیر ہو۔

یہ آخری تجزیہ موجودہ وقت میں اسلامی ممالک کے ایک دوسرے کے ساتھ تعلقات کے حوالے سے اسلامی اخوت اور قومیت کے بندھن کے درمیان موجود اختلافات کی شدت کو ختم کرنے یا کم از کم اسے کم کرنے کا باعث ہے(۲۰۴)، اس کے علاوہ اسلامی ممالک کے درمیان علمی اور انسانی ہجرت کی بغیر کسی رکاوٹ کے اجازت ہونی چاہئے تاکہ تمام میدانوں میں انسانی قابلیتوں اور تجربوں کا تبادلہ ممکن ہو، ساتھ ہی انسانی صلاحیتوں کو بہتر طریقے سے استعمال کرنا بھی ممکن ہو، اس میں مسلمانوں کا عمومی فائدہ مضمر ہے، اور اس کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی مہارت کے عنصر سے کام لیا جائے، اور غیر اسلامی ماہرین سے استفادہ نہ کیا جائے سوائے اس

۲۰۴- دکتور جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ج۹، ص۲۸۷، دکتور محمود بابلّی، مرجع سابق، ص۱۲۰۔

کے جب بالکل ضروری ہو اور پوری طرح ان پر نگرانی اور کنٹرول ہو، مندرجہ بالا تفصیلات کے علاوہ، اس بات کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ اسلامی ممالک میں اقتصادی ادارے اپنے سرمایہ اور ملازمین کے اعتبار سے خالصتا اسلامی ادارے ہوں بالخصوص تیل کی کمپنیوں جیسے بڑے اداروں کے لئے اسلامی ہونا ہر حال میں ضروری ہے (۲۰۵)، نشاۃ ثانیہ اور اسلامی ممالک کے لئے مطلوبہ جامع اقتصادی اتحاد کی شرائط کے ضمن میں ایک دوسری شرط بھی ہے جس کی رو سے خوراک کی پیداوار اور مقامی طور پر (یعنی مسلمان ممالک میں اور خود ان کے درمیان) خوراک کی فراہمی کے معاملے کو بہت اہمیت دینے کی ضرورت پڑتی ہے، تاکہ ایک طرف خوراک کے وسائل کی عالمی قیمتوں میں بڑے پیمانے پر ہونے والے اضافے کا مقابلہ کیا جا سکے، اور دوسری طرف اسلامی ممالک کو اس دباؤ سے محفوظ رکھا جا سکے تو پولرائزیشن اور تسلط قائم کرنے کے مقصد سے خوراک کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے سے پیدا ہوتا ہے (۲۰۶)۔

اسی طرح ایک اہم اور بنیادی شرط ہے جس کا خیال رکھنا ضروری ہے، جب اسلامی ممالک اپنی ترقی، اشتراک اور جامع اقتصادی اتحاد کے حصول کی کوشش کریں، اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ اگر ایک طرف عمومی شرعی فرض کو انجام دینے کے لئے کام میں مہارت حاصل کرنے اور مقدار و معیار کے اعتبار سے پیداوار کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، نیز اس حوالے سے انتہائی درست، مناسب اور جدید ترین ذرائع پر عمل مطلوب ہے جسے معاصر غیر ملکی زبان میں ٹکنالوجی کہا جاتا ہے، اور اس صورت میں ضرورت ان ذرائع کو غیر اسلامی ممالک سے منتقل کرنے کی متقاضی ہو سکتی ہے، دوسری طرف ان حالات میں اسلامی ماحول کی خصوصیت کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے، اسی طرح کہ وہ ذرائع اسلامی سماج کے حالات و ضروریات سے ہم آہنگ ہوں، بشرطیکہ یہ سب سے تنگ حدود میں ہوں اور ضرورت کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوں اور

۲۰۵- محمد ابوزہرۃ، الوحدۃ الاسلامیۃ، مرجع سابق، ص ۳۰۵ تا ۳۰۶۔

۲۰۶- عبدالحق الشکیری، مرجع سابق، ص ۱۳۵ تا ۱۳۹۔

ایسی ٹکنالوجی کی تشکیل کے لئے اسلامی ممالک کی مستعد کوششوں کے ضمن میں ہوں، جو اسلامی ممالک کے حالات سے میل کھاتی ہوں، تاکہ انہیں ان کی بیرونی ممالک سے امپورٹ نہ کرنا پڑے، جو ان کو اپنی اقدار اور مفادات مسلط کرنے کے لئے سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرکے اسلامی ممالک کی زائد دولت پر قبضہ کرنے کا ایک ذریعہ بنا لیتے ہیں (۲۰۷)۔

۲-غیر مسلم ممالک کے ساتھ اقتصادی لین دین اور تجارتی تعلقات کے درست ہونے کی ایک اساسی شرط یہ ہے کہ اس سے اہل اسلام کے عمومی مصالح کی تکمیل ہوتی ہو:

اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ غیر اسلامی جماعتوں اور ممالک کے ساتھ اقتصادی تعلقات اور تجارتی لین دین کی اباحت کے پس پردہ جو اسباب ومحرکات ہیں، ان کا حاصل یہ ہے کہ اس طرح کے تعلقات کی اجازت صرف اس لئے دی گئی ہے کہ ان کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کے بنیادی منافع اور مصالح کی تکمیل ہو سکے، جس کے نتیجہ میں دعوت اسلامی کے لئے زمین ہموار کی جا سکے، اور اسلامی ملک کی زائد مصنوعات برآمد کی جا سکیں، نیز مسلمانوں کے ہاں جن چیزوں کی کمی ہے ان کی تلافی کے لئے ضروری اشیاء درآمد کی جا سکیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ غیر مسلموں کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی لین دین کی اباحت اسلامی شریعت کے بلند ترین اصولوں کے دائرہ میں اسلامی مملکت سے دفع مضرت اور جلب منفعت پر منحصر ہے، جو دلیل ہے غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی لین دین کی مشروعیت کی بشرطیکہ وہ مسلمانوں کے مفاد میں ہو، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے کہ ایک مشرک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بکریاں لے کر آیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا یہ بطور بیع ہے یا بطور عطیہ یا آپ ﷺ نے فرمایا: بطور ہبہ؟ اس نے کہا کہ نہیں بلکہ بطور بیع ہے تو آپ ﷺ نے ان میں سے ایک بکری خرید لی (۲۰۸)، اسی

۲۰۷- عبدالحق الشکیری، مرجع سابق، ص ۱۳۵ تا ۱۳۹۔

۲۰۸- صحیح البخاری، مرجع سابق، ج ۳، ص ۱۰۵۔ البیھقی، السنن الکبری، حیدرآباد، مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۳۵۳ھ، ج ۱، ص ۲۱۵۔

طرح مسلمانوں نے اہل نوبہ کے ساتھ ایک معاہدہ کیا، جس میں اس بات پر اتفاق کیا گیا کہ نوبہ کے لوگ مسلمانوں کو آٹا دیں گے، اور مسلمان انہیں کھانا دیں گے (۲۰۹) جیسا کہ یزید بن حبیب سے ان کا قول مروی ہے: ''اہل مصر اور اسوادکے درمیان کوئی عہد و پیمان نہیں ہے بلکہ ہمارے اور ان کے درمیان ایک صلح ہوئی ہے، ہم انہیں کچھ گندم اور دال دیتے ہیں، اور وہ ہمیں آٹا دیتے ہیں، اور اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم ان سے آٹا خریدیں'' (۲۱۰)۔

غیر اسلامی جماعتوں اور ممالک کے ساتھ اقتصادی لین دین کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے جب کہ وہ خوش حال ہو جائز ہے کہ غیر اسلامی ممالک کا تعاون کرے چاہے قرض کی شکل میں ہو یا عطیہ کی شکل میں، بالخصوص جبکہ غیر اسلامی ممالک اہل کتاب کے زیر اثر ہوں، کیونکہ اس صورت میں اسلامی قانون کی اصل روح پر عمل کیا جا رہا ہے، اس طرح کہ اسلام کا قانون عالمگیر ہے، اور اس کا ہدف پوری نوع انسانی کی بھلائی ہے، اسی طرح انسانی اخوت کو بروئے کار لانا بھی اس کے پیش نظر ہے، اس کی نظر میں فقر و تنگدستی کے حوالے سے مسلم اور غیر مسلم کے درمیان امتیاز درست نہیں، یہاں دونوں ہی انسان سمجھے جاتے ہیں، اور اللہ کی رحمت چونکہ عمومیت کی حامل ہوتی ہے، اس لئے اسے مسلمان کے ساتھ خاص کر کے غیر کو اس سے محروم کرنا نامناسب نہیں، اس حکم کی اصل اللہ تعالی کی بیان کردہ ان ہدایات میں موجود ہے:

''لاينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين، ولم يخرجوكم من ديارکم أن تبروهم وتقسطوا اليهم إن الله يحب المقسطين'' (اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے اللہ انصاف کرنے والوں

۲۰۹-۲۱۰-ابو عبید القاسم، الاموال، بن سلام، الاموال، (تحقیق) محمد خلیل هراس، القاهرة، دار الکفر، ۱۳۹۵ھ، / ۱۹۷۵م، الطبعة الثانية، ص ۱۹۳، البلاذری؛ فتوح البلدان، (تعلیق) رضوان محمد رضوان، القاهرة، مطبعة السعادة، ۱۹۵۹م، ص ۷۵۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۲۸۰-۲۸۲۔

کو پسند کرتا ہے)،''إنما الصدقات للفقراء والمساكين''(یہ صدقات تو دراصل فقیروں اور مسکینوں کے لئے ہیں)،''ویطعمون الطعام علی حبه مسكينا ويتيما وأسيرا'' (۲۱۱)(اور اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں)۔

مذکورہ تمام آیتوں میں عموم اور اطلاق ہے نہ کہ تخصیص اور تقیید، اس لئے ''الذين لم يقاتلوكم''میں وہ مذاہب وادیان شامل ہیں جنہوں نے مسلمانوں سے جنگ نہیں کی اور نہ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کے درپے ہوئے، جس طرح لفظ''بر'' بھی وسیع ہے، اس کی وسعت میں تعاون، حصول منفعت اور خیر کی تمام صورتیں شامل ہیں، علاوہ ازیں اخیر کی دو آیتوں میں فقراء، یتیم، مساکین اور''اساری''(قیدی) جیسے الفاظ جو مذکور ہیں وہ بھی اپنے اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہیں نہ کہ مسلمانوں کے ساتھ خاص (۲۱۲)۔

حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے یہود کے ایک گھرانہ پر صدقہ کیا، جو ان کے ساتھ جاری رہا (۲۱۳)، اسی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ اور عبداللہ بن ابواوفیؓ سے روایت ہے وہ دونوں فرماتے ہیں: ہم لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مال غنیمت میں شریک ہوتے تھے، ہمارے پاس شام سے نبطی آتے تھے، جنہیں گیہوں، جو اور تیل قرض کے طور پر دیتے تھے ایک خاص مدت کے لئے، سوال کیا گیا کہ کیا ان کے یہاں فصل ہوتی تھی یا نہیں، جواب دیا کہ ہم لوگ ان سے اس کے متعلق دریافت نہیں کرتے تھے (۲۱۴)، حدیبیہ میں حضور ﷺ تک یہ خبر

۲۱۱- بالترتیب یہ دیکھیں: سورۃ الممتحنۃ: ۸، سورۃ التوبۃ: ۶۰، سورۃ الانسان: ۸۔

۲۱۲- محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج ۳، ص ۶۹۔ الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۳، ص ۲۸۲ تا ۲۸۳، ج ۴، ص ۱۵۶، ۶۶۸ تا ۶۶۹۔ القرطبی، الجامع لاحکام القرآن مرجع سابق، ج ۸ ص ۱۷۴۔ ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۸۸۶۔ ابن سلام، الاموال، مرجع سابق، ص ۶۱۳۔ اور اسی طرح دیکھیں: عبدالحق الشکری، مرجع سابق، ص ۳۳۱۔

۲۱۳- الزیلعی، نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ، مطبوعات المجلس العلمی بالھند، ۱۳۵۷ھ/ ۱۹۳۸ء، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۹۸۔

۲۱۴- الشوکانی، نیل الاوطار، مرجع سابق، ج ۵ ص ۲۵۶۔

پہنچی کہ قریش پر کوئی قدرت آفت ٹوٹ پڑی ہے، تو آپ ﷺ نے مشرکین کے سردار ابوسفیان کے پاس پانچ سو دینار بھیجے تا کہ وہ اس سے گیہوں خرید کر اسے قریش کے فقراء کے درمیان تقسیم کر دیں (۲۱۵)۔

بہر کیف اگر ایک گذشتہ دلائل کا یہ تقاضا ہے کہ غیر اسلامی جماعتوں اور غیر اسلامی ممالک کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے دست تعاون دراز کرنے کو جائز سمجھا جائے، اور یہ بھی جائز شمار کیا جائے کہ جس طرح افراد اور جماعتوں کا تعاون کرنا جائز ہے، اسی طرح حکومتوں کا تعاون بھی جائز ہے، کیونکہ اس شکل میں دعوت اسلامی کے پھلنے پھولنے کی مصلحت کی تکمیل زیادہ یقینی معلوم ہوتی ہے، تو دوسری طرف اس طرح کے تعاون کی پیش کش کا جواز چند شرطوں کے ساتھ مشروط ہے، ان میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ تعاون مجبوری دور کرنے کے لئے ہو، کیونکہ مسلمان ہر مجبور کی مجبوری دور کرنے کا پابند ہے، یا ان ممالک کو پیش کئے جانے والے تعاون کا مقصد ان ممالک کی دل جوئی ہو، تا کہ وہ اپنے ہاں موجود مسلمانوں کو تکلیف دینے سے باز رہیں، اور انہیں اسلامی شعائر پر عمل کرنے کا موقع فراہم کرتے رہیں، اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے کہ ''میں ایک شخص کو دیتا ہوں جبکہ دوسرا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے، صرف اس ڈر سے کہ اللہ اس کو جہنم میں نہ ڈال دے'' (۲۱۶)، یا غیر اسلامی ممالک کا تعاون کیا جائے اس امید میں کہ وہ آئندہ اسلام قبول کر لیں، جیسا کہ حضرت سعید بن المسیبؒ سے مروی ہے کہ حضرت صفوان بن امیہؓ نے فرمایا: خدا کی قسم آپ ﷺ نے مجھے عطا فرمایا جبکہ وہ مجھے سب سے زیادہ ناپسند تھے، آپ ﷺ مجھے برابر دیتے رہے، یہاں تک کہ آپ ﷺ تمام لوگوں میں مجھے زیادہ محبوب ہو گئے (۲۱۷)، اسی طرح امداد کسی ایسی مملکت یا گروہ کو نہ دی جائے جو عام طور پر

۲۱۵- دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۲۳۸۔

۲۱۶- صحیح مسلم، مرجع سابق، ج ۱، ص ۹۱۔

۲۱۷- مسند احمد بن حنبل، مرجع سابق، ج ۶، ص ۴۶۵۔

مذہب کا انکار کرے، یا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف اس کے دل میں عداوت ہو، اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے: ''**يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا عدوى وعدوكم أولياء تلقون اليهم بالمودة وقد كفروا بما جاء كم من الحق**''(۲۱۸)(اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم میری راہ میں جہاد کرنے کے لئے اور میری رضا جوئی کی خاطر (وطن چھوڑ کر گھروں سے) نکلے ہو تو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست نہ بناؤ تم ان کے ساتھ دوستی کی طرح ڈالتے ہو، حالانکہ جو حق تمہارے پاس آیا ہے اس کو ماننے سے وہ انکار کر چکے ہیں)، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ غیر اسلامی ممالک کی امداد اس صورت میں نہ کی جائے جبکہ مسلمان اس امداد کے زیادہ حقدار ہوں، اس لئے کہ مسلمانوں کے لئے ایک دوسرے کا تعاون کرنا واجب ہے، اور غیر مسلموں کی امداد کرنا جائز ہے مگر چند شرائط کے ساتھ، اور حکم واجب جائز پر راجح ہوتا ہے، اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی حکومت جب غیر اسلامی حکومت کا تعاون کرے تو تعاون کرتے وقت اس چیز کی مکمل جانکاری ضروری ہے کہ غیر اسلامی حکومت اس تعاون کا استعمال مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے نہیں کرے گی، یا تعاون کا جو مقصد ہوتا ہے اس کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرے گی، اللہ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے ''**إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم فى الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم ومن يتولهم فأولئک هم الظالمون**''(۲۱۹)(وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنہوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں)۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ مسلم افراد کی طرح اسلامی حکومت کے لئے بھی ممنوع ہے کہ کسی غیر اسلامی حکومت سے سامانوں یا اشیاء کا لین دین کرے، جن کے حصول

۲۱۸- سورۂ ممتحنہ:۱۔

۲۱۹- سورۂ ممتحنہ:۹، اور دیکھیں: دکتور محمد الشحات الجندی، مرجع سابق، ص ۲۳۶ تا ۲۴۱۔

کے پیچھے اس غیر اسلامی حکومت کی منشا یہ ہو کہ مسلمانوں کے مقابلے اس کا موقف اور پوزیشن مستحکم اور مضبوط ہو، بالخصوص، دشمنی، کشیدگی اور جنگی صورت حال ایسی ہو جو دونوں فریق کے تعلقات کو متاثر کر رہی ہو، ایسے حالات میں پابندی کا دائرہ وسیع ہو جاتا ہے، یہ پابندی جنگی مشین بنانے میں استعمال ہونے والے تمام اسٹریٹجک مواد، جیسے لوہا اور یورینیم پر بھی عائد ہوتی ہے، ساتھ ہی بعض حضرات کے مطابق غذا کی برآمدگی اور اسے غیر مسلموں کے ہاتھ فروخت کرنا بھی پابندی کے دائرہ میں شامل ہے(۲۲۰)، ان جیسے حالات میں قومی سطح پر ہو یا حکومتی سطح پر، اقتصادی لین دین اور تجارتی تبادلہ کرنے کی ممانعت پر اللہ تعالی کے ان اقوال سے استدلال کیا جائے گا، **"لایتخذ المؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین"**، **"ولاتعاونوا علی الإثم والعدوان"**، **"لایتخذالمؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین"**، **"وأعدوالهم مااستطعتم من قوة"**۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ ہتھیاروں اور جنگی ساز وسامان کا معاملہ کرنا جبکہ ان کو اس سے مسلمانوں پر اقتدار اور غلبہ حاصل ہو آخری آیت کی منشا کے خلاف ہے، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایسا کرنے سے باز رہنا ضروری ہے(۲۲۱)، اس سلسلہ میں امام مالک کی رائے ہے کہ ہر وہ چیز جو اہل اسلام کے خلاف طاقت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہو، اور جسے مسلمان جنگوں میں اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کرتے ہوں جیسے ڈھال، کوئی ہتھیار یا کوئی ایسی چیز جو جنگ میں طاقت کے طور پر جانی جاتی ہو، جیسے تانبہ وغیرہ اس طرح کے سامان مسلمان فروخت نہیں کریں گے(۲۲۲)۔

جس طرح غیر اسلامی ممالک اور جماعتوں کے لئے اسلامی حکومت کی طرف سے تعاون پیش کرنا جائز ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ ان ممالک سے امداد و

۲۲۰- مالک، المدونۃ الکبریٰ، القاهرة، مطبعۃ السعادة، ۱۳۲۵ھ، ج ۳، ص ۱۰۲۔ الفتاوی الهندیۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

۲۲۱- مالک، المدونۃ الکبریٰ، القاهرة، مطبعۃ السعادة، ۱۳۲۵ھ، ج ۳، ص ۱۰۲۔ الفتاوی الهندیۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹۷ تا ۱۹۸۔

۲۲۲- مالک، المدونۃ الکبری، مرجع سابق، ج ۳، ص ۱۰۲۔

تعاون قبول کرے بشرطیکہ وہ تعاون اسلامی شریعت کے بلند و بالا قواعد واحکام کے حدود میں ہو، اس کی دلیل وہ واقعہ ہے جو حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے مدینہ میں ایک یہودی کے پاس زرہ رہن رکھی، اور اس کے بدلے اپنے گھر والوں کے لئے جو لے لیا، اسی طرح آپ ﷺ نے ایک یہودی سے غلہ خریدا اور اپنی ذرہ رہن رکھ دی (۲۲۳)، اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ عبداللہ ہوزی کی ملاقات مؤذن رسول ﷺ حضرت بلالؓ سے ہوئی، انہوں نے پوچھا؟ اے بلال! بعثت کے وقت سے لے کر وفات تک اللہ کے رسول ﷺ کے اخراجات کیسے پورے ہوتے تھے؟ جواب دیا: آپ ﷺ کے پاس کچھ نہیں تھا، میں نے ہی ایسا کیا کہ جب آپ ﷺ کے پاس کوئی شخص مسلمان بن کر آتا اور آپ ﷺ اسے ننگا دیکھتے تو مجھے حکم دیتے، میں جاتا اور قرض لیتا، پھر چادر خریدتا اسے اوڑھاتا اور کھلاتا، یہاں تک کہ میرے سامنے ایک مشرک شخص آیا، اس نے کہا کہ اے بلال! مجھے اللہ تعالی نے وسعت دی ہے، آپ میرے علاوہ کسی سے قرض نہ لیں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا (۲۲۴)، اسی طرح حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے بیان فرمایا: میری والدہ آئیں جبکہ وہ مشرکہ تھیں، قریش کے معاہدہ کے مطابق، میں اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آئی اور عرض کی کہ اے اللہ کے رسول ﷺ میری والدہ آئی ہیں اور وہ مجھ سے ملنے کی خواہش مند ہیں کیا میں ان سے صلہ رحمی کر سکتی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: ہاں! اپنی والدہ کے ساتھ صلہ رحمی کرو (۲۲۵)۔

گذشتہ باتوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ جس طرح غیر مسلموں کے ساتھ افراد کی سطح پر یا حکومتی سطح پر لین دین جائز ہے، اور کبھی واجب ہے کہ انہیں امداد پہنچائی جائے، اسی طرح یہ بھی جائز ہے کہ ان کی امداد قبول کی جائے، یا ان سے قرض لیا جائے، بشرطیکہ اس میں مسلمانوں کی منفعت کی تکمیل ممکن ہو، اور ایسا کرنا اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے ہم آہنگ ہو۔

۲۲۳- الشوکانی نیل الاوطار، مرجع سابق، ج ۵، ص ۲۹۳۔ الزیلعی، نصب الرایۃ لاحادیث الھدایۃ، مرجع سابق، ج ۴، ص ۳۱۹۔

۲۲۴- پچھلے صفحہ نمبر ۶۵ تا ۶۶ سے مراجعت کریں۔

۲۲۵- عبداللہ الشرقاوی، فتح المبدی، القاھرۃ، الھیئۃ العامۃ لشئون المطابع الأمیریۃ، ج ۳، ص ۵۴۔

۳-اسلامی ریاست ہی خارجہ تجارت کو منظّم کرنے کی ذمہ دار ہے:

اگر ایک طرف غیر مسلموں کے ساتھ اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے تبادلہ کی اجازت، افراد اور اسلامی مملکت دونوں کو برابر دی گئی ہے تو دوسری طرف اسلامی حکومت کے لئے ضروری قرار پاتا ہے کہ وہ ان تعلقات کو اس طرح منظّم کرنے کی مکمل ذمہ داری لے، جس سے اسلام اور مسلمانوں کے عمومی مفاد کی ضمانت ملتی ہو اور شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ہم آہنگی پائی جائے، اگر اس کے لئے افراد کی آزادی کو محدود کرنے اور ان تجارتی اور اقتصادی معاہدوں کے نفاذ کو روکنے کی ضرورت ہو، جو انہوں نے کسی غیر اسلامی ملک کے اپنے ہم منصب تاجروں کے ساتھ یا اس ملک کی حکومت کے ساتھ کئے ہوں، تو اسے بھی گوارہ کیا جائے گا۔

لہذا اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کے شہری غیر مسلموں کے ساتھ جو تجارت کریں اس کی وہ نگرانی کرے، بلکہ اس طرح نگرانی کرے جس سے اسلامی معاشرہ کا مفاد مکمل ہوتا ہو، اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے ''تم میں سے ہر فرد ذمہ دار ہے، اور تم میں سے ہر ایک سے اس کے ماتحت کے متعلق پوچھا جائے گا، امام بھی ذمہ دار ہے، اس سے اس کے ماتحتوں کے متعلق پوچھ ہوگی''(۲۲۶)، اسلامی حکومت پر واجب ہے کہ وہ غیر ملکی تجارت کی نگرانی کے لئے محافظ چوکیاں بنائے، جنہیں موجودہ وقت میں چیک پوسٹ یا کسٹمز پوائنٹس کے نام سے جانا جاتا ہے، تاکہ اسے اس طرح کے لین دین کی نگرانی اور انہیں منظّم کرنے کی پوری قوت حاصل رہے، اور اس چیز کا بھی اطمینان رہے کہ یہ ساری سرگرمیاں اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں کے مطابق کی جاری ہیں، یہاں تک کہ ایسا سامان یا میٹریل ضبط کیا جائے جس کا غیر مسلموں کے پاس جانا خطرناک ہو وہ ضبط کرلیا جائے، اور اس کی قیمت اس کے

۲۲۶- صحیح مسلم، مرجع سابق۔

مالک کو ادا کر دی جائے (۲۲۷)، اس سلسلے میں امام ابو یوسفؒ نے بہت ہی صحیح رائے دی ہے کہ امام کی طرف سے ان جگہوں پر پولیس چوکیاں ہونی چاہئیں، جہاں سے مشرکین کے ممالک میں جانا ممکن ہوتا ہے، وہاں پر تعینات محافظ دستہ ہر گزرنے والے تاجر کو چیک کرے، جس کے پاس ہتھیار ہو اس کو لے لے اور اس شخص کو واپس بھیج دے، اور جس کے پاس غلام ہو اسے بھی واپس بھیج دے، اور جس کے پاس کتابیں ہوں تو کتابیں پڑھی جائیں اور پڑھ کر فیصلہ کیا جائے (۲۲۸)۔

۴- اسلامی ریاست میں غیر مسلم تاجروں اور سرمایہ کاروں کی صورت حال کو مدنظر رکھتے ہوئے وہاں ان کے داخلے اور قیام سے متعلق احکام کو ملحوظ رکھنا:

اگر ایک طرف غیر اسلامی ممالک کے ساتھ مشترک اقتصادی منصوبوں اور تجارت کے تبادلہ کو اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے کہ وہ دعوت اسلامی کی تبلیغ اور غیر مسلموں کو اسلام سے واقف کرانے کا ایک ذریعہ یا چینل ہے، تو دوسری طرف مسلمان تجار اور سرمایہ کاروں کے لئے بہتر یہ ہے کہ بعض حالات میں غیر اسلامی مملکت میں داخل نہ ہوں، اور نہ وہاں مستقل رہائش اختیار کریں، یہ حکم اس صورت میں ہے جب یہ محسوس کیا جائے کہ مسلمان وہاں اسلامی شعائر پر عمل نہ کر پائے گا یا وہاں اس کو ان لوگوں کی طرف سے ضروری عزت و احترام نہ مل سکے گا جن کے دلوں میں دین اسلام سے نہ ذرہ برابر محبت ہوتی ہے، اور نہ اس اسلام کا احترام کرتے ہیں۔

اس طرح غیر مسلم تجار اور سرمایہ کاروں کے لئے ضروری ہے کہ جب وہ اس غرض سے اسلامی مملکت کا رخ کریں تو شریعت اسلامی کے عمومی احکام کے تقاضوں کی رعایت کریں، اور اس مسئلہ میں فقہاء نے جو رائے دی ہے اس کا پاس ولحاظ رکھیں، بطور وضاحت یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے حرام ہے کہ وہ غیر مسلموں کو مکہ و مدینہ کے مقدس مقامات میں داخل ہونے کی اجازت دے، چاہے اسباب و محرکات کیسے بھی ہوں، اس لئے کہ ضرورت کے تقاضوں کا

۲۲۷-۲۲۸- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸ تا ۱۹۰۔

پایا جانا جو یہاں فقراور محتاجی ہے گذشتہ قرآنی آیت کے مفہوم میں اسلامی حکومت کے لئے اس کا جواز نہیں بنتا کہ وہ اس طرح کی اجازت دے، چنانچہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر مشرکوں کی طرف سے تجارت منقطع کر دینے کی وجہ سے اہل ایمان کو ڈر ہے غربت کا تو اللہ تعالی اس کی تلافی کرے گا (۲۲۹)، اور اس عمومی ممانعت کے علاوہ کسی صورت حال میں اگر اسلامی مملکت کے اندر غیر مسلم تجار، سرمایہ کار اور دیگر شعبہائے حیات سے متعلق افراد کی موجودگی کو منظّم کرنے والا بین الاقوامی معاہدہ ہو چکا ہو تو پھر ان حضرات کے اسلامی مملکت میں داخلہ اور قیام سے متعلق سارے امور، معاہدہ میں متفقہ طور پر طے شدہ دفعات کے تابع ہوں گے، اور اگر اس طرح کا کوئی معاہدہ نہ ہو اور غیر مسلم افراد کے اسلامی مملکت میں آنے جانے کا معاملہ ان کے اور اسلامی مملکت کے کچھ افراد یا خاص اداروں کے درمیان طے پانے والے خصوصی معاہدے کے فریم ورک میں تشکیل پائے، تو غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں داخلہ کا موقع نہیں دیا جائے گا، سوائے اس کے کہ انہیں خصوصی امان دیا جائے، یا جسے بعض اسلامی ممالک میں ''کفالت کا نظام'' کہا جاتا ہے، بشرطیکہ اسلامی مملکت کو اپنے شہریوں پر عمومی اختیار رکھنے کے تقاضہ کے تحت جسے موجودہ وقت میں انٹری ویزا سسٹم کے نام سے جانا جاتا ہے دیئے گئے خصوصی امان پر نظر رکھنے کا حق حاصل ہو، تاکہ اسے یقینی بنایا جا سکے کہ یہ امان افراد کو دیئے گئے اختیار کے دائرہ میں آتا ہے، نیز یہ کہ یہ مسلمانوں کے عمومی مفاد کے موافق ہے۔

اس لئے اسلامی مملکت کے لئے ''لاضرر و لاضرار'' (نہ نقصان اٹھاؤ اور نہ نقصان پہنچاؤ) کے اصول پر کاربند رہتے ہوئے جائز ہے کہ وہ تجارت یا دیگر مقاصد کی خاطر اسلامی مملکت میں قیام پذیر غیر مسلموں کے ساتھ ہونے والے امن وسلامتی کے معاہدہ کو توڑ دے، جب اس کے سامنے یہ واضح ہو جائے کہ یہ حضرات مسلمانوں کی جاسوسی کر رہے ہیں، اور ممنوعہ

۲۲۹- ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۹۰۰ تا ۹۰۳۔ السیوطی، اسباب النزول، مرجع سابق، ج ۱ ص ۱۶۲، گذشتہ صفحہ نمبر ۶۳ تا ۶۴ سے بھی مراجعت کریں۔

اشیاء کی اسمگلنگ کررہے ہیں یا کسی اورطرح سے روئے زمین پر فساد مچانے کے لئے کوشاں ہیں(۲۳۰)۔

واضح رہے کہ مذکورہ عمومی احکام غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی معاملات کے تبادلے کی راہ میں رکاوٹ نہیں ہیں، اس صورت میں جب یہ ثابت ہو کہ ایک حربی شخص (یعنی جب ایک ایسا شخص جس کا تعلق کسی ایسے ملک سے ہو جس کے درمیان اور اسلامی ملک کے درمیان جنگ چھڑی ہو) دارالاسلام میں خصوصی حفاظت کے معاہدہ کے بغیر داخل ہو، اور یہ دعوی کرے کہ وہ تاجر ہے تو فقہ وعمل کے اعتبار سے جو بات ثابت ہے وہ یہ کہ اگر غیر مسلم تاجروں کے لئے اسلامی مملکت میں داخل ہونے کا رواج ہو اور ان تاجروں کے پاس فروخت کی جانے والی اشیاء ہوں تو ان سے تعرض نہیں کیا جائے گا، اس لئے کہ وہ لوگ امن و امان کی امید میں دارالاسلام میں داخل ہوئے ہیں، اور یہ مسئلہ بالکل اس مسئلہ کے مشابہ ہے جس میں ان لوگوں کا داخلہ کسی مسلمان کی رہنمائی میں ہوتا، اس لئے فقہ اسلامی کا ایک طے شدہ حکم ہے کہ ''جب مسلمان سمندری سفر کریں اور دشمن کی سرزمین سے تعلق رکھنے والے مشرک تجار ان کا سامنا ہوجائے، جن کی خواہش ہو کہ وہ اسلامی ملک میں پناہ لیں، تو مسلمان نہ ان سے کوئی تعرض کریں گے اور نہ ان سے برسر پیکار ہوں گے۔

خلاصہ یہ کہ اس رائے کے مطابق جو کوئی دار الحرب (کسی ایسے ملک سے جو مسلمان ملک سے حالت جنگ میں ہو) سے تجارت کی غرض سے دار الاسلام میں داخل ہو، اس سے خرید وفروخت کی جائے گی اور کچھ بھی پوچھا نہیں جائے گا(۲۳۱)، ظاہر ہے کہ ان جیسے حالات میں مادی منفعت کو غالب کرتے ہوئے غیر مسلموں کے ساتھ معاملہ اور تجارتی لین دین

۲۳۰- دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۳۸۴۔

۲۳۱- موفق الدین ابن قدامہ وشمس الدین ابن قدامہ المقدسی، المغنی والشرح الکبیر، مرجع سابق، ص ۵۴۱ تا ۵۶۴۔

مسلمانوں کے عمومی مصالح کے تقاضوں کی رعایت پر مبنی اور اس فیصلہ سے مربوط ہوگا جو اسلامی حکومت اس قسم کے معاملات کے اغراض ومقاصد پر اپنے تفتیشی ذرائع سے نگرانی کرانے کے بعد کرے گی۔

۵- غیر مسلم ممالک سے درآمدات پر ٹیکس یا کسٹم ڈیوٹی عائد کرتے وقت معاملہ بالمثل (باہمی تعاون) کے اصول کی رعایت کرنا:

اگر ایک طرف صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ اسلامی مملکت میں رہنے والے تجار چاہے وہ مسلمان ہوں یا ذمی ان پر ٹیکس عائد کرنا ممنوع ہے، گرچہ وہ سامان کے ہوں تجارت اس نوعیت کی ہو کہ انہیں غیر مسلم ممالک سے اسلامی ممالک میں لایا گیا ہو، یا اس نوعیت کے ہوں کہ انہیں غیر اسلامی ممالک میں منتقل کیا گیا ہو، تو دوسری طرف صورتحال اس وقت بالکل مختلف ہوجائے گی جب غیر اسلامی مملکت یا اس کے شہری تجارتی لین دین کے سلسلے میں اسلامی مملکت کے ساتھ ہونے والے معاہداتی تعلقات میں شامل ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ وہ تجار جن کا شمار اسلامی مملکت کے شہریوں میں ہو، اور وہ باہر سے اسلامی مملکت کے لئے سامان لے کر آئیں، یا اسلامی مملکت سے غیر اسلامی ممالک کی طرف سامان لے جائیں تو اگر ان حضرات کے سامان تجارت پر ٹیکس نافذ کیا جائے تو ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''ٹیکس لینے والا جہنم میں ہوگا''، آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''ٹیکس لینے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا''، ارشاد نبوی ﷺ ہے: ''جب تمہارا سامنا دسواں حصہ لینے والے سے ہو تو اسے قتل کردو''، جس کا سامنا دسواں حصہ لینے والے سے ہو تو اسے چاہئے کہ اس کی گردن ماردے'' (۲۳۲)، اس کے علاوہ آپ ﷺ کے خطوط ہیں جن

۲۳۲- ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، ج۱، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۲۸۳۔

میں بحرین اور دومۃ الجندل جیسے ممالک میں واقع شہروں کے گورنروں کو تاکید کی گئی ہے کہ وہ ٹیکس وصول نہ کریں (۲۳۳)۔

مذکورہ احادیث اور خطوط سے استدلال یوں کیا جاتا ہے کہ اسلامی مملکت کے تجار چاہے مسلمان ہوں یا ذمی ان کی نسبت سے ایک عمومی اصول یہ ہے کہ ان حضرات کی تجارت پر کسی قسم کی ڈیوٹی یا ٹیکس نافذ نہ کیا جائے، چاہے وہ سامان درآمد کررہے ہوں، یا برآمد، علاوہ ازیں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے اس بات سے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمان تجار سے عشر وصول کیا ہو، لاعلمی ظاہر کی، اسی طرح کریر بن سلیمان نے روایت کی ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے عبداللہ بن ابوعوف کو خط لکھا کہ مقام رفح میں ایک گھر ہے، وہاں جاؤ، اسے ٹیکس گھر کہا جاتا ہے، اسے منہدم کردو، اور ملبہ اٹھا کر سمندر تک لاؤ اور اس میں ڈال دو (۲۳۴)، اللہ کے رسول ﷺ کا قول ''دسواں حصہ مسلمانوں پر واجب نہیں ہے، بلکہ یہود و نصاری پر واجب ہے''، گذشتہ احکام سے استدلال کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ روایت مذکورہ کو صحیح تسلیم کر بھی لیا جائے تب بھی اللہ کے رسول ﷺ کے قول ''**إنما العشور على اليهود والنصارى**'' کا اطلاق اس صورتحال پر ہوگا جب یہود و نصاری اور اسلامی مملکت کے درمیان تجارتی تبادلہ ہوا کرتا تھا، اور اس وقت یہ اقوام اسلامی مملکت کے تابع نہیں تھیں، مگر بعد میں اسلامی حکومت کے تابع ہوگئیں، اور اسلامی مملکت کی رعایا بن گئیں، اور ان کا شمار اس کے شہریوں میں ہونے لگا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عملا یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی نے اسلامی مملکت کی رعایا میں شامل یہود و نصاری سے دسواں حصہ وصول کرنے کے جواز پر استدلال کیا ہو، امام احمد نے حضرت بریدہ کی جو روایت نقل کی ہے اس سے اس کی مزید تاکید ہوجاتی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد

۲۳۳- ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، ج۱، ص ۱۵۰ تا ۱۵۱۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص ۲۸۳۔

۲۳۴- ابن سلام، الاموال، مرجع سابق، ص ۷۰۳، ۷۰۵، ۷۰۷۔

فرمایا: اہل ذمہ اگر اسلام قبول کرلیں تو اسلام قبول کرنے سے پہلے جو بچے عورتیں، مال و جائیداد اور غلام ان کے پاس تھے وہ سب ان ہی کی تحویل میں رہیں اور جو معاہدے ان سے کئے گئے تھے وہ برقرار رہیں گے، ان کے ذمہ صرف صدقات کی ادائیگی ہوگی'' اس ارشاد نبوی میں اہل ذمہ اور اسلامی مملکت کے درمیان جو مصالحت ہو، یا جو معاہدہ کیا گیا ہو، اور اس کے تقاضوں کے مطابق وہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ میں شامل ہوئے ہوں اس کی پاسداری کی گئی ہے(۲۳۵)، اسی طرح حضرت عمر بن خطابؓ سے جو مروی ہے کہ وہ مسلمانوں پر عشر کا چوتھائی حصہ، اور اہل ذمہ پر بیسواں حصہ اور دارالحرب کے باشندوں پر دسواں حصہ نافذ کرتے تھے، اس سے بھی اسلامی مملکت کے تجار چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اس سے ٹیکس اور اکسائز ڈیوٹی لئے جانے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا، اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے مسلمان تجار سے جو لیا وہ زکاۃ کی رقم تھی، اور یہود و نصاری سے جو لیا وہ یہود و نصاری اور اسلامی مملکت کے درمیان ہونے والے معاہدہ اور مسلمانوں کی طرف سے ان کو دیئے گئے عہد و امان کے تحت تھا، اور جو ٹیکس یا ڈیوٹی وہ غیر اسلامی ممالک کی جانب منسوب تجار سے لیتے تھے، وہ اصلا طرفین کے درمیان طے پانے والے معاہدہ کے مطابق تھا(۲۳۶)۔

اس کے برخلاف غیر اسلامی ممالک کی طرف سے درآمد ہونے والے سامان تجارت پر جو ٹیکس نافذ کیا جاتا ہے، وہ اصلاً ان معاہدوں کے زیر اثر ہوتا ہے، جو معاملہ بالمثل کے اصول پر قائم ہوتے ہیں، اس کی دلیل حضرت ابوموسی اشعریؓ سے مروی روایت ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ انہوں نے حضرت عمر بن الخطابؓ کو خط لکھا کہ مسلمانوں کی طرف سے کچھ تجار دارالحرب آتے ہیں، تو ان سے حربی لوگ دسواں حصہ وصول کرتے ہیں، حضرت عمرؓ نے جواباً تحریر فرمایا کہ ان سے بھی اسی طرح وصولی کی جائے جس طرح وہ مسلمانوں سے وصولی کرتے

۲۳۵-۲۳۶-ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج۸، ص۵۱۸۔ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، ج۱، ص۱۵۳، کنزالعمال، مرجع سابق، ج۱، ص۹۶۔دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص۲۸۴ تا ۲۸۵۔

ہیں''(۲۳۷)۔

تاہم یہ اسلامی مملکت کو معاملہ بالمثل کے اصول کے تقاضوں سے انحراف کرنے سے نہیں روکتا، چاہے ٹیکس یا اکسائز ختم کر کے ہو یا اسے کم کر کے ہو، جیسا کہ غیر اسلامی ممالک کی طرف اسلامی مملکت سے آنے والے سامان تجارت کے معاملے میں کیا جاتا ہے، جب تک مسلمانوں کے عمومی مصالح کا تقاضا کریں، اس وقت تک ایسا ہی کیا جاتا رہے گا۔

اس کی وضاحت اس روایت سے بھی ہوتی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نبطیوں کی درآمدات کی مخصوص اقسام جیسے گندم اور تیل پر بیسواں حصہ نافذ کرتے تھے، جب کہ وہ روئی کی درآمدات پر دسواں حصہ عائد کرتے تھے، مقصد تجار کو ترغیب دینا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پہلی قسم کے سامان اور مٹیریل مدینہ لاتے رہیں(۲۳۸)۔

اس کا حاصل عصری بین الاقوامی تجارت کے تناظر میں قائم ''سب سے پسندیدہ ملک'' کا اصول ہے، جس کی بنیاد اس پر ہے کہ ایک ملک کی طرف سے دوسرے ملک کو خصوصی استحقاق دیا جائے، تاکہ اسے تیسرے ملک یا ممالک کے مقابلے میں لاگو کیا جا سکے بشرطیکہ مؤخر الذکر ملک پہلے ملک کے برابر خصوصی رعایت دیتا رہے، اس طرح کے اصول کی اسلامی شریعت میں دلیل موجود ہے، بشرطیکہ وہ دونوں کی رضامندی سے تکمیل کے مرحلہ کو طے کرے، اور اس میں اسلامی مملکت کے واسطے ظاہری منفعت بھی پنہاں ہو چاہے وہ منفعت فائدہ کے حصول کی شکل میں ہو یا نقصان کے ازالہ کی شکل میں، جب تک اصول ذمہ داریوں کو ترتیب دینے اور باہمی حقوق کا تعین کرنے میں انصاف کے تقاضوں کو پورا کرے، مذکورہ اصول کی قانونی بنیاد، جب

۲۳۷- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۴۶۔ ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۶۶ تا ۱۶۷، ویشیر الی حدیث عمر: ''کم یأخذون منکم اذ قدمتم''۔

۲۳۸- ابوعبید القاسم بن سلام الاموال، مرجع سابق، ص ۶۴۱۔ ابن قیم الجوزیۃ، احکام اھل الذمۃ، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۶۷، ۱۷۴ تا ۱۷۵۔

اس کی یہ ساری شرائط پوری ہوجائیں، اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: ''**يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل، إلا أن تكون تجارة عن تراضٍ منكم**'' جس میں رواداری کو قانونی حیثیت دی گئی ہے، جس میں ایک معاوضہ دوسرے سے بڑا ہے، جو'' سب سے پسندیدہ حکومت'' کے اصول میں شامل ہے، اس تفریق کے پیش نظر جو کسٹم ڈیوٹی طلب کرنے کے معاملہ میں ممالک کے درمیان ملحوظ ہوتی ہے (۲۳۹)، اس کے برعکس اگر رعایت دینے والے ملک اور رعایت حاصل کرنے والے اس ملک کے درمیان مساوی ذمہ داریاں کو شامل کئے بغیر'' سب سے پسندیدہ ملک'' کا اصول طے کیا جائے تو یہ جائز نہیں ہوگا، کیونکہ اس صورت میں اس اصول پر مشتمل معاہدہ کے فریق ممالک کے کندھوں پر عائد ذمہ داریوں میں ایک قسم کا امتیاز موجود ہے الا یہ کہ ایسے استثنائی حالات پیدا ہوجائیں جو اسلامی ملک کو دوسرے ملک سے اس اصول کی آخری صورت کے مطابق لین دین کا تقاضا کریں (۲۴۰)۔

۶- بیرون ملک اقتصادی اور تجارتی تعلقات میں عدالت اور دیانت کے تقاضوں کی رعایت کرنا:

اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ کئے جانے والے اقتصادی اور تجارتی معاملات اور لین دین کے تمام مرحلوں میں انصاف اور امانت کے اصولوں کی پاسداری کرے، چاہے مصنوعات یا سامان کی مقدار کا معاملہ ہو یا معیار کا، یا واجب الاداء ٹیکس یا ڈیوٹی کے منصفانہ تخمینہ کا ہو، اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے ''**ولا تبخسوا الناس أشياء هم ولا تعثوا في الأرض مفسدين**'' (اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو) (۲۴۱)، اسی طرح زیاد بن حدیر سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے انہیں عراق وشام کے لوگوں سے عشر (دسواں حصہ) کی وصولی کے لئے بھیجا، اور یہ حکم دیا کہ

۲۳۹-۲۴۰- دکتور محمد الشحات الجندی، مرجع سابق، ص ۲۸۷ تا ۲۸۸۔

۲۴۱- سورۂ ہود: ۸۵۔

مسلمانوں سے ربع عشر (دسواں حصہ کی چوتھائی) وصول کریں، اور ذمیوں سے عشر، ان کے سامنے بنوتغلب جوعرب کے نصاری کہلاتے ہیں، کے ایک فرد کا گزر ہوا، اس کے پاس ایک گھوڑا تھا، اس گھوڑے کی قیمت بیس ہزار لگائی گئی، انہوں نے کہا کہ مجھے گھوڑا دے دو، اور مجھ سے انیس ہزار لے لو، یا گھوڑا رکھ لو، اور مجھے ایک ہزار دے دو، تو انہوں نے ایک ہزار ادا کر کے گھوڑا اپنے پاس رکھ لیا(۲۴۲)۔

دوسرے نقطہ نظر سے جب اسلامی مملکت غیر مسلم تجار کو اسلامی مملکت میں بغرض تجارت داخل ہونے کی اجازت دیتی ہے تو پھر اس کے لئے فرض ہوجاتا ہے کہ ایسی صورتحال میں انہیں مکمل تحفظ فراہم کرے، اور اسلامی مملکت کے اندرون میں ان کی تجارتی نقل وحرکت اور چلت پھرت کو مکمل حفاظت دے، ان کے مال واسباب کی حفاظت کرے اور انہیں لاحق ہونے والے خطرات کو روکے، جب تک یہ تجار اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے پابند رہیں، اور ان سے اسلامی مملکت کے خلاف کوئی تخریبی یا عداوت پر مبنی رویہ ظاہر نہ ہو، اور اگر ان میں سے کسی تاجر کی وفات کا حادثہ پیش آجائے تو اس کے مال میں سے کچھ بھی وصول نہیں کیا جائے گا، اور حاکم اور دیگر ارباب اقتدار پر فرض ہوجائے گا کہ اسے بحفاظت اس کے ورثاء تک لوٹائیں، اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے: "**إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها**"، اور اس ارشاد نبوی ﷺ کو زیر عمل لاتے ہوئے "جس نے تمہارے پاس امانت رکھی ہے اسے اس کی امانت لوٹادو، اور جو تمہارے ساتھ خیانت کرے اس کے ساتھ خیانت نہ کرو"(۲۴۳)۔

اسی طرح فقہاء اور مفسرین کی رائے ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے جائز نہیں کہ وہ کسی پناہ گزیں کو بغیر اس کی رضامندی کے اس کے ملک کے حوالے کرے، اگرچہ اس حوالگی کے عوض

۲۴۲- ابن العربی احکام القرآن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۹۲۹۔ یحیی بن آدم القرشی، الخراج، (تحقیق) احمد شاکر، القاهرة، المطبعة السلفية، ط ۲، ۱۳۸۴ھ، ص ٦٦۔

۲۴۳- الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۴، ص ۲۷۸، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مرجع سابق، ص ٦۲٦، دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۹۹ تا ۳۰۰۔

ایک مسلمان قیدی کی رہائی ہورہی ہو، بلکہ اسلامی مملکت کے لئے یہ جائزنہیں کہ وہ پناہ گزیں کو حوالے کرے اگرچہ اس کی حکومت نے اسلامی مملکت کے خلاف حوالگی سے انکار پر جنگ کا اعلان کردیا ہو(۲۴۴)۔

یہاں ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اسلامی مملکت اپنے تجارتی اور اقتصادی تبادلوں اور دوسروں کے ساتھ معاملات میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو اساسی حیثیت مدنظر رکھتی رہی ہے۔اس نے نقل وحمل اور مواصلات کے ذرائع میں ہونے والی ترقی اور اس کے نتیجے میں دنیا کے مختلف حصوں کے درمیان کم ہونے والے فاصلوں کو اہمیت دی ہے، یہاں تک کہ پوری دنیا ایک ایسی یونٹ میں تبدیل ہوگئی ہے،جس کے سارے اجزاء آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، بین الاقوامی برادری کے ممبران کے درمیان بڑھتے ہوئے باہمی اعتماد کے علاوہ، خاص طور پر اقتصادی تعلقات کے میدان میں وہ اس مقام تک پہنچتی ہے جہاں پوری دنیا اقتصادی لغت کی زبان میں ایک باہم مربوط مارکیٹ بن چکی ہے،جس میں سامان اور مصنوعات کا مختلف شکلوں میں تبادلہ ہوتا رہتا ہے،ان اصول وقواعد کے مطابق جنہیں بین الاقوامی برادری نے اپنے ممبران اور اکائیوں کے درمیان باہمی اقتصادی تعلقات کے طرز عمل کی بنیاد پر طے کیا ہے، جبکہ بین الاقوامی اقتصادی تعلقات یا بین الاقوامی اقتصادی نظام اپنی موجودہ حالت میں کئی اہم تبدیلیوں کا مشاہدہ کرچکے ہیں،جن میں سب سے اہم بڑے بڑے اقتصادی بلاکس کا قیام،تجارتی، مالی اور دولت کے تبادلے کی بڑھتی ہوئی آزادی ہے،خاص طور پر ترقی یافتہ صنعتی ممالک میں، اور مختلف ممالک میں گھریلو مصنوعات کے ساتھ غیرملکی تجارت کے تناسب میں اضافہ،جبکہ بیرونی تجارت سے جڑی مشکلات پیچیدہ اور متنوع ہوچکی ہیں، یہاں تک کہ اگر ناممکن نہ سہی تو ایک ملک یا چند ممالک کے گروہ کے لئے مشکل ضرور ہوگیا ہے کہ وہ دنیا کے بقیہ ممالک کے ساتھ اقتصادی لین

۲۴۴- الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۴،ص ۲۷۸، ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، مرجع سابق،ص ۶۲۶، دکتور مجید خدوری،مرجع سابق،ص ۲۹۹ تا ۳۰۰۔

دین کو مسترد کرے یا اس سے کنارہ کشی اختیار کرے۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بین الاقوامی معاشی نظام اپنی موجودہ حالت میں ترقی یافتہ صنعتی ممالک کے حق میں تجارتی تعلقات کے سلسلے میں ایک طرح کی عدم مساوات سے گذر رہا ہے، اور یہ سب اسلامی ممالک میں شمار نہیں ہوتے ہیں، یہ مؤخرالذکر ممالک مارکیٹنگ اور توانائی کی پیداوار میں اور مال کے بین الاقوامی بازار میں اپنی مضبوط پوزیشن کے باوجود بڑے صنعتی ان ممالک پر منحصر ہیں، کیونکہ یہ ان ہی ممالک سے ہتھیار، ساز وسامان، تیار کردہ مصنوعات، تکنیکی آلات اور بعض اوقات کھانے پینے کی اشیاء خریدنے پر مجبور ہوتے ہیں (۲۴۵)۔

ان حالات اور موجودہ تبدیلیوں کی روشنی میں، اسلامی ممالک کے کندھوں پر دوسروں کے ساتھ اقتصادی تعلقات کے سلسلے میں انصاف کے تقاضوں کی پاسداری کی جو عمومی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی ممالک کو آپس میں ایک اقتصادی بلاک قائم کرنے کے لئے کام کرنا چاہئے، جو انہیں موجودہ معاشی حالات کو سمجھنے اور ان میں تبدیلی کے پہلوؤں اور مطالبات کی نشاندہی کرنے کے قابل بنائے۔

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ ایسے حالات میں اسلامی ممالک پر فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے اقتصادی بلاک کے ذریعہ جس کا مقصد عالمی تجارتی اور اقتصادی نظام کی صورتحال اور شرائط کی درستگی ہو، ایسے ماڈل اقتصادی نظام کو برپا کرنے کے سلسلے میں کام کریں جو ہر طرح سے انصاف پر مبنی ہو، جس کی روشنی میں تمام فریق انصاف پر کاربند رہتے ہوئے کام کرتے رہیں، اور موجودہ نظام کے برعکس کسی فریق پر کسی کی طرف سے ظلم کئے بغیر یا اس کا استحصال کئے بغیر حق وانصاف سے فیضیاب ہوتے رہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ کہنا کہ اسلامی ممالک کے لئے لازم ہے کہ وہ تمام ممالک کے

۲۴۵- محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثایق السیاسۃ، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۵۷، ۶۰، ۶۵۔

واسطے عالمی اقتصادی نظام اوراس کی شرائط کی بہتری کی خاطر متواتر کوشش جاری رکھیں، اس کی شرعی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت کریمہ ہے:"**كنتم خير أمة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر**"، نیز اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی بھی دلیل ہے:"**ولولادفع الله الناس بعضهم ببعض لفسدت الأرض**"،اور حضور ﷺ کا یہ قول بھی دلیل بن سکتا ہے:"جب لوگ ظالم کو دیکھیں اوراس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو قریب ہے کہ اللہ تعالی سبھوں کو عمومی عذاب میں مبتلا کردے"۔

مذکورہ شرعی دلائل سے استدلال یوں کیا گیا ہے کہ اسلامی ممالک چونکہ موجودہ عالمی اقتصادی نظام کا حصہ ہیں، اس لئے ان سے مطالبہ ہے کہ اپنی کوششوں کو متحد کریں اور ایک مثالی اقتصادی نظام برپا کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو نچوڑ دیں، تاکہ وہ ایک عظیم الشان طاقت بن کر سامنے آئیں، اوراس کے نتیجہ میں انہیں اتنی طاقت حاصل ہوجائے کہ اس ظلم، حق تلفی اوراستحصال کے تمام مظاہر کو ختم یا کم از کم کم کرسکیں، جو موجودہ اقتصادی نظام کا امتیازی وصف ہے، یہ سارے مظاہر گزشتہ شرعی دلائل کی روشنی میں روئے زمین میں فساد پھیلانے کے اسباب ومحرکات ہیں، اوروہ منکرات ہیں جن کے ازالہ کی اورجن تبدیل کرنے کی کوشش اسلامی مملکت پر لازم ہے، جہاں تک اس سے ممکن ہوسکے(۲۴۶)۔

اس کے مطابق ترقی پذیر ممالک کی کامیابی، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے ذریعہ ایک نئے انصاف پر مبنی بین الاقوامی اقتصادی نظام قائم کرنے کے لئے ایکشن پروگرام اور ریاستوں کے اقتصادی حقوق اورفرائض کے چارٹر کی منظوری میں ہے، اس کے علاوہ مذکورہ ممالک کو چاہئے کہ وہ تجارتی ترجیحات کے جامع نظام کے اس معاہدے تک پہنچیں جس کا نفاذ ۱۹/اپریل ۱۹۸۹ء میں ہوا تھا، یہ تمام کوششیں موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام میں کمزور

۲۴۶- سورۂ ال عمران:۱۱۰، سورۂ بقرہ:۲۵۱۔ نیز دیکھئے: محمد رشید رضا،تفسیر المنار، مرجع سابق (طبعۃ دار المعرفۃ بیروت، ج۴،ص۵۷اوراس کے بعد کے صفحات۔

ممالک کی کوششوں کے فریم ورک کے اندر اس نظام کے حالات کو اس طرح بہتر بنانے کے لئے درکار ہیں، جس سے تمام فریقوں کے باہمی مفادات پورے ہوں، اگرچہ اسلامی ممالک کے لئے جو کہ سب کے سب اس زمرے سے تعلق رکھتے ہیں، بہتر یہ ہے کہ سب سے پہلے ایسے معاہدوں کو اپنے درمیان متعارف کرائیں، اور خود ان پر عمل کریں (۲۴۷)۔

۷-تجارتی اور اقتصادی معاملات میں معاہدہ کی دفعات کا از روئے شرع درست ہونا:

اسلامی مملکت اور دیگر ممالک کے درمیان تجارتی تبادلے کے جواز کے بارے میں بنیادی اصول یہ ہے کہ اس تبادلے کی ضرورت اسلامی شریعت کی عمومی دفعات کے مطابق مکمل ہو، چاہے یہ معاملہ مجموعی طور پر معاہدے کے موضوع سے متعلق ہو یا اس کی توجہ معاہدے میں شامل شقوں میں سے کسی ایک پر مرکوز ہو، چاہے یہ تبادلہ افراد یا نجی اداروں کے تعلقات کی سطح پر ہو، یا یہ کہ ممالک کے درمیان باہمی تعلقات کی سطح پر ہو۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے لئے ممنوع ہے کہ وہ کسی غیر اسلامی حکومت کے ساتھ ایسا تجارتی یا اقتصادی معاہدہ کرے، جس کا مقصد یا جس کے پیچھے بنیادی غرض اسلامی مملکت کا سودی قرضے حاصل کرنا ہو، یعنی وہ قرضے جن کی ادائیگی کی مدت میں توسیع کے بدلے اضافی رقم ادا کرنے پر فریقین کی رضامندی ہو، اور قرض لینے والا ہر مدت میں اس اضافے یا سود کی قسط کی ادائیگی کا طے شدہ معاہدہ کے مطابق پابند ہو، اور رأس المال (اصل پونجی) اپنی حالت پر باقی رہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرض کی ادائیگی کے لئے مقرر کردہ مدت کے اختتام تک

۲۴۷- دکتور احمد عبد الونیس، مرجع سابق، ص ۳۹۲ اور اس کے بعد کے صفحات۔ ترقی پذیر ممالک کے درمیان جامع تجارتی نظام کا جائزہ لینے کے لئے اس کی پیدائش، مقاصد، طریقہ کار، درپیش مشکلات اور کامیابی کے امکانات کے لحاظ سے، مطالعہ کیجئے: **دکتور ولید محمود عبد الناصر، جات العام الثالث: النظام الشامل للافضليات التجارية فيما بين الدول النامية، كتاب الأهرام الاقتصادی العدد (۹۰) یولیو ۱۹۹۵ء۔**

اضافہ یا سود وصول کرنے میں تاخیر پر اتفاق کرلیا جاتا ہے،اس صورت میں مدت کی توسیع کے بدلے رأس المال کے ساتھ اضافی رقم بھی وصول کرلی جاتی ہے(۲۴۸)،اسی طرح اسلامی مملکت کے لئے یہ بھی ممنوع ہے کہ وہ کوئی ایسا معاہدہ کرے جس کا مقصد سود کے ساتھ قرضوں کا نپٹارا کرنا ہو،جیسے یہ طے کرلے کہ موجودہ قرض جسے فی الحال ادا کرنا تھا اسے کسی اور متعینہ مدت تک ملتوی کرنے کے بدلے میں کچھ اضافی رقم دی جائے گی،جسے دورحاضر میں ''جدولۃ الدیون'' کہا جاتا ہے،اس سلسلے میں قرآنی آیات بڑی تعداد میں موجود ہیں،جو صراحت کے ساتھ سودی لین دین کی ممانعت کی تعلیم دیتی ہیں،چاہے اس کی صورت ونوعیت کچھ بھی ہو،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''وأحلَّ الله البيع وحرَّم الربا''(اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام)،''يأ يهاالذين آمنوا اتقوا الله وذروامابقى من الربا إن كنتم مؤمنين '' (اے لوگو جو ایمان لائے ہو،خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے،اسے چھوڑ دو،اگر واقعی تم ایمان لائے ہو)،''يأيها الذين آمنوا لا تأكلوا الربا أضعافا مضاعفة'' (اے لوگو جو ایمان لائے ہو،یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو)(۲۴۹)،حدیث میں آیا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:''سود ادھار میں ہے'' یعنی قرض کے طور پر دیئے ہوئے مال میں جن کی ادائیگی واجب ہے،متعینہ مدت تک ملتوی کئے جانے کے عوض اضافہ کرنا(۲۵۰)۔

یہاں یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مذکورہ بالا آیات اور احادیث میں وارد سودی کاروبار کی ممانعت سے متعلق احکام اور مضمون کے دائرہ میں ہر قسم کا لین دین شامل ہے،خواہ ایسا افراد کے درمیان ان کے تعلقات کی سطح پر مختلف ممالک میں ایک دوسرے کیساتھ ہو،یا اسلامی ملک اور دوسرے ممالک کے درمیان تعلقات کی سطح پر ہو،خواہ اس کا تعلق ملکی تجارت سے ہو،یا یہ

۲۴۸- دکتور محمد علی الحسن،مرجع سابق،ص ۲۸۷۔

۲۴۹- ترتیب وار دیکھئے:سورۂ بقرہ:۲۷۸،سورۂ آل عمران:۱۳۰۔

۲۵۰- صحیح مسلم،مرجع سابق۔

غیر ملکی تجارت کے دائرہ میں ہو، ایسا اس لئے کہ ان احکام میں عمومیت ہے، اور اسلامی ملک اندرونی وبیرونی دونوں سطح پر ان احکام کے تقاضوں کی رعایت کرنے کا پابند ہے۔

علاوہ ازیں اگر ایک طرف یہ ثابت ہوگیا کہ سود پر مبنی تجارتی معاملات سے متعلق معاہدے کتاب وسنت کے صریح حکم کے مطابق شرعاً ممنوع ہیں، تو دوسری طرف شریعت اسلامیہ کے عمومی احکام کے تقاضے ایسے معاملات انجام دینے کی اجازت دیتے ہیں جنہیں ''قرض حسن، کے دائرہ میں شمار کیا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''**من ذا الذی یقرض الله قرضا حسنا فیضاعفه له أضعافا کثیرة، والله یقبض ویبسط والیه ترجعون**''(تم میں کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تا کہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے؟ گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور بڑھانا بھی، اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے)، اسی طرح اللہ تعالی کا سودی لین دین کی ممانعت کے بعد یہ ارشاد فرمانا:''**وإن تبتم فلکم رؤوس أموالکم لاتظلمون ولاتظلمون**''(اب بھی توبہ کرلو (اور سود چھوڑ دو) تو اپنا اصل سرمایہ لینے کے تم حقدار ہو نہ تم ظلم کرو اور تم پر ظلم کیا جائے)(۲۵۱) بھی اس کی دلیل ہے، مذکورہ آیات کا تقاضا یہ ہے کہ قرض خوشدلی سے دیا جائے، نہ کہ احسان جتا کر اور مقروض کو ستا کر، اور قرض لینے والے پر فرض ہے کہ وہ قرض کا مال بغیر اضافہ کے لوٹائے، ورنہ اضافہ کی صورت میں سود ہوجائے گا، اگر چہ قرض لینے والے کے لئے جائز ہے کہ جو قرض اس نے لیا ہے اس سے بہتر لوٹائے، بشرطیکہ ایسا کرنے کا اسے پابند نہ کیا گیا ہو، اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے ''تم میں بہتر وہ ہے جو قرض چکانے کے اعتبار سے بہتر ہو''(۲۵۲)، اس کے علاوہ قرض لینے والے

۲۵۱- سورۂ بقرہ:۲۴۵، سورۂ آل عمران:۱۱۲

۲۵۲- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق ۳/ص ۲۳۷-۲۴۲، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق (طبعۃ الشہب) ج ۱ ص ۴۴۱-۴۴۳۔

کے لئے قرض دینے والے کو تحفہ دینا بھی جائز نہیں ہے، جب تک کہ ان کے درمیان اس طرح کا لین دین پہلے نہ ہوا ہو، اس لئے کہ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو قرض دے اور وہ مقروض اسے ہدیہ دے یا اپنی سواری پر سوار کرے تو قرض دینے والے کو چاہئے کہ نہ اس کا ہدیہ قبول کرے اور نہ اس کی سواری پر سوار ہو، الا یہ کہ یہ سلسلہ ان دونوں کے درمیان پہلے سے جاری ہو (۲۵۳)۔

ایک رجحان یہ ہے کہ عام طور پر قرض کے معاہدوں کو ان معاہدوں میں شمار کیا جاتا ہے، جنہیں ممنوع اور مکروہ سمجھا جاتا ہے، اگر وہ سودی ہیں تو قرآن وسنت کے ذریعہ ان کی واضح ممانعت ہے، تاہم اگر وہ سودی نہیں ہیں تو وہ عطیات اور امداد کے معاہدوں کی طرح ہیں اور جائز ہیں، لیکن اسلامی حکومت کے لئے ایسے معاہدوں کو انجام دینا مکروہ ہے، سد ذرائع کے طور پر ان خطرات اور نقصانات سے محفوظ رہنے کی غرض سے جن کا سامنا اسلامی حکومت کو ان جیسے معاہدات کو انجام دینے کی وجہ سے کرنا پڑتا ہے، اس کی دلیل اللہ کے رسول ﷺ کا یہ قول ہے: ''**الحلال بين والحرام بين وبينهما أمور مشتبهات، فمن ترک ما شبه له فيه من الإثم، كان لما استبان أترک—ومن اجترأ على ما فيه شبهة من الإثم أو شک أن يواقع مااستبان،والمعاصى حمى الله، فمن حام حول الحمى أو شک أن يواقعه**'' (۲۵۴) (جو چیز حلال ہے وہ واضح ہے اور جو چیز حرام ہے وہ بھی واضح ہے، اور ان دونوں کے درمیان مشتبہ امور ہیں، پس جو شخص اس چیز کو چھوڑ دے جس میں گناہ ہونے کا شبہ ہو تو وہ اس چیز کو جس کا گناہ ہونا واضح ہے زیادہ چھوڑنے والا ہوگا، گناہ اللہ تعالی کی چراگاہ ہے، جو چراگاہ کے اردگرد گھومتا رہے گا قریب ہے کہ اس میں داخل ہو جائے''۔

۲۵۳- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق ۳/ص ۲۳۷-۲۴۲، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق (طبعۃ الشہب) ج ۱ ص ۴۴۱-۴۴۳۔

۲۵۴- صحیح مسلم، مرجع سابق۔

اس روایت سے سمجھ میں آتا ہے کہ اسلامی حکومت کو چاہئے کہ وہ اس طرح کے شبہات کے حامل معاہدوں سے اجتناب کرے، جس کی وجہ سے پہلا خطرہ یہ پیش آتا ہے کہ قرض دینے والے کے سامنے اسلامی حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے کا دروازہ کھل جاتا ہے، خاص طور پر جب قرضوں پر قرضے جمع ہوجائیں اور قرض دہندہ قرض کی ادائیگی کی تنظیم پر کڑی نگاہ رکھنے اور محصولات اور اخراجات کو کنٹرول کرنے کے لئے مداخلت کرنے کی ضرورت کا دعوی کرے، جیسا کہ عرب دنیا میں مغربی سامراج کی تاریخ اس حقیقت کو واضح کرتی ہے(۲۵۵)، اسی طرح اسلامی حکومت کو چاہئے کہ وہ غیر سودی قرضوں اور امداد لینے سے بھی گریز کرے، کیونکہ اس سے حکومت کے بجٹ پر ناقابل برداشت بوجھ پڑے گا، خاص طور پر جب ادائیگی کے لئے آخری تاریخ مقرر کی جائے، اور ادائیگی میں کوتاہی ہوجائے، جس کی وجہ سے قرض بڑھ جائے، اور حکومت کے بجٹ پر ایک طرح سے ایسا دباؤ پڑ جائے جس کی وجہ سے وہ قرضوں کی ادائیگی کی خاطر قرض لینے کی تنگی میں مبتلا ہونے پر مجبور ہوجائے، اور اس کی مقامی کرنسی کی قدر و قیمت بھی گھٹ جائے(۲۵۶)۔

درحقیقت سابقہ رائے کی تائید دو بنیادی حقائق سے ہوتی ہے، جن میں پہلی یہ ہے کہ سود کی حرمت سے متعلق مذکورہ بالا آیات اور احادیث میں قطعی احکام موجود ہیں، جو اس ممانعت پر دلالت کرتے ہیں، اس کے علاوہ یہ کہ یہ آیتیں اور احادیث حرمت کے سلسلے میں عمومی اصول کے خلاف وارد ہونے والی اضطرار کی استثنائی حالت کی وضاحت نہیں کرتی ہیں، جیسا کہ بعض غذاؤں مثلاً مردہ گوشت، خون اور خنزیر کا گوشت کھانے کی ممانعت کے بارے میں حکم وارد ہوتا ہے، یا جبر کے معاملہ میں بھی جس کا مسلمان غیر اسلامی ملک میں شکار ہوجاتا ہے، چنانچہ سود سے

۲۵۵-۲۵۶- دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص۲۸۶-۲۸۹۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، الاسلام والمعاہدات الدولیۃ، مرجع سابق، ص۲۲۹-۲۳۰۔

متعلق آیات واحادیث کا حکم اپنی حتمیت ،عمومیت اور اطلاق میں اس حکم سے ملتا جلتا ہے جو مشرکین کے مسجد حرام کے علاقے میں مسلمانوں کے ساتھ تجارت کے لئے داخل ہونے کی ممانعت سے متعلق ہے، اگر چہ مسلمانوں کو اس ممانعت کی پابندی کے نتیجے میں مادی نقصانات کا یقین کامل ہو، کیونکہ مفسرین کے نزدیک اس پر اجماع ہے کہ جس وقت یہ آیت کریمہ "**إنما المشركون نجس فلايقربوا المسجد الحرام بعدعامهم هذا وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله إن شاء، الله إن الله عليم حكيم**" (مشرکین ناپاک ہیں، لہذا اس کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ پھٹکنے پائیں اور اگر تمہیں تنگ دستی کا خوف ہے تو بعید نہیں کہ اللہ چاہے تو تمہیں اپنے فضل سے غنی کردے ، اللہ علیم وحکیم ہے) نازل ہوئی تو مسلمانوں کو معاشی تنگی کا اندیشہ ہوا، کیونکہ اس عمل کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قریب وبعید کے مختلف شہروں سے آنے والے تجار جو کاروبار کی غرض سے آتے تھے ان کی آمد کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا، علاوہ ازیں وہ لوگ ہدی کا جانور بھی لیکر آتے تھے، تو فورا اللہ تعالی کا یہ قول نازل ہوا: "**وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله ان شاء**" جو یہ بتلاتا ہے کہ مسلمان کو باوجود یکہ اللہ تعالی کی طرف سے وسعت دی گئی ہے، اور اس کا رزق عام وتام کیا گیا ہے، اسے اسباب کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور کمانے کھانے اور حصول رزق کے دیگر ذرائع کی تلاش وجستجو پر مامور کیا گیا ہے، جو حدود حرم میں مشرکین کے ساتھ تجارت کرنے سے ہٹ کر ہو، اور آیت کریمہ کو "**إن الله عليم حكيم**" پر ختم کیا ہے اس حقیقت سے واقف کرانے کی غرض سے کہ اللہ تعالی نے ۹ھ کے بعد مشرکین کو مسجد حرام سے قریب کرنے سے منع فرمایا اگر چہ اس کا نتیجہ حتمی طور پر یہ ہوگا کہ مشرکین کے ساتھ تجارت کا سلسلہ منقطع ہوجائے گا، مگر اللہ تعالی مسلمانوں کی معاشی تنگی اور خوشحالی جو مستقبل میں پیش آنے والی ہے، سے خوب واقف ہے(۲۵۷)۔

۲۵۷- القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج۸،ص۱۰۶-۱۰۷، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع

مذکورہ رجحان کی معقولین کی تائید میں دوسری حقیقت یہ ہے کہ اگر ایک طرف مذکورہ بالا رائے کے نتیجہ میں اسلامی مملکت اور دیگر غیر اسلامی ممالک اور گروہوں کے درمیان تجارتی تبادلے اور اقتصادی تعلقات کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی شریعت کے کسی متن یا حکم عام سے متصادم نہ ہوں، اسلامی مملکت کو درپیش حالات جس طرح کے بھی ہوں، تو دوسری طرف اس کا یہ مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اسلامی حکومت کو غیر اسلامی حکومت کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی سرگرمیاں انجام دینے سے روک دیا جائے، یا یہ کہ مذکورہ رجحان کی منطق کو اپنانا ترقیاتی کوششوں اور ان کے تقاضوں کی راہ میں رکاوٹ بن جائے، جس کے نتیجہ میں اسلامی مملکت کو قرض کے معاہدوں کے لئے مجبور ہونا پڑے، خلاصہ کلام یہ کہ بہت سے دوسرے دروازے ہیں جن کے ذریعہ اسلامی مملکت غیر اسلامی ممالک سے اس سلسلے میں اپنی ضرورت کا سامان، مواد یا مشینیں حاصل کرسکتی ہے، جیسا کہ اس وقت ہوتا ہے جب یہ چیزیں ''کریڈٹ پر فروخت'' معاہدوں کے ذریعہ درآمد کی جاتی ہیں یا جنہیں موجودہ تجارتی لین دین میں (Credit Facilities) ''قرض کی سہولت'' کہا جاتا ہے، اسلام میں ادھار پر فروخت کرنے کی ممانعت نہیں ہے، اگر شئ کی دو قیمتیں ہوں جن میں سے ایک خریدار کی طرف سے شئ کی وصولی کے بعد فوراً ادا کی جاتی ہے، اور دوسری ایک متعینہ وقت کے لئے مؤخر کردی جاتی ہے، یا الگ الگ قسطوں میں ہو، فطری طور پر یہ موجودہ قیمت سے زیادہ ہوگی، اور ادھار پر فروخت کرنا سود نہیں سمجھا جائے گا، کیونکہ اس قسم کی فروختگی میں خریدار کو اس کی موجودہ قیمت پر فروخت کی گئی چیز حاصل نہیں ہوتی، جبکہ موجودہ لین دین میں اس

سابق ج ۳، ص ۳۴۶-۳۴۷، ۵۷۸-۵۷۹، ۵۸۹، الطبری، تفسیر الطبری، مرجع سابق، ج ۱۴، ص ۱۹۲-۱۹۸، محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق ج ۱۰، ص ۲۰۷ اور اس کے بعد کے صفحات، ج ۱۰، ص ۲۰۷ اور اس کے بعد کے صفحات، السیوطی، اسباب النزول، مرجع سابق، ج ۱ ص ۱۶۲، ابن القیم الجوزیۃ، احکام اہل الذمۃ، مرجع سابق، ج ۱ ص ۱۷۵-۱۷۷، وتشیر التفاسیر-فی جملها-الی ان الجزیة التی فرضت علی اهل الکتب کانت هی السبیل التی اغنی الله بهاالمسلمین عن حاجتهم للتجارة مع المشرکین۔

کا سودخریدار پر بہ طور قرض لکھا جاتا ہے، مشتری بیچی جانے والی شئ کو متعینہ وقت کے عوض خریدتا ہے، لیکن اس کی ادائیگی مؤخر ہوتی ہے، جس طرح مشتری کو یہ حق ہے کہ موجودہ ثمن کی قیمت پر معاہدہ کے دائرہ کار میں سودے بازی کرے، اسی طرح اسے مؤخر قیمت پر بھی سودے بازی کا حق حاصل ہے(۲۵۸)، اور ادھار پر بیچنے کا جواز اور اس سلسلے میں سودے بازی کا جواز اس عمومیت پر مبنی ہے جو اللہ تعالی کے اس فرمان سے ظاہر ہوتا ہے،'' خدا نے خرید وفروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے'' نیز اس کی ممانعت کی کوئی دلیل نص سے ثابت نہیں ہے، حدیث سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے ایک نیلامی کے طور پر لوگوں سے پیالہ اور کمبل فروخت کیا ہے(۲۵۹)۔

جب اتنی بات طے شدہ ہے کہ اقتصادی اور تجارتی لین دین کے دائرہ میں غیر اسلامی حکومت کے ساتھ اسلامی حکومت جس معاہدہ کو انجام دینا چاہتی ہے اس کے موضوع اپنے عموم اور کلیہ کے اعتبار سے اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ معاہدہ اپنے احکام وشرائط میں کتاب وسنت سے صراحۃً ثابت شدہ کسی حکم عام یا نص سے نہ ٹکراتا ہو، جیسے اسلامی حکومت کے لئے یہ منع ہے کہ وہ تجارتی اور اقتصادی معاہدہ کرتے وقت معاہدہ میں شریک دوسرے فریق سے اسلامی حکومت کے لئے شراب یا خنزیر درآمد کرنے پر اتفاق کرلے، اسی طرح شرعاً مسلمانوں کے لئے ممنوع ہے کہ وہ ایسے معاہدے کریں جن میں غیر اسلامی حکومت کے لئے جنگی آلات برآمد کرنے کی بات کہی گئی ہو، بالخصوص جبکہ دونوں ممالک کے درمیان عملی طور پر جنگ جاری ہو، اسلامی حکومت کے لئے یہ بھی درست نہیں کہ اس کے اور غیر اسلامی حکومت کے درمیان ہونے والے معاہدے میں کوئی ایسی شق شامل ہو جس میں متأخر الذکر حکومت کو سرمایہ کاری کے منصوبوں کو زمین پر اتارنے، اور

۲۵۸-۲۵۹-الشوکانی، نیل الاوطار، مرجع سابق، ج۷، ص۱۸۹۔ دکتور محمد علی الحسن، مرجع سابق، ص۲۹۱۔

تجارتی لین دین کو مستحکم کرنے کی خاطر مقامات مقدسہ میں داخل ہونے کی اجازت دی گئی ہو(۲۶۰)، اسلامی حکومت اور غیر اسلامی گروہوں اور مملکتوں کے درمیان تجارتی اور اقتصادی تعلقات کے تبادلے میں جن امور کی رعایت ضروری ہے ان میں ایسے معاملات کی نگرانی اور ان پر نظر رکھنا بھی شامل ہے، جن میں افراد اپنے نجی معاہدوں میں، یا حکومت اپنے بین الاقوامی معاہدوں میں، کسی ایسے غیر اسلامی حکومت سے تعلق رکھنے والے تاجروں کو جو اسلامی حکومت سے برسر پیکار ہو، متأخر الذکر حکومت یعنی اسلامی حکومت کی سرزمین میں داخل ہونے کی اجازت دے، یہ اس لئے تا کہ ان کے اسلامی مملکت کے اندر گھومنے پھرنے اور ان کے ذریعہ یہاں کے اور اندرونی حالات پر قریب سے نظر رکھنے کی وجہ سے پیدا ہونے والے کسی بھی طرح کے خطرے اور نقصانات کا خاتمہ کیا جا سکے(۲۶۱)، بلکہ فقہاء کے ایک گروہ کا کہنا ہے کہ جن چیزوں کو عام طور پر اسٹریٹجک اشیاء یا مواد کہا جاتا ہے، انہیں ایسے غیر اسلامک اسٹیٹ کے لئے برآمد کرنا جو اسلامی مملکت سے برسر جنگ ہو، حرام ہے(۲۶۲)، جیسا کہ اس طرح کے غیر اسلامی ملک میں جنگی ساز و سامان یا وسائل حمل و نقل اور غذائی اشیاء برآمد کرنے کا حکم ہے۔ ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ ان جیسے سامان میں اسلامی حکومت سے برسر پیکار غیر اسلامی حکومت کے ساتھ ان اشیاء کی تجارت کے نتیجہ میں مسلمانوں سے لڑ رہے غیر مسلموں کو تقویت حاصل ہوگی، اور ان کی امداد ہوگی، اس کے علاوہ یہ معصیت کے کاموں پر تعاون کے زمرہ میں شامل ہے، جسے شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے (۲۶۳)، اسی طرح اگر ایک طرف اسلامی حکومت کے لئے جائز ہے کہ وہ

۲۶۰- مرجع سابق، ص ۸۰۔

۲۶۱- مالک، المدونۃ الکبری، مرجع سابق، ج ۳، ص ۱۰۲، ابن قیم الجوزیۃ، احکام اہل الذمۃ، مرجع سابق، ج ۱، ص ۱۵۶-۱۶۰۔

۲۶۲-۲۶۳- ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۸، ص ۵۳۱۔ مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۲۹۹-۳۰۰، الماوردی،

معاہدوں یا اجتماعی معاہدوں میں بین الاقوامی تجارتی لین دین کو منظّم کرنے کی خاطر بحیثیت فریق شرکت کرے، تو وہیں دوسری طرف اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس سلسلے میں ایسے ضوابط یا معاملات کی پابندی نہ کرے جو اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے متصادم ہوں، جیسے بین الاقوامی تجارت کے میدان میں "GATT" جیسا کوئی معاہدہ کیا جائے جو تمام فریق ممالک کے درمیان کسٹم ڈیوٹی کے تقاضوں کے حوالے سے کسی بھی طرح کا فرق نہ کرنے کا فیصلہ کر چکا ہے، اور اسلامی قانون کی عمومی شقیں باہم اسلامی ممالک کے درمیان ان ڈیوٹی کو کم کرنے یا ختم کرنے کا تقاضا کرتی ہوں تو ایسی صورت میں اسلامی ممالک کے درمیان خصوصی تعلقات کے حوالے سے "GATT" معاہدہ کی اس شق کی نسبت سے تحفظ کا اظہار ضروری ہے ی پھر اسلامی ممالک اور بین الاقوامی معاہدوں کو ناقابل عمل قرار دے کر آپس میں کچھ خاص معاہدے کی جگہ اسلامی شریعت کے قاعدوں اور ضابطوں کو زیر عمل لائیں (۲۶۴)۔

الاحکام السلطانیۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۹۱۔

۲۶۴- دکتور محمد عبد المنعم عفر، مرجع سابق، ص ۱۵۳۔ اور عمومی طور پر اسلامی ریاست کی اقتصادی سرگرمی کو اللہ تعالی کے مقرر کردہ طریقے پر مبنی ہونا چاہئے اور اس کی شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہونا چاہئے، کیونکہ اگر ایسا نہ ہو تو یہی بات ریاست اور فرد کے تمام نظام کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے، یہی بات سورۂ کہف کی آیات سے مستفاد ہوتی ہے، چنانچہ کھیتیاں، درخت، پھل اور اس کے اطراف میں بہنے والی نہریں یہ سب اس کے مالک کو کوئی نفع نہیں دے سکتے، کیونکہ ان کی بنیاد تقوی اور ایمان پر نہیں ہے۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ۸۳-۸۵، ۳۹۵، ۴۲۱-۴۲۲۔

چوتھا مبحث

سفراء کا تقرر اور دوطرفہ سفارت کاری اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

چوتھا مبحث

سفراء کا تقرر اور دوطرفہ سفارت کاری اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات کا ایک ذریعہ

حقیقت یہ ہے کہ سفراء اور سفارت خانوں کا تبادلہ اس طور پر کہ وہ قوموں کے درمیان نقطہ اتحاد و اتصال ہے، چاہے اس کی شکل دوامی ہو یا چاہے عارضی، ان مسائل میں شمار ہوتا ہے، جن کی جڑیں بڑی گہری ہیں، اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ جب سے انسانی گروہوں اور ہستیوں کا وجود اس دنیا میں ہوا، اس وقت سے ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنے کو منفرد محسوس کرتا ہے، اس لئے اس کے نزدیک جنگ اور امن دونوں حالتوں میں موجود تعلقات اور تعاملات کو منظّم کرنے کے واسطے باہمی تعلقات کے درمیان کچھ ضروری اور لازمی امور کا طے کرنا ہر حال میں مطلوب ہے(۲۶۵)۔

ایک طرف موجودہ بین الاقوامی زندگی ممالک کے درمیان تعلقات کے قیام اور تبادلے کے اس پہلو میں ایک بنیادی ترقی کو ظاہر کرتی ہے، خاص طور پر اس ترقی کو جس کا تعلق

۲۶۵- اس میں دیکھئے: ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح للرسالۃ والسفارۃ، مرجع سابق، ص ۱۱۰ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور عمر کمال توفیق، الدبلوماسیۃ الاسلامیۃ والعلاقات السلمیۃ مع الصلیبیین، الاسکندریۃ، مؤسسۃ شباب الجامعۃ ۱۹۸۶ء، ص ۲۱-۲۲، ویشیر الی أن المسلمین منذ فترۃ مبکرۃ من تاریخھم عرفوا العلاقات الدبلوماسیۃ کوسیلۃ اساسیۃ فی سیاستھم الخارجیۃ ومارسوھا فی علاقاتھم مع الدول غیر اسلامیۃ، دکتور علی صادق ابوہیف القانون الدبلوماسی والتفصلی، الاسکندریۃ منشأۃ المعارف، ۱۹۶۷ء، ص ۵، اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور عز الدین فودۃ، النظم الدبلوماسیۃ، القاہرۃ، مکتبۃ الاداب، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۸۹ء، ص ۲۰ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، بیروت، دار الکتاب الجدید، ط ۱۱، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳ء، ص ۱۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

سفراءاور سفارت خانوں کے تبادلہ سے ہوتا ہے، اس کے علاوہ ان افعال اور کاموں میں بھی ترقی ہوئی ہے جو اس میدان میں قاصد اور ایلچی کے ذمے کئے جاتے ہیں، اس ترقی کے علاوہ جو استثناء اور مراعات کے دائرہ میں واقع ہوئی ہے، جس سے وہ ان افعال اور کاموں کو انجام دیتے وقت مستفید ہوتے ہیں، اگر ایک طرف ایسا ہے تو دوسری طرف اس ابلاغی عمل کے جوہر کا ہر زمانہ میں اور مختلف ادوار میں ایک طرح کا تسلسل پایا جاتا ہے، یہاں تک کہ مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کی ترقی سے متعلق ایک مخصوص دور میں قاصدوں اور سفارت خانوں کے سیاسی تبادلے کے معاملے کو انجام دینے کے درمیان اور اسی مسئلہ سے کسی دوسرے دور میں نمٹنے کے درمیان جو فرق ہے وہ صرف تفصیلات اور جزئیات میں ہے، اور کبھی یہ فرق مصداق اور اصطلاح میں ہوجاتا ہے، چاہے یہ فرق زیادہ ہو یا کم ہو اس بحث میں پڑے بغیر جسے عنقریب ہم بیان کریں گے، جو کچھ ہونے والا ہے اور جو کچھ ہو چکا ہے کے درمیان عصری بین الاقوامی برادری اور اکائیوں کی طرف سے قاصدوں اور سفارت خانوں کے باہمی تبادلے کے حوالے سے، کسی قسم کا خلا یا عدم تسلسل نہیں پایا جاتا، اسی طرح اگر ایک طرف متعدد سماجی، اقتصادی، عسکری اور ثقافتی ضرورتوں کی وجہ سے مختلف صورتوں میں قاصدوں اور سفارت خانوں کا تبادلہ ضروری ہے، تو دوسری طرف ضرورت دوسرے ممالک اور غیر اسلامی اداروں کے ساتھ اسلامی مملکت کے تعلقات کے حوالے سے زیادہ شدید اور قوی تر ہوجاتی ہے۔

اس بات کے پیش نظر کہ اسلامی قانون تمام لوگوں کے لئے ایک عمومی دعوت کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی وجہ سے اصحاب اقتدار پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ روئے زمین کے تمام گوشوں میں موجود غیر مسلموں تک مختلف طرح کے وسائل اور ذرائع سے کام لیتے ہوئے اس دعوت کو صاف ستھرے انداز میں پہنچائیں۔

تاہم اگر ایک طرف قاصدوں اور سفارت خانوں کا تبادلہ جسے عصری بین الاقوامی

تعلقات میں ''سفارتی نمائندگی'' کہا جاتا ہے، ایک اہم ترین ذریعہ ہے، جسے اسلامی ریاست اپنے خارجہ تعلقات کے مطلوبہ اہداف اور مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرتی ہے، تو دوسری طرف اس ذریعہ کی نوعیت کی اصل، اور اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات میں اس کی اہمیت سے واقفیت کا تقاضا ہے کہ بہت سے ان مسائل اور موضوعات کو حل کیا جائے جن کا تعلق اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے اس قسم کے باہمی تعلقات کی شرعی بنیاد کی وضاحت سے گہرا ہے، نیز ان جسمانی، اخلاقی اور علمی صفات وشرائط کا جائزہ لیا جائے جن سے ان لوگوں کا متصف ہونا ضروری ہو جنہیں اسلامی سفارت کے لئے منتخب کیا جائے، اسی طرح قاصدوں اور سفراء کو بھیجنے اور ان کے استقبال کی خصوصی کاروائی کو انجام دینے، نیز مستقل سفارتی نمائندگی کے بارے میں اسلامی کے بارے میں اسلامی قانون کی پوزیشن کو واضح کرنے کی ضرورت ہے، جو عصری بین الاقوامی تعلقات کی خصوصیت بن چکی ہے، ساتھ ہی ان فرائض کی بھی تفصیل بیان کی جانی چاہئے جو اسلامی سفارت پر مامور افراد کو متعلقہ ممالک میں ادا کرنے ہوتے ہیں، علاوہ ازیں وہ امتیازات ومراعات بھی بیان کئے جانے چاہئیں جن سے سفارتی ذمہ داریوں کو انجام دیتے وقت اسلامی سفارت کار فیض یاب ہوتے ہیں اور اس شرعی بنیاد کی بھی تحدید ہونی چاہئے جس پر یہ امتیازات مبنی ہوتے ہیں، اسی طرح ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں معاصر بین الاقوامی قانون اور اسلامی شریعت کے درمیان تعلقات کے احکام بھی بیان کر دیئے جائیں، اسلامی سفارت کے اختتام کی خصوصی شکلوں کے علاوہ۔

ذیل کی سطروں میں اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومتوں اور گروہوں کے درمیان سفارت خانوں اور قاصدوں کے تبادلہ کے احکام سے متعلق مذکورہ مسائل کی تفصیل بیان کی جارہی ہے۔

پہلا مطلب

سفراء کا تقرر اور باہمی سفارت کاری کی شرعی بنیاد

اسلامی حکومت اور غیر اسلامی حکومتوں اور گروہوں کے درمیان قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلہ کے متعلق اسلامی شریعت کے عمومی احکام میں غور وفکر کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ان احکام سے متعلق واضح اور طاقتور دلائل پائے جاتے ہیں جو ممالک کے درمیان تعلقات کو استوار کرنے کے لئے اس قسم کے ذرائع کا سہارا لینے کے جواز پر دلالت کرتے ہیں، اور یہ ایک ایسی ضرورت بن جاتے ہیں جس کا لحاظ دعوت اسلامی کے مزاج کے مطابق ہر حال میں ضروری ہوجاتا ہے، اسی طرح یہ ایک ذمہ داری کی صورت میں سامنے آتے ہیں کہ ان کا نفاذ اور ان کے تقاضوں کی تکمیل اسلامی حکومت اور دیگر حکومتوں اور گروہوں کے باہمی تعلقات کو برقرار رکھنے اور انہیں منظّم کرنے کے لئے فرض سمجھا جاتا ہے۔

سب سے پہلے جو قرآنی آیت سفارت خانوں اور قاصدوں کے تبادلہ کی شرعی حیثیت کے متعلق ہمارے سامنے آتی ہے، وہ اللہ تعالی کا یہ قول ہے: ''**يأيها الناس إنا خلقناكم من ذكروأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أكرمكم عند الله أتقاكم**'' (۲۶۶) (لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے)، اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ مختلف قبیلوں، گروہوں اور قوموں کے درمیان جو تعلقات ہوتے ہیں وہ آپسی تعاون بھائی چارہ اور ایک دوسرے کی امداد وتعاون پر مبنی ہوتے ہیں، علاوہ ازیں اللہ تعالی کے قول: ''**إن أكرمكم عند**

۲۶۶- سورۂ حجرات: ۱۳۔

الله أتقاكم'' سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ چونکہ دعوت اسلامی ہمہ گیر ہوتی ہے، اور سارے انسان اس سے فیضیاب ہوجاتے ہیں اس لئے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سبھی پرچم اسلام کے سایہ میں زندگی بسر کرنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ تقوی ان کے درمیان خالق کے سامنے برتری کا معیار قرار پاتا ہے، اور ظاہر ہے کہ قاصدوں کو بھیجنا اور سفارت خانوں کا تبادلہ ان ذرائع اور وسائل میں سرفہرست ہوتا ہے جن کے ذریعہ مذکورہ آیت میں شامل مقاصد واہداف کی تکمیل ہوتی ہے اور جن کی وجہ سے جیسا کہ گزر چکا ہے باہمی تعارف بھائی چارہ ایک دوسرے کا تعاون اور اسلام کی اشاعت کی شکل میں نظر آنے والے مقاصد بھی پورے ہوتے ہیں (۲۶۷)۔

اس کے علاوہ سورہ نمل کی آیتیں ہیں جن کا سلیمان علیہ السلام اور بلقیس کے درمیان تعلقات کے تبادلہ سے گہرا ربط ہے، جن میں بلقیس اور اس کی قوم کو اللہ رب العالمین کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی دعوت دی گئی ہے، ان میں چند ایسے احکام ہیں جو اسلامی مملکت اور دیگر غیر اسلامی مملکتوں اور گروہوں کے درمیان سفارت خانہ اور قاصدوں کے تبادلہ کی شرعی حیثیت کو

۲۶۷- ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق ج ۴، ص ۶۱۴-۶۱۵۔

الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۴، ص ۳۷۴-۳۷۵، اور اس آیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی کے فرمان ''**لتعارفوا**'' کا مقصد یہ ہے کہ لوگ ایک دوسرے کو جانیں، اور یہ سیکھیں کہ نسب اور تعلقات کیسے قائم ہوتے ہیں، اور جو حکمت اللہ تعالی نے قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کرنے میں رکھی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے نسب کو پہچانے، تاکہ کوئی شخص اپنے آباء واجداد سے ہٹ کر کسی اور کی طرف نسبت نہ کرے، نہ یہ کہ وہ اپنے آباء واجداد پر فخر کرے، کیونکہ اللہ تعالی نے وہ صفت واضح فرمادی ہے جس کے ذریعہ انسان دوسروں پر فضیلت حاصل کرتا ہے، اور اسی سے وہ اللہ کے نزدیک عزت وکرامت حاصل کرتا ہے۔

دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۸۴-۵۸۵، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ سورۃ الحجرات کی آیت ''**لتعارفوا**'' لوگوں سے بغیر کسی امتیاز کے خطاب کرتی ہے، خواہ ان کا عقیدہ کچھ بھی ہو، اور یہ خطاب قوموں، قبیلوں اور مختلف گروہوں سے اجتماعی انداز میں ہے، مزید یہ کہ اس آیت کا حکم یہ تقاضا کرتا ہے کہ یہ قومیں اور قبیلے آپس میں ایسے تعلقات قائم کریں جو باہمی اخوت اور ایک دوسرے کی معرفت (تعارف) پر مبنی ہوں۔

واضح کرتے ہیں، جیسے کہ اللہ تعالی کا ہدہد کی زبانی یہ کہنا:"**فقال أحطت بما لم تحط به وجئتک من سبأٍ بنبأٍیقین**"(اس نے آ کر کہا: میں نے وہ معلومات حاصل کی ہیں جو آپ کے علم میں نہیں ہیں سبا کے متعلق یقینی اطلاع لے کر آیا ہوں)،اور سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدہد کو جو جواب دیا گیا اس کے تناظر میں یہ فرمانا:"**قال سننظر أصدقت أم كنت من الكاذبين، اذهب بكتابى هذا، فألقه اليهم،ثم تول عنهم فانظر ماذايرجعون** " (سلیمان نے کہا:ابھی ہم دیکھ لیتے ہیں کہ تو نے سچ کہا ہے یا تو جھوٹ بولنے والوں میں سے ہے، میرا یہ خط لے جا اور اسے ان لوگوں کی طرف ڈال دے، پھر الگ ہٹ کر دیکھ کہ وہ کیا ردعمل ظاہر کرتے ہیں)،اور اللہ تعالی کا بلقیس کی زبانی یہ کہنا:"**قالت يأيها الملؤا إني ألقي إليّ كتاب كريم، إنه من سليمان وإنه بسم الله الرحمن الرحيم، ألاَّ تعلوا عليّ وأتوني مسلمين**"(ملکہ بولی اے اہل دربار! میرطرف ایک بڑا اہم خط پھینکا گیا ہے، وہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اللہ رحمٰن ورحیم کے نام سے شروع کیا گیا ہے، مضمون یہ ہے کہ: میرے مقابلہ میں سرکشی نہ کرو اور مسلم ہو کر میرے پاس حاضر ہو جاؤ)،اسی طرح اللہ تعالی کا یہ ارشاد گرامی بلقیس کی زبانی سلیمان علیہ السلام کے خط کے جواب کے تناظر میں:"**وإنى مرسلة اليهم بهدية فناظرة بم يرجع المرسلون**"(میں ان لوگوں کی طرف ایک ہدیہ بھیجتی ہوں، پھر دیکھتی ہوں کہ میرے ایلچی کیا جواب لے کر پلٹتے ہیں)،اور اس کے بعد سلیمان علیہ السلام کو جب بلقیس کا خط اس کے قاصد کے ذریعہ موصول ہوا تو اس کے جواب کے تناظر میں اللہ تعالی کا یہ فرمانا:"**فلما جآء سليمان قال اتمدوننى بمال فما آتانى الله خير مما آتاكم بل أنتم بهديتكم تفرحون،ارجع اليهم فلنأتينهم بجنود لا قبل لهم بها ولنخرجنهم منها أذلة وهم صاغرون**"(۲۶۸)(جب وہ (ملکہ کا سفیر) سلیمان کے ہاں پہنچا تو اس نے

۲۶۸- سورۂ نمل:۲۲،۲۸،۳۷۔

کہا: کیا تم لوگ مال سے میری مدد کرنا چاہتے ہو؟ جو کچھ خدا نے مجھے دے رکھا ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جو تمہیں دیا ہے تمہارا ہدیہ تمہی کو مبارک ہے، (اے سفیر) واپس جا اپنے بھیجنے والوں کی طرف ہم ان پر ایسے لشکر لے کر آئیں گے جن کا مقابلہ وہ نہ کر سکیں گے اور ہم انہیں ایسی ذلت کے ساتھ وہاں سے نکالیں گے کہ وہ خوار ہو کر رہ جائیں گے)۔

مذکورہ تمام آیات مفسرین کی نظر میں غیر مسلموں کو اسلام میں داخل ہونے کی دعوت دینے کے سلسلے میں قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلہ کی شرعی حیثیت پر روشنی ڈالتی ہیں، اور تبادلہ کی تشکیل کا جو مقصد ہے، وہ طے ہے جس میں کبھی بھی کسی حال میں سودے بازی یا کمی اور کوتاہی قبول نہیں کی جا سکتی (۲۶۹)۔

اسی طرح وہ آیات جو آپ ﷺ پر رسالت نازل ہونے اور اللہ تعالی کی طرف سے تمام لوگوں تک اس کے مضامین کی تبلیغ اور احکام کی وضاحت سے متعلق ہیں، وہ سب کی سب غیر اسلامی گروہوں اور ممالک کی طرف خطوط، قاصدین اور سفارت کاروں کے بھیجے جانے کے شرعی جواز ہی نہیں بلکہ وجوب کو بتلاتی ہیں، جن کا مقصد انہیں مذہب اسلام کی حقیقت سے واقف کرانا اور انہیں اپنے مسئلہ کا مکمل شعور ہو جانے کے بعد اسلام قبول کرنے کی دعوت دینا ہے، مثال کے طور پر اللہ تعالی کا یہ ارشاد: "**يأيها الناس إنا أرسلناک شاهدا ومبشرا ونذيرا وداعيا إلى الله بإذنه وسراجا منيرا**" (اے نبیؐ، ہم نے تمہیں بھیجا ہے گواہ بنا کر، بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا بنا کر اور روشن چراغ بنا کر)، اسی طرح یہ ارشاد: "**الله يصطفي من الملائكة رسلا ومن الناس**" (حقیقت یہ

۲۶۹- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق ج۳ص۳۶۲، سید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۸۵ء)، ج۵ص۲۶۴۰-۲۶۴۱، القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق ج۱۳ص۱۹۱-۲۳۳، ویشیر الی أن قوله تعالی: "اذهب بكتابی هذا فالقه اليهم" دليل على ارسال الكتب الى المشركين وتبليغهم الدعوة، ودعائهم الى الاسلام، وقد كتب النبی الى كسرى وقيصر والى كل جبار۔

ہے کہ اللہ (اپنے فرامین کی ترسیل کے لئے) ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی)، نیز اللہ تعالی کا یہ قول :"**كان الناس أمة واحدة، فبعث الله النبيين مبشرين ومنذرين وأنزل عليهم الكتاب بالحق ليحكم بين الناس فيما اختلفوا فيه**" (ابتداء میں سب لوگ ایک ہی طریقہ پر تھے (پھر یہ حالت باقی نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے) تب اللہ نے نبی بھیجے جو راست روی پر بشارت دینے والے اور کج روی کے نتائج سے ڈرانے والے تھے، اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تا کہ حق کے بارے میں لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے)، اس کے علاوہ اللہ تعالی کے درج ذیل ارشادات بھی مذکورہ مسئلہ کی بھرپور وضاحت کرتے ہیں، "**يأيها الرسول بلغ ما أنزل اليک من ربک، وإن لم تفعل فما بلغت رسالته**" (اے پیغمبرؐ! جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچادو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا)، "**فإنما عليک البلاغ وعلينا الحساب**" (بہر حال تمہارا کام صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے)، "**الحمد الله الذى أنزل على عبده الكتاب ولم يجعل له عوجا قيما لينذر بأسا شديدا من لدنه ويبشر المؤمنين**" (تعریف اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل کی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی، ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب، تا کہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کردے)، "**فذكر انما أنت مذكر لست عليهم بمصيطر**" (اچھا تو (اے نبیؐ) نصیحت کئے جاؤ، تم بس نصیحت ہی کرنے والے ہو، کچھ ان پر جبر کرنے والے نہیں ہو) (۲۷۰)۔

یہ ساری آیتیں پوری وضاحت اور مضبوطی کے ساتھ اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام میں داخل ہونے کی لازمی طور پر دعوت دی جائے، اور خطوط روانہ

۲۷۰- ترتیب وار دیکھیں: سورۂ احزاب: ۴۵، ۴۶، سورۂ حج: ۷۵، سورۂ مائدہ: ۶۷، سورۂ بقرہ: ۲۱۳، سورۂ کہف: ۱-۲۔

کرنا، قاصدوں اور سفارت خانوں کا تبادلہ ان ذرائع اور وسائل میں سرفہرست ہے جن سے اس مقصد کو مکمل کیا جاسکتا ہے، اور ایسا اس واضح حقیقت کی وجہ سے ہے کہ دعوت، تنبیہ اور تبلیغ تمام پرامن ذرائع ہیں جو منطقی طور پر اور لازمی طور پر پرامن ذرائع کی پیروی کے متقاضی ہیں، علاوہ ازیں رسولوں کی ذمہ داری ''جیسا کہ آیتوں سے واضح ہوتا ہے'' تذکیر پر منحصر ہوتی ہے، انہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کہ لوگ نہ غور کر رہے ہیں اور نہ نصیحت حاصل کر رہے ہیں، اور اسی طرح لوگوں پر اس طرح مسلط نہیں کئے جاتے کہ ان سے بالجبر جو چاہیں کرالیں (۲۷۱)۔

حدیث میں بہت سے احکام وارد ہوئے ہیں جو سفراء اور نمائندوں کو روانہ کرنے، ان کے طریقہ استقبال کی وضاحت، اور ان کے متعلق اس یقین دہانی سے مربوط ہیں کہ جو ذمہ داریاں دے کر انہیں بھیجا جارہا ہے انہیں وہ بہتر طریقہ پر ادا کریں گے، ان احکام کے ذریعہ ممالک اور گروہوں کے درمیان تعلقات قائم کرنے، اور ان تعلقات کی پرامن صورت کے تبادلہ کی شرعی حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے، چاہے ممالک کا اندرونی نظام اور صورتحال ایک

۲۷۱- الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج۱ص۲۵۵-۲۵۶، ج۲،ص۷۰۲-۷۰۳، ج۳،ص ۵۴۶-۵۴۷، ج۴،ص۷۴۵۔ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج۵،ص۸۶۶، محمد رشید رضا، تفسیر المنار، ج۶، العدد۲۹،ص۳۸۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق ج۳،ص۳۰-۳۳، ج۶،ص۳۲۷، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق ،ص۷۷-۷۸، سید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق ج۲،ص۹۱۵، ۹۳۸، اور یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ مذکورہ آیات میں زیادہ تر ایک قطعی اور حتمی حکم موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے رب کی طرف سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسے مکمل طور پر پہنچادیں، اور کسی بھی قسم کی دنیاوی یا انسانی لحاظ کو خاطر میں نہ لائیں، جب وہ حق بات بیان کریں، اگر انہوں نے ایسا نہ کیا، تو گویا انہوں نے (پیغام الٰہی) کو نہ پہنچایا، نہ ادا کیا، اور نہ ہی رسالت کی ذمہ داری کو پورا کیا، نیز رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد مؤمنین بھی اسی ذمہ داری کے مکلّف ہیں کہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دیں، لیکن انہیں اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کریں، کیونکہ عقائد دلوں میں جبر واکراہ سے پیدا نہیں ہوتے، دین میں جبر صرف منع ہی نہیں بلکہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہوتا، عمدۃ القاری، مرجع سابق، ج۱۸،ص۲۰۶۔

دوسرے سے مختلف ہو، چنانچہ ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے سال مسلمانوں اور قریش کے درمیان صلح ہوئی پھر وسیع پیمانہ پر دونوں جانب سفراء اور وفود کا تبادلہ ہوا، یہاں تک کہ ان تمام شرائط پر معاہدہ ہو گیا جن سے فریقین راضی تھے، قریش نے بدیل بن ورقاء خزاعی کو قبیلہ خزاعہ کے لوگوں میں بھیجا، پھر مکرز بن حفص بن احنف کو اور حلیس بن علقمہ (ابن زبان) کو، اس کے بعد عروہ بن مسعود ثقفی کو اور اخیر میں سہیل بن عمرو کو، اور اپنی طرف سے اللہ کے رسول ﷺ نے خراش بن امیہ کو پھر عثمان بن عفان کو یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ اور سہیل بن عمرو جو قریش کی طرف سے بھیجے گئے تھے کے درمیان صلح کی شرائط اور اس کے احکام پر مذاکرات مکمل ہو گئے، اور حدیبیہ کی صلح جب مکمل ہوئی تو آپ ﷺ نے یہ طریقہ کار اپنایا کہ سفراء کو پڑوس کے ممالک اور قبائل کے نام خطوط دے کر روانہ فرمایا، جن میں انہیں اسلام اور ہدایت کی پیروی کی دعوت دی، اس کی شہادت مثال کے طور پر وہ تمام خطوط دیتے ہیں جنہیں آپ ﷺ نے ہرقل جو روم کا بادشاہ تھا، کسری جو فارس کا حکمراں تھا اور مقوقس جو مصر میں برسر اقتدار تھا، اور نجاشی جس کے ہاتھ میں حبشہ کی باگ ڈور تھی، کے نام روانہ فرمائے تھے، اسی طرح مروی ہے کہ آپ ﷺ نے مسیلمہ کذاب کے دو سفراء سے فرمایا تھا: ''اگر سفارتوں کا قتل ناجائز نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا'' نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں نہ عہد کو توڑتا ہوں اور نہ سفراء کو روکتا ہوں'' (۲۷۲)، خلفائے راشدین کے دور میں اسلامی مملکت کے طرز عمل سے متعلق چند ایسے واقعات اور حقائق پائے جاتے ہیں جو غیر مسلم ممالک اور گروہوں کے ساتھ قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلے کی

۲۷۲- اور اس میں تفصیل سے دیکھیں: الخطابی، معالم السنن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۱۹، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۵۵۹-۵۶۰، ۶۰۰-۶۰۱۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، بیروت، مکتبۃ المعارف، ج ۲، ص ۲۶۲ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۹۵، ۹۸، الالبانی، صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ، ج ۱، ص ۲۸۳، ابن قیم الجوزیۃ، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مرجع سابق، ج ۲ ص ۷۵، محمد حمید اللہ، الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق، ص ۱۰۹-۱۱۰، ۱۳۵-۱۳۶، ۱۴۰۔ دکتور محمد رواس قلعۃ جی، قراءۃ جدیدۃ للسیرۃ النبویۃ، الکویت، دار البحوث العلمیۃ ۱۹۸۲ء، ص ۳۰۲، ۳۰۳، دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۳۲۲۔

نشاندہی کرتے ہیں، اور ایسا مؤخر الذکر کو اسلام قبول کرنے کی اور ان ضروریات اور سامانوں کے تبادلے کے ضمن میں ہوتا تھا، جن کی مسلمانوں کو ضرورت ہوتی تھی یا جو مسلمانوں کی ضرورت سے زائد ہوتے تھے، اسی زمرہ میں شامل ہے قاصدوں اور سفارت خانوں کا وہ تبادلہ جو ایک طرف حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی جانب سے اور دوسری طرف اسلامی ممالک کے پڑوس میں واقع حکومتوں اور ممالک بالخصوص روم اور فارس جیسی حکومتوں کی جانب سے ہوا کرتا تھا (۲۷۳)۔

اگر ایک طرف مندرجہ بالا تفصیلات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ قاصدوں اور سفارت خانوں کا تبادلہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان، اسلامی شریعت کے بنیادی مصادر میں موجود شرعی دلیل پر مبنی ہے، تو دوسری طرف یہ تبادلہ اپنی اس شرعی حیثیت کے علاوہ اسلامی حکومت کے خارجہ تعلقات کو منظّم اور جاری رکھنے کے حوالے سے لازم اور ضروری عمل کا درجہ رکھتا ہے، اس سلسلے کے تقاضے اور ضروریات ان رشتوں کی خاص نوعیت یا بنیادی خصوصیت پر مبنی ہیں جو اپنی ابتداء اور ارتقاء میں اس اسلامی عقیدہ کے ماتحت ہے جو ریاست کے ذمہ داروں سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ اسے عام کیا جائے اور دنیا کو اس سے باخبر کیا جائے، اسی کے ساتھ ساتھ خلیفہ یا سربراہ مملکت کی صلاحیتیں اسلامی حکومت کے خارجہ تعلقات سے جو مقاصد اور ذمہ داریوں کو تنہا انجام دینے کے قابل نہیں ہوتیں، اس لئے انہیں بہت سے معاونین اور سفارتکاروں سے نمائندوں کی شکل میں مدد لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، اس حقیقت کی وضاحت اللہ کے رسول ﷺ کے اس خطاب سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے: ''اے لوگو! اللہ تعالی نے مجھے رحمت اور نعمت بنا کر بھیجا ہے، اس لئے میرے متعلق مت جھگڑو جس طرح عیسی بن مریم کے متعلق ان کے حواری جھگڑتے رہے، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ حواری حضرات کیسے جھگڑتے رہے، تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: انہوں نے ان کو

۲۷۳- القلقشندی، صبح الاعشی، مرجع سابق، ج ۶، ص ۳۔ نجیب الارمنازی، الشرع الدولی فی الاسلام، دمشق، ۱۹۳۰ء، ص ۱۵۳۔ دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۳۲۳-۳۲۴۔

وہی دعوت دی جو میں نے تم کو دی ہے، تو جسے انہوں نے قریب کے مشن پر بھیجا وہ راضی رہا اور صحیح سالم رہا، اور جسے دور کے مشن پر بھیجا اس نے ناپسند کیا اور وہ بوجھ محسوس کرنے لگا، اس کی شکایت حضرت عیسی علیہ السلام نے اللہ تعالی سے کی تو بوجھل لوگوں میں سے ہر ایک اس قوم کی زبان بولنے لگا جس کی طرف سے اسے بھیجا گیا تھا(۲۷۴)، یہ واقعہ اپنے تمام تر مفہوم کے ضمن میں یہ بتاتا ہے کہ جب ذمہ داریاں پیچیدہ ہوجائیں، اور کام دو چند ہوجائیں ساتھ ہی سربراہ مملکت کا دائرہ اختیار وسیع ہوجائے تو اس وقت لازمی طور پر بعض ذمہ داریوں اور فرائض کی انجام دہی میں نمائندوں اور سفراء سے مدد لی جاتی ہے، اس میں سرفہرست غیر ملکی حکومتوں کے سامنے اسلامی حکومت کی نمائندگی ہوتی ہے، جس سے مسلمانوں کے حق میں فائدہ کا حصول اور ان کے مفاد ومصالح کی حفاظت ممکن ہوتی ہے(۲۷۵)، اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سفراء اور قاصدوں کے تبادلہ کی ضرورت شدید ہوجاتی ہے۔ یہ مفہوم اللہ تعالی کے قول: ''**يأيها الناس اناخلقناكم من ذكروأنثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا، إن أكرمكم عندالله أتقاكم**'' میں شامل ہے جس میں اسلامی ریاست کو دوسری ریاستوں سے الگ تھلگ کرنے کے نظریہ کو مسترد کردیا گیا ہے، اور ہمیشہ دوسری مملکت سے تعلقات استوار کرنے پر زور دیا گیا ہے، تاکہ دعوت اسلامی کے پھلنے پھولنے کے مواقع پیدا ہوں، اور آپسی بھائی چارہ اور ایک دوسرے سے تعارف کا سلسلہ جاری رہے، اور ایسا اسی وقت ہوسکتا ہے جب پرامن ذرائع کا استعمال کیا جائے، جن میں سرفہرست سفراء اور سفارت خانوں کا تبادلہ ہے(۲۷۶)۔

۲۷۴- ابن ہشام السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج۲،ص ۲۵۴، الطبری، تاریخ الطبری، مرجع سابق، ج۲،ص ۶۴۵، دکتور احمد محمد احمد، الجانب السیاسی فی حیاۃ الرسول، مرجع سابق، ص۱۱۱۔

۲۷۵-۲۷۶- انظر فی تعیین الرسل والسفراء تحت مایسمی بنظریۃ الاستنابۃ أوتفویض الاختصاص فی الفقہ الاسلامی: دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، القاہرۃ، دارالنہضۃ العربیۃ، طبع اول، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۵-۱۹۹، وانظر کذلک المراجع المشار الیہ فیہ، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۸۵۔ وراجع ایضا: ماسبق، ص ۴۳-۴۴۔

دوسرا مطلب

نمائندگان اور سفراء کے مطلوبہ اوصاف

قرآن کریم کی بعض آیات، رسول اللہ ﷺ کے طرز عمل اور خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے حکمرانوں کی سرگرمیوں پر غور کرنے سے جو قاصدوں اور سفراء کے انتخاب کے حوالے سے ہوا کرتی تھیں، یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس انتخاب میں باریک بینی سے کام لینے کی ضرورت ہے، اور ان صفات وشرائط اور صلاحیتوں کی تلاش ناگزیر ہے جو ایسی صفات کے حامل افراد کو غیر مسلموں کے سامنے اسلامی حکومت کی صحیح نمائندگی کے قابل بنائیں۔ اس لئے بعض مفسرین کی رائے ہے کہ اللہ تعالی کے قول: "**اذهب بكتابي هذا فألقه اليهم ثم تولَّ عنهم، فانظر ماذا يرجعون**" میں جو سلیمان علیہ السلام کی طرف سے ہدہد کے جواب پر مشتمل ہے جو ان کی نگاہ سے اوجھل ہو گیا تھا، اور ان کے پاس ملکہ سبا بلقیس کی خبر لے کر آیا تھا، قاصد اور سفیر کے انتخاب میں باریک بینی اور جانچ پڑتال سے کام لینے پر زور دیا گیا ہے، چنانچہ سلیمان علیہ السلام نے نامہ بری کے لئے ہدہد کو خصوصی طور پر ترجیح دی، اپنے زیر کنٹرول امانت دار جن، جو ہر طرح کے کام کرنے اور پہچاننے میں بڑے مضبوط ہوتے ہیں کو چھوڑ کر، اس لئے کہ انہیں اس میں علم وحکمت اور صحیح فراست کے آثار نظر آئے، تاکہ آئندہ کسی طرح کا عذر باقی نہ رہے(۲۷۷)، اور آپ ﷺ سے ثابت ہے کہ جب تک آپ ﷺ قاصدوں اور سفراء کو پڑوسی ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کے پاس بھیجتے رہے، اس وقت تک ہر جگہ کے لئے اس سفیر کا انتخاب فرماتے جو اس جگہ کو اچھی طرح جانتا، اور اس جگہ آباد قوم سے اور اس کی زبان سے واقف

۲۷۷- ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج ۴ ص ۱۹۴-۲۰۲۔ وانظر کذلک: الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۳، ص ۳۶۳-۳۶۶، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ۶۲-۶۳۔

ہوتا اس طرح کہ جب وہاں کے لوگ اسے دیکھتے تو اسے اپنا ہی فرد سمجھتے جو اپنی چال ڈھال اور لہجے میں ان سے الگ نہ ہوتا، اگرچہ طریقہ کار، رکھ رکھاؤ، برتاؤ اور شرافت کے اعتبار سے ان سے ممتاز ہوتا(۲۷۸)، اس کی وضاحت اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب آپ ﷺ نے حضرت عمر بن خطابؓ کو حدیبیہ کے سال قریش سے مذاکرات کرنے کی خاطر بھیجنے کا ارادہ فرمایا، جبکہ قریش نے خراش بن امیہ کو یہ ذمہ داری دینے کو مسترد کر دیا تھا، تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ ان کی جگہ عثمان بن عفانؓ کو بھیجا جائے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ کو قریش سے سخت عداوت تھی، اور مکہ میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو ان کی قریش سے حفاظت کرتا، اور اس لئے بھی کہ حضرت عثمانؓ کا تعلق بنو امیہ سے تھا، جس سے قریش کے لیڈر ابوسفیان کا بھی تعلق تھا، اس کی وجہ سے انہیں ایک طرح کی حمایت ملنے کا امکان تھا، جو ان کی مفوضہ ذمہ داریوں کی ادائیگی کے سلسلے میں معاون ثابت ہوتی، جب ایسا معاملہ درپیش ہوا تو اللہ کے رسول ﷺ نے مناسب سمجھا کہ عثمان بن عفانؓ کو بھیجا جائے، اور آپ ﷺ نے عملاً ایسا ہی کیا تا کہ وہ قریش سے بات کریں، اور ان کے سامنے اللہ کے رسول ﷺ کے اس سال مکہ آنے کے مقصد کی حقیقت واضح کر دیں(۲۷۹)، اسلامی حکومت میں عمومی انتظام سے متعلق وہ امور جس کے سپرد کئے جاتے ہیں اس کے انتخاب کے سلسلے میں اللہ کے رسول ﷺ نے عام طور پر مضبوط اصولی ضابطے وضع کئے ہیں، اس میں فطری طور پر بلاشبہ دیگر ممالک کے ساتھ اپنے خارجہ تعلقات میں اسلامی اسٹیٹ کی نمائندگی کرنا شامل ہے، اس لئے آپ ﷺ سے مروی ہے: ''جسے مسلمانوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے، اور وہ کسی ایسے شخص کو کوئی ذمہ داری سونپے جس سے بہتر فرد مسلمانوں کے حق میں موجود ہو، تو ایسے شخص کو اللہ اس کے رسول ﷺ کے ساتھ خیانت کرنے والا سمجھا جائے گا، اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب امانت ضائع کر دی جائے تو قیامت کا انتظار کرو''،

۲۷۸- دکتور محمد احمد، الجانب السیاسی فی حیاۃ الرسول، مرجع سابق، ص ۱۱۱۔

۲۷۹- دکتور محمد رواس قلعۃ جی، مرجع سابق، ص ۳۰۳۔

آپ ﷺ سے دریافت کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! امانت کیسے ضائع ہوتی ہے؟ فرمایا: جب ذمہ داری نااہل کو دے دی جائے''، اس روایت میں اس چیز کی دلیل ہے کہ جسے مسلمانوں کے مصالح کے تحفظ کے لئے منتخب کیا جائے، اس کا دوسروں کے مقابلے میں اس ذمہ داری کے لئے زیادہ اہل ہونا ضروری ہے، کیونکہ صاحب معاملہ یعنی اس ذمہ داری کو انجام دینے پر قدرت رکھنے والے لوگ سہاروں اور ستونوں کی طرح ہوتے ہیں (۲۸۰)، غیر مسلموں کے نزدیک اسلامی حکومت کے مصالح کے تحفظ اور اسلامی حکومت کی نمائندگی کی اہلیت وصلاحیت پر دلالت کرنے والے معیار وصفات مسلمانوں کے نزدیک متعدد ہیں، جن میں ظاہری جسمانی اخلاقی، سماجی اور ثقافتی صفات شامل ہیں، ان اوصاف کے ذریعہ نمائندگی پر مامور کئے جانے والے افراد کا اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دینا یقینی ہوجاتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قاصد یا سفیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ خوب رو ہو اور اس کا نام بھی اچھا ہو، اور اس کی راست گوئی، امانت داری، وفا شعاری اور پاکدامنی مشہور ہو، اچھے فضائل ومناقب کا حامل ہو، فطرت اور مزاج ومذاق کا اچھا ہو، کوئی بھی بات صاف ستھرے انداز میں کہنے پر قادر ہو، معاملات و مسائل کہاں سے پیدا ہوتے ہیں اس سے واقف ہو، ساتھ ہی معاملات ومسائل کی نوعیت کا اندازہ لگانے پر قادر ہو، اور جس چیز کا حامل ہے اس کا محافظ ہو، اسی طرح ضروری ہے کہ وہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام کا جانکار ہو، جو اس کے لئے دعوت اسلامی کو اچھے ڈھنگ سے پیش کرنے میں معاون ہو، اور جب اعتقادی معاملات میں مناظرہ اور مناقشہ ہو رہا ہو جس پر آدمی اپنے جیسے افراد سے سامنا کرتے وقت مجبور ہوجاتا ہے، تو اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے واقفیت اس کو ثابت قدم رکھنے میں مددگار ہو۔

۲۸۰- الحدیث الأول رواہ الحاکم والحدیث الثانی ذکرہ الشریف الرضی، المجازات النبویۃ، القاہرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۸۷ھ/۱۹۶۷ء، ص ۴۰۶-۴۰۷ (مشار الیہا فی: دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق ص ۲۰۰-۲۰۱۔

اور مختصر اور مؤثر طریقہ کار کے ذریعہ مقصد تک پہنچنے میں مدد ومعاون ہو(۲۸۱)، سفیر کے لئے شریعت کی عمومی دفعات سے واقفیت کی شرط یہ طے کرنے کی متقاضی ہے کہ کیا کسی غیر مسلم کو دوسرے ممالک میں اسلامی ریاست کی نمائندگی کے لئے سفیر مقرر کرنا جائز ہے؟، یہ بالخصوص عباسیوں، فاطمیوں، بادشاہوں اور ان کے بعد کے لوگوں کے زمانہ میں یہ ہوا کہ اسلامی مملکت کی طرف سے غیر اسلامی مملکتوں سے متعلق بعض خاص مشن کو انجام دینے کیلئے غیر مسلم سفراء بھیجے گئے (۲۸۲)، اس سلسلے میں جمہور فقہاء اس رائے کے قائل ہیں کہ غالب دینی مزاج والے امور میں کسی غیر مسلم کو اسلامی حکومت کا نمائندہ بنانا جائز نہیں، مگر جب مسئلہ غیر دینی ہو تو پھر

۲۸۱- اس سلسلے میں ''ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح للرسالۃ والسفارۃ'' کا مطالعہ کیجئے، مرجع سابق، ص ۲۰-۲۹، ص ۳۷-۳۸۔ القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج ۶ ص ۳۷۴-۳۷۵، محمد الغزالی، فقہ السیرۃ، الاسکندریۃ، دار الدعوۃ، ۱۹۷۹، ص ۴۰۱، اور اس میں اشارہ ہے حاطب بلتعہ کی حکمت وفصاحت کی طرف، جو رسول اللہ ﷺ کے ایلچی کے طور پر مصر کے حکمراں مقوقس کے پاس بھیجے گئے تھے، جب انہوں نے مقوقس سے کہا: یہ نبی ﷺ تمام انسانوں کی طرف بھیجے گئے ہیں، لیکن قریش ان کے سب سے زیادہ مخالف اور یہود ان کے سب سے بڑے دشمن بنے، جبکہ نصاری ان کے قریب تر ثابت ہوئے، قسم ہے میری عمر کی! جس طرح موسی علیہ السلام نے عیسی علیہ السلام کی بشارت دی، اسی طرح عیسی علیہ السلام نے محمد ﷺ کی بشارت دی اور جس طرح ہم تمہیں قرآن کی طرف بلا رہے ہیں، یہ ویسا ہی ہے جیسے تم اہل تورات کو انجیل کی طرف بلاتے ہو، ہر نبی کو جو قوم ملی وہی اس کی امت ہوتی ہے، اور ان پر لازم ہے کہ وہ اس کی اطاعت کریں، اور تم ان لوگوں میں سے ہو جنہوں نے اس نبی کو پایا ہے، ہم تمہیں حضرت مسیح کے دین سے نہیں روکتے، بلکہ ہم تم کو اسی دین کا حکم دیتے ہیں۔

۲۸۲- اس میں سے (یعنی سفارتی اور بین المذاہب روابط کی مثالوں میں سے) انطاکیہ اور بیت المقدس کے بطارکہ (عیسائی پادری) بھی شامل ہیں، جنہیں عباسی وزیر نے ابن عیسی کے ساتھ بازنطینیوں سے مذاکرات کے لئے قسطنطنیہ بھیجا، تاکہ وہاں موجود مسلمان قیدیوں کی حالت زار پر بات کی جاسکے، اسی طرح وہ عیسائی پادری ''بتریکو'' بھی ہے، جسے فاطمی خلیفہ الحاکم بامر اللہ نے حبشہ (ایتھوپیا) کے بادشاہ کے پاس بھیجا تاکہ دونہروں کی مرمت اور پانی کے راستوں کی اصلاح پر بات چیت کی جاسکے، نیز سلطنت مملوک کے سلطان ناصر محمد بن قلاوون کی جانب سے ایک وفد بھی ازبک کے بادشاہ کے پاس بھیجا گیا، جس کے ساتھ سلطنت کی طرف سے ''تبریک'' (ملکیتی عیسائی پیشوا) بھی شامل تھے۔ مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج ۵، ص ۳۲۳۔ دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۳۶۔

غیر مسلم کو سفیر مقرر کیا جا سکتا ہے، جیسے کہ اس کو کسی غیر مسلم سربراہ مملکت کی وفات پر تعزیت پیش کرنے کے لئے مقرر کیا جا سکتا ہے (۲۸۳)، فقہ اسلامی کا ایک دوسرا رجحان یہ ہے کہ سفیر کے سپرد مشن کی نوعیت دیکھا جائے تو اس لحاظ سے سفیر خواہ وہ عارضی طور پر مقیم ہو یا دائمی طور پر درحقیقت وزارت تنفیذ کی ایک قسم ہے، لہذا یہیں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ جس طرح ذمی کے لئے جائز ہے کہ وہ عمل درآمد کی وزارت پر فائز ہو، اسی طرح اسلامی مملکت کے لئے ممکن ہے کہ وہ کسی غیر مسلم سفیر کو مقرر کرے، جب تک اس کا عمل حکومت کے احکام اور ہدایات پر عمل درآمد سے آگے نہ ہو (۲۸۴)، اس کے برعکس جب سفیر کو کسی متعین کام کی ذمہ داری دی جائے، تو اس کام کو انجام تک پہنچانے کے لئے کسی غیر مسلم سفیر کے تقرر کا جواز تفویض کئے جانے والے کام کی نوعیت پر منحصر ہوگا، اگر وہ کام غلبہ کے اعتبار سے دینی نوعیت کا ہوگا، تو اسے سپرد نہیں کیا جائے گا، یہ رجحان اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ غیر مسلم سفیر کو قبول کرنا اس طور پر کہ وہ ایک اسلامی حکومت کی دوسری اسلامی حکومت کے سامنے نمائندگی کرے مناسب نہیں ہے، اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ سفارت خانہ اسلامی ممالک کے درمیان تعلقات کو مستحکم کرنے اور تنازعات کے حل میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس لئے جو کچھ اس کے سپرد کیا گیا ہے اسے وہ انجام دینے کا اہل نہیں ہے (۲۸۵)۔

۲۸۳- تاج الدین السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبری، القاہرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۷ء، ج ۵، ص ۲۷۱-۳۷۴، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۳-۵۹۴، وقارن: ابن قدامہ المغنی، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۴۳۴-۴۳۵۔

۲۸۴- تاج الدین السبکی، طبقات الشافعیۃ الکبری، القاہرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۸۶ھ/ ۱۹۶۷ء، ج ۵، ص ۲۷۱-۳۷۴، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۳-۵۹۴، وقارن: ابن قدامہ المغنی، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۴۳۴-۴۳۵۔

۲۸۵- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۳-۵۹۴، دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۲۰۵-۲۰۹۔

مذکورہ تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ نکلا کہ ذمیوں کے درمیان سے کسی غیر مسلم کو اسلامی حکومت میں سفیر متعین کرنا تا کہ وہ حکومت کی نمائندگی ایسے مشن میں کرے جو دینی نوعیت کا نہ ہو، یا پھر غیر اسلامی حکومت کے سامنے اسلامی حکومت کی نمائندگی کرے جائز ہے، بشرطیکہ اسے وہ کام سپرد نہ کیا جائے جو معمول کے مطابق سفراء کو سپرد کیا جاتا ہے، الا یہ کہ وہ کام ایسا ہو جس کا دینی معاملات سے کوئی لینا دینا نہ ہو(۲۸۶)۔

درحقیقت مؤمنوں سے وفاداری کے اصول کو نافذ کرنے کے لئے قاصد یا سفیر کی شخصیت کے مذہبی عنصر کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، اس لئے کہ غیر اسلامی حکومت کے سامنے اسلامی حکومت کی نمائندگی کے لئے کسی غیر مسلم کو سفیر مقرر کرنے سے مسلمانوں کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہے، جو ہر حال میں ممنوع ہے، اور ایسا اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک کوئی ایسی مجبوری نہ پیش آ جائے جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے والے شہریوں میں سے کسی غیر مسلم کو سفیر مقرر کئے جانے کی متقاضی ہو۔

جیسا کہ خصوصی مشن کے لئے بھیجے گئے سفارتی وفود کے معاملے میں ہوتا ہے، جس میں مخصوص اوصاف اور تخصصات کو مدنظر رکھنا ضروری ہوتا ہے، اور ایک غیر مسلم اپنے تخصصات کی نوعیت کے سبب متعلقہ ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دینے کا اہل ہوتا ہے، اسلامی اسٹیٹ کے طرز عمل کی روشنی میں بیرون ملک بھیجے جانے والے مشنوں کے دائرہ کار میں توسیع اور مشن کے ارکان کو تفویض کردہ تخصصات کے تنوع کو دیکھتے ہوئے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ ایک ہی مشن کے ارکان میں وزراء، ججز، بزرگ علماء، فقہاء، تاجر اور فوجی اہل کار سب ہی شامل ہوتے ہیں، اسلامی ریاست کی توسیع اور دیوانی نظام کے ظہور کے ساتھ دیوان استئناء نے ہمارے دور کی وزارت خارجہ کی طرح ہے، سفیروں کے انتخاب میں اہم اور بنیادی کردار ادا کیا، کیونکہ دیوان کے

۲۸۶- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۳-۵۹۴، دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۲۰۵-۲۰۹۔

ملازمین مذاکرات کے اصولوں سے واقفیت میں اور معاہدے طے کرنے کی اہلیت اور اس کے حوالے سے مہارت اور تجربہ کاری نہایت باکمال ہوتے تھے(۲۸۷)۔

اگر ایک طرف عملی طور پر ثابت ہے کہ سفیر یا قاصد کی شخصیت میں لازمی ثقافتی اخلاقی اور جسمانی صفات کی بڑی باریک بینی سے تلاش وجستجو ضروری ہے، تو دوسری طرف اس حقیقت کو اللہ کے رسول ﷺ کے اس خط سے مدلل کیا جاسکتا ہے جس میں آپ ﷺ نے اہل یمن سے فرمایا تھا: ''میں نے تمہارے پاس ایسے شخص کو بھیجا ہے جو میرے متعلقین میں نیک ہے، دین اور علم میں سب سے بہتر ہے''(۲۸۸)، اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد گرامی بھی کیا خوب رہنمائی کررہا ہے، ''جب تم قاصد بھیجو تو ایسے کو بھیجو جو خوب رو ہو اور اس کا نام بھی اچھا ہو، اور حسب و نسب کی شرافت جو سفیر کے لئے مطلوب ہوتی ہے، کے لئے بالعموم اللہ کے رسول ﷺ کے قول ''**تخیروا لنطفکم فإن العرق دساس**''(اپنے نطفوں کے لئے بہتر کا انتخاب کرو، کیونکہ نسل میں آمیزش بہت زیادہ ہوتی ہے)(۲۸۹)، سے استدلال کیا جاسکتا ہے، علاوہ ازیں اور بھی روایتیں ہیں جو صلح حدیبیہ کے متعلق سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے جب سہیل بن عمرو کو قریش کی طرف سے آتے دیکھا تاکہ وہ مسلمانوں کے ارادے کا حال جان سکے، تو فرمایا: تمہارے پاس سہیل آئے ہیں، اللہ تعالی نے تمہارے مسئلہ کو آسان کردیا ہے (۲۹۰)، اسی طرح حضرت عمرؓ نے فرمایا: جب تم قاصد یا سفیر کو بھیجو تو اسے تلاش کرو جو دیکھنے میں اچھا ہو اور جس کا نام بھی اچھا ہو' اسی طرح ان کا یہ بھی فرمان ہے: ''تمہیں اجازت دے جائے، تو تم اپنے میں سے سب سے اچھا نام پیش کرو، جب تم داخل ہوگے تو ہم تم میں سے خوب رو کو پیش

۲۸۷- دکتور عمر کمال توفیق، مرجع سابق، ص ۱۲۳-۱۲۴۔

۲۸۸-۲۸۹-اس کی تفصیل دیکھیں: ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح للرسالۃ والسفارۃ، مرجع سابق، ص ۲۳، دکتور محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق، ص ۱۸۲، السیوطی، الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر (تحقیق) ناصر الالبانی، بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۹۸۲ء، مرجع سابق ج ۱، ص ۲۵۔

۲۹۰- ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۴۷۔

کریں گے، چنانچہ جب تم بولو گے تو تمہاری زبانیں تم کو ممتاز کر دیں گی، کیونکہ بادشاہ کی نظر سب سے پہلے قاصدوں میں سے اس پر پڑتی ہے جو خوش منظر ہوتا ہے''(۲۹۱)۔

اسلامی حکومت کے خلفاء کی سیاسی ترقی کے متعدد مرحلوں میں ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دوسرے ممالک میں جب بھی سفیر بھیجا جائے تو سفیر کا انتخاب بڑی باریکی سے کیا جائے، اس سلسلے میں اس گفتگو کو جو عبدالملک بن مروان اور عامر بن شراحبیل شعبی کے درمیان ہوئی مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے، مؤخر الذکر کی بدصورتی کے باوجود اس کی ثقافت، اس کا وسیع علم اور اس کی عقل کی پختگی ان کے جوابات سے ظاہر ہو رہی تھی جو خلیفہ کی طرف سے سائنس، عقل اور عربوں کے حکیمانہ اقوال وامثال کے متعلق پوچھے گئے سوالات کے حوالے سے اس نے دیئے ان تمام اوصاف نے اسے خلیفہ کی نگاہ میں رومیوں کے سامنے اموی حکومت کی نمائندگی کا اہل ثابت کر دیا(۲۹۲)۔

اسی طرح فقہاء کے نزدیک اس بات پر اجماع ہے کہ سفراء اور قاصدوں کا انتخاب نہایت باریکی سے کیا جانا چاہئے، اس طرح کہ سفیر یا قاصد اعلی گھرانے کا ہو، کیونکہ وہ اپنے خاندان کے نقش قدم پر گامزن رہے گا، خاندانی خوبیوں سے محبت کرے گا، اور ہر جگہ اپنے خاندان کے برابر نظر آئے گا، انتہائی عقل مند ذہین اور زبان کا ماہر ہوگا، شعر وخطابت کا عادی ہوگا، وفاداری کا پابند ہوگا، پاکدامن ہوگا، فضول باتوں سے گریز کرے گا، اور خیانت سے بچے گا(۲۹۳)، تاہم اگر اسلامی ریاست کے صدر کی طرف سے قاصد یا سفیر کا انتخاب ہو جائے، تو اس پر لازم ہے کہ وہ حاکم کی اطاعت کرے، اور اس کی پسند کے تقاضوں کو اس طرح نافذ کرے

۲۹۱- ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۴۷۔

۲۹۲- دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، القاہرۃ، الانجلوا المصریۃ، ۱۹۸۶ء، ص ۶۶-۶۸۔

۲۹۳- ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۴۷-۴۸۔ ابن عبربہ، العقد الفرید، (تحقیق سعید العریان)، القاہرۃ، المطبعۃ التجاریۃ، ۱۹۵۳، ص ۵۲۔

کہ اس سے اسلامی مملکت کے حق میں منفعت کا حصول ممکن ہو، اللہ تعالی کا قول: ''**یأیها الذین آمنوا أطیعوا الله وأطیعوا الرسول وأولی الأمرمنکم**'' نیز یہ قول: ''**إنما کان قول المؤمنین واذا دعوا إلی الله ورسوله أن یقولوا سمعنا وأطعنا**'' بھی مذکورہ اصول کو مستحکم کرتا ہے(۲۹۴)۔

اسی طرح ابن اسحاق نے جو روایت کی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک بار اس عمرہ سے واپسی کے بعد جس سے حدیبیہ کے موقع پر آپ کو روک دیا گیا تھا، صحابہ کرامؓ کے درمیان تشریف لائے اور ارشاد فرمایا: ''اے لوگو! اللہ تعالی نے مجھے یقیناً نعمت ورحمت بنا کر بھیجا ہے، اس لئے میرے متعلق مت جھگڑو، جس طرح حواریین عیسی بن مریم علیہ السلام کے متعلق جھگڑتے تھے، تو صحابہ کرامؓ نے دریافت فرمایا: اے اللہ کے رسول ﷺ! حواریین کیسے جھگڑتے تھے؟ فرمایا: انہوں نے ان کو وہی دعوت دی جو میں نے تم کو دی، تو جسے انہوں نے قریب کے مشن پر بھیجا وہ خوش رہا اور جسے دور کے مشن پر بھیجا اس نے اپنے رخ کو ناپسند کیا اور اسے بوجھ سمجھا، اس کی شکایت عیسی علیہ السلام نے اللہ تعالی سے کی، تو بوجھل افراد اور ان میں سے ہر فرد اس قوم کی زبان بولنے لگا جس کی طرف اسے بھیجا گیا(۲۹۵)، یہ پوری روایت صراحت کے ساتھ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سفراء اور وہ حضرات جن کا غیر اسلامی حکومت کے سامنے اسلامی حکومت کی نمائندگی کے لئے انتخاب کیا جائے ان پر حاکم وقت کی اطاعت ہر حال میں لازم ہے، اگرچہ حدیبیہ کے واقعہ سے جس میں حضرت عمرؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کو اپنی جگہ عثمان بن عفانؓ کو مسلمانوں کی طرف سے گذشتہ سطور میں مذکور اسباب کی بنیاد پر منتخب کرنے کا مشورہ دیا تھا(۲۹۶)، اس امکان کی نشاندہی ہوتی ہے کہ جس شخص کا سفارت کے لئے انتخاب ہوجائے وہ سربراہ مملکت سے درخواست کرسکتا ہے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں، ساتھ ہی اس میں ان

۲۹۴-۲۹۵- سورۂ نساء:۵۹، سورۂ نور:۵۱، وراجع ماسبق، ص۱۶-۱۷، ۹۸۔

۲۹۶- راجع ماسبق، ص۱۰۰۔

وجوہات واسباب کا بھی تذکرہ ہو جن کی بنیاد پر اس نے ایسی درخواست پیش کی ہے، جس کی بنا پر حاکم وقت مذکورہ مسئلہ میں دوبارہ غور وفکر کر سکے، اس کی جانچ پڑتال کر سکے، اور اس فیصلہ کو نافذ کرے جس میں اسے اسلامی حکومت کے لئے عمومی فائدہ نظر آئے۔

تیسرا مطلب

سفراء کے تقرر اور دوطرفہ سفارت کاری کے حوالے سے باہمی رضامندی

درحقیقت اس ادارہ کی منظوری حاصل کرنا جس کے پاس اسلامی مملکت کی طرف سے سفراء وقاصدین بھیجے جاتے ہیں، اور سفارت خانے کھولنے کی تجویز بھیجی جاتی ہے، اسے بھیجنے کے عمل کی تکمیل کے لئے شرط لازم سمجھا جاتا ہے، یہ شرط دو بنیادی حالتوں میں تفریق کا تقاضا کرتی ہے، اسلامی ریاست اور دیگر غیر اسلامی ممالک اور گروہوں کے درمیان قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلے سے متعلق وقت کے پیش نظر، اس سے ہماری مراد وقتی اور عارضی سفارت کی صورت ہے، جسے محدود ومتعین مقاصد کے لئے انجام دیا جاتا ہے، جیسے ہی وہ مقاصد واغراض پورے ہوتے ہیں ویسے ہی سفارت کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے جو موجودہ وقت میں خصوصی یا دائمی مشن کے نام سے مشہور ہے، اور دائمی سفارت کی صورت میں مشن قابل اعتماد حکومت کے سامنے اپنی شناخت کے ساتھ قائم ایک دائمی ادارہ کی نمائندگی کرتا ہے، اور اس میں ممبران کا ایک گروپ شامل ہوتا ہے، جو رہائشی اعتبار سے اس حکومت کی نگاہ میں تسلیم شدہ ہوتا ہے، اور وہ ایسے فرائض اور ذمہ داریاں انجام دیتا ہے جو اسلامی حکومت اور اس کے منظور ومقرر کردہ ادارہ سے مربوط ہوتے ہیں۔

یہ بات معلوم ہے کہ عارضی سفارت خانہ اس عمومی تصویر کی نمائندگی کرتا تھا جس پر

اسلامی مملکت اور دیگر مما لک اور گروہوں کے درمیان قاصدوں اور سفارت خانوں کا تبادلہ ہوتا تھا، اس کے برعکس وہ دائمی سفارتی نمائندگی ہے جس سے واضح اور محسوس طور پر بین الاقوامی برادری سترہویں صدی عیسوی کے نصف میں واقف ہوئی، یورپی بادشاہی ریاستوں میں ایک دوسرے کے درمیان ۱۶۴۸ عیسوی کے ویسٹ فالیا(West Phalia) معاہدہ کے بعد گرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اسلامی مملکت عباسی دور میں جبکہ وہ ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور بکھر چکی تھی، وفود اور دائمی مشن کے نظام کی بعض خصوصیات سے واقف تھی، وہ بھی اس فریم ورک میں جس میں عباسی خلیفہ کے قاصدوں کو نیشاپور، موصل، دمشق اور دیگر جاگیردارانہ حکومتوں میں رہائش اختیار کرنے کے لئے بھیجا جاتا تھا، جو عباسی حکومت کے اخیر زمانہ میں ظہور پذیر ہوئیں (۲۹۷)، اس طرح کے عارضی اور دائمی وفود اور مشن کو بھیجنے کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ جنگوں میں سفراء، امراء اور حکام کے ساتھ رہیں، اور ان کے درمیان جو اختلافات اور کشمکش ہو اس کا خاتمہ کریں، اسی طرح حکام آپس میں مستقل مشن کا تبادلہ کرتے تھے، اس صورت میں جسے وہ لوگ ''شحنات'' (سیاسی نمائندے) کہتے تھے، اور وہ اس طرح کہ ان میں سے ہر فرد اس چیز کا خواہشمند ہوتا کہ وہ دوسرے حکام کی نقل وحرکت پر نظر رکھے، جس کی وجہ سے سیاسی نمائندہ کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ راجدھانی کے قریب علاقوں میں یا حکومت کے مرکز میں مقیم رہے (۲۹۸)، اگر ایک طرف دائمی سفارتی نمائندگی مما لک کے درمیان قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلے میں غالب صورتحال بن گئی ہے، بغیر اس کے کہ عارضی مشنوں کے مسلسل تبادلے کو ختم کیا جائے، تو دوسری یہ منطقی اور فطری بات ہے کہ دائمی مشن کے معاملے میں تسلیم شدہ ادارہ سے سفیر یا ایلچی کی منظوری حاصل کرنے کا معاملہ غیر عارضی مشن کی صورتحال سے مختلف ہوگا، اس اختلاف کے اسباب ومحرکات سے صرف نظر کرتے ہوئے ذیل میں اس کی وضاحت کی جارہی ہے:

۲۹۷-۲۹۸- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون الاسلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۸۱-۵۸۲۔

۱-کسی ملک میں عارضی طور پر مقرر کسی سفیر سے متعلق کسی پیشگی منظوری یا پیشگی اطلاع کی شرط نہ لگانا:

اس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ اگر ایک طرف شرعا یہ بات ثابت ہوگئی کہ کوئی بھی معاہداتی تعلق (اپنے موضوع کے جواز کے علاوہ) ضروری ہے کہ فریقین کی صحیح رضامندی پر قائم ہو،تو دوسری طرف دعوت اسلامی کے مزاج وخصائص پر جب غور کیا جاتا ہے،اور مسلمانوں پر اس کی جو تبلیغ غیر مسلموں تک پرامن ماحول میں لازم ہے،اسی کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ اور آپ کے بعد خلفاء راشدین کا جو معمول رہا سفارت کاروں کے بھیجنے اور ان کے استقبال کے سلسلہ میں، نیز ممالک اور گروہوں کے درمیان مسافتوں کی جو دوری ہوتی تھی اور اس وقت مواصلاتی ذرائع جس قدر پسماندہ ہوتے تھے،اور ان ممالک اور گروہوں کو باہم ایک دوسرے سے رابطہ بنانے میں جو دشواری پیش آتی تھی، ان ساری چیزوں پر نظر رکھی جائے تو ہم اس نتیجہ تک پہنچتے ہیں کہ جس ادارہ کی طرف سفیر یا قاصد کو بھیجا گیا ہے اس سے پیشگی منظور لینا، یہاں تک کہ جس ادارہ کی طرف سے بھیجا گیا ہے اس کی طرف سے مکمل اعتماد کی اطلاع دینا کوئی لازمی شرط قاصدوں اور سفارت خانہ کے اسلامی مملکت اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان تبادلے کے لئے نہیں ہے،اس کی تفصیل یہ ہے کہ دعوت اسلامی کے عمومی خصائص اور کلی اوصاف اسلامی حکومت کے سربراہ کو اس بات کا مکلّف بناتے ہیں کہ وہ دعوت اسلامی کا پیغام غیر مسلموں تک پہنچائے، اور انہیں دعوت کی حقیقت سے واقف کرائے،اس سے صرف نظر کرتے ہوئے کہ اسلامی حکومت جب اپنے اس فریضہ کو انجام دے گی تو غیر مسلموں کا رویہ کیا ہوگا، غیر مسلموں کا موقف جیسا بھی ہو چاہے قبول کا ہو یا مسترد کرنے کا وہ آئندہ اس کے اور اسلامی حکومت کے درمیان تعلقات کی نوعیت تشکیل دینے کی چاہے وہ نوعیت اتفاق کی ہو یا کشمکش کی ہو بنیاد ثابت ہوگا(۲۹۹)،مسئلہ کا

۲۹۹- راجع الدراسة سالفة الذكر المتعلقة بالأساس الشرعي والمبادئ الحاكمة للعلاقات الخارجية للدولة الاسلامية۔

دوسرا رخ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے بعد خلفائے راشدین کا جو معمول رہا ہے اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ قاصدوں اور سفراء کو پڑوسی ممالک کے حکمرانوں تک خطوط لے کر بھیجا جائے، اس طرح ان ممالک کی طرف سے اسلامی حکومت کے ذمہ داروں سے فریقین کے درمیان جنگ و امن سے متعلق کسی بھی مسئلہ پر گفتگو کرنے کی غرض سے آنے والے وفد کا استقبال کیا جائے، اس طرح کی آمد و رفت کا تبادلہ اس ادارہ سے جس کی طرف وفد بھیجا جائے، پیشگی منظوری یا پیشگی اطلاع کا مطالبہ نہیں کرتا (۳۰۰)، دوسرے الفاظ میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ فقہ، تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے یہ ثابت نہیں ہے کہ وہ قاصدین اور سفراء جنہیں اللہ کے رسول ﷺ نے یا ان کے بعد خلفاء راشدین نے پڑوسی ممالک کے حکمرانوں کے پاس بھیجا ہو، ان کے متعلق جن اداروں کی طرف بھیجا ہو ان سے پیشگی منظوری لی ہو، یہاں تک کہ جسے ہم ''پیشگی اطلاع'' کہتے ہیں وہ بھی ثابت نہیں ہے، اور نہ یہ ثابت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مسلیمہ کذاب کے دو قاصدوں کا جو استقبال کیا تھا، ان کے بھیجے جانے کے سلسلے میں آپ ﷺ سے منظوری لی گئی ہو، یا اس کام کی پیشگی اطلاع دی گئی ہو، علاوہ ازیں حدیبیہ کے مذاکرات میں جانبین کی طرف سے چند قاصدوں کا تبادلہ ہوا تھا، بالخصوص مذاکرات کے اس واقعہ میں جس میں قریش نے مسلمانوں کی طرف سے متعین کردہ سفیر کے ساتھ مذاکرات کرنے پر ناپسندیدگی کا اظہار کر دیا تھا، قریب یا دور سے کوئی ایسی دلیل اس واقعہ میں نہیں ملتی جو اس بات پر دلالت کرے کہ اس طرح کے وسیع تبادلہ کے لئے بھیجنے اور استقبال کرنے کی دونوں جہتوں کی طرف سے پیشگی منظوری لی گئی ہو (۳۰۱)، اسی طرح فقہ اور تاریخ کی کتابوں میں کوئی ایسا واقعہ مذکور نہیں جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ اسلامی اور غیر اسلامی حکومتوں کے درمیان سفراء قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلہ کے لئے پیشگی منظوری شرط لازم کی حیثیت رکھتی ہو، حضرت علیؓ سے ثابت یہ قول

۳۰۰-۳۰۱- دکتور محمد ابراہیم احمد، السفارات الاسلامیۃ، مرجع سابق، دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۱۸-۱۹۔

بھی سابق مسئلہ کی دلیل بن سکتا ہے جس میں آپ ﷺ نے فرمایا: ''اگر تم لوگوں کو حربیوں میں سے کوئی آدمی ملے اور اس کا دعوی ہو کہ وہ تم لوگوں کی طرف سفیر بنا کر بھیجا گیا ہے، اگر اس سے یہ بات محسوس ہو جائے، اور جو کچھ لے کر آیا ہے اس سے بھی یہی سمجھ میں آ رہا ہو تو تمہارے لئے اس کے خلاف ایکشن لینے کا کوئی جواز نہیں یہاں تک کہ وہ اپنا پیغام پہنچا دے اور اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ جائے، اور اگر تمہیں اس کی بات پر کوئی دلیل نہ ملے تو پھر تم اسے قبول نہ کرو'' (۳۰۲)۔

ان تمام تفاصیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلہ کی منظوری اسی وقت ثابت ہو جاتی تھی جب سفیر یا قاصد اس مملکت میں داخل ہو جاتا جس کی طرف اسے بھیجا جاتا، ایسی صورت میں متعلقہ فریق معاہداتی تعلقات میں باہمی رضامندی کے اصول کے مطابق ایلچی کا استقبال کرنے اور اسے اس ذمہ داری پر تعینات کرنے کا پابند نہیں ہے، جس کے لئے اسے بھیجا گیا ہے، اسے یہ حق ہے کہ چاہے تو اس کا استقبال کرے اور مذاکرات کرے، اور چاہے تو اسے مسترد کر دے، دونوں حالتوں میں معمول اور عرف کا لحاظ کرتے ہوئے یہ ضروری سمجھا گیا ہے کہ ایلچی کو امن دیا جائے، اس کا تعاون کیا جائے، اور اسے صحیح سالم اس کے ٹھکانے تک واپس بھیجا جائے، دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جن ممالک کی طرف قاصد اور سفارت کار بھیجے جاتے تھے ان کی جانب سے ان کا پرزور استقبال کیا جاتا تھا جو اس بات کے قائم مقام سمجھا جاتا کہ ان کی طرف سے سفراء کو جو کام سپرد کیا گیا ہے اس کی منظوری دے دی گئی ہے، اس کے برعکس اگر ان کا استقبال نہ کیا جاتا یا سربراہ مملکت اور سفراء کے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دی جاتی تو اسے اس کی طرف سے نامنظور سمجھا جاتا، یہی حال اسلامی مملکت میں قاصدوں اور غیر ملکی سفارتکاروں

۳۰۲- النعمان بن محمد، دعائم الاسلام، (تحقیق) واصف فیضی، القاہرۃ، دار المعارف، ج۱، ۱۳۷۰ھ/۱۹۵۱ء، ص ۴۴۰، (مشار الیہ فی دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق ص ۸۱)۔

کا تھا ان کے استقبال کے حوالے سے ۔اگر انہیں آپ ﷺ یا خلیفہ وقت سے ملاقات کی اجازت مل جاتی تو جن کاموں کو انجام دینے کے لئے سفراء کو بھیجا گیا ہے، انہیں انجام دینے کی منظوری سمجھا جاتا تھا۔

تیسری جہت سے اگر عہد نبوی اور عہد خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار کے مسلمان فقہاء کی ان تحریروں اور آراء پر غور کیا جائے جو قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلے کے سلسلے میں ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ پیشگی منظوری یا پیشگی اطلاع سفیر یا قاصد کو بھیجنے کے سلسلے میں شرط نہیں سمجھی گئی، یہ منظوری مملکت کے حدود جہاں سے شروع ہوتے تھے وہیں سے مل جاتی، جیسے ہی ایلچی حدود میں داخل ہوتا اور آنے کا مقصد ظاہر کرتا ہے اسے بااختیار حکام یا تو اندر جانے اور صدر مملکت سے ملنے کی اجازت دیتے، یا صدر مملکت سے ملاقات کی اجازت اور مفوضہ ذمہ داری کو انجام دینے کی اجازت نہ دیتے، اسی پس منظر میں بعض فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ''دار الحرب میں رہنے والے کسی بھی غیر مسلم کے لئے ہماری مملکت میں داخل ہونا درست نہیں ہے اگر چہ وہ آنے والا قاصد یا تاجر ہی کیوں نہ ہو'' (۳۰۳)، اسی طرح کی ایک دوسری رائے بھی ہے کہ'' حربیوں میں سے جو کوئی امان حاصل کئے بغیر دار الاسلام میں آئے گا اس کا قتل درست سمجھا جائے گا'' (۳۰۴)۔

بعض حضرات نے یہ بھی کہا ہے کہ'' حربی کو بلا وجہ دارالاسلام میں داخل ہونے نہیں دیا جائے گا، کیونکہ اس کی سازش سے مطمئن رہنا حد امکان سے باہر ہے، ممکن ہے کہ وہ تجسس اور سراغ رسانی یا ہتھیار خریدنے کی غرض سے آیا ہو، اگر اس نے پیغام رسانی یا معاہدہ یا صلح کرنے کی خاطر داخلہ کی اجازت طلب کی، تو اس کے لئے بلا معاوضہ اجازت دیئے جانے کا

۳۰۳- المقدسی، الاقناع فی فقہ الامام احمد بن حنبل، بیروت، دار المعرفۃ، ج ۲، ص ۳۸۔

۳۰۴- البغوی، شرح السنۃ، مرجع سابق ج ۱۱، ص ۷۱۔

جواز ہے، کیونکہ اس میں مسلمانوں کا مفاد مضمر ہے(۳۰۵)۔

سفراء اور سفارت خانوں کے تبادلے کے سلسلے میں اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے جو معمولات اور ثبوت وشواہد ظاہر ہوئے ہیں، جن میں پیشگی منظوری کو شرط کی حیثیت حاصل نہیں رہی ہے، صرف جس ملک کی طرف سفیر کو بھیجا گیا ہے اس ملک کے بری اور بحری داخلے کے دروازہ پر حاصل کی جانے والی اجازت پر اکتفاء کیا گیا ہے، ان میں سے ایک معمول وہ ہے جو ۱۵۱۱ء میں ڈوگ آف وینس (Doge of Venice) کے مصر میں بھیجے گئے اپنے سفیر کو لکھے گئے خط کے ذریعہ سامنے آیا ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ آپ کو جو کشتی دی گئی ہے اس پر سوار ہوجائیں، اور جب تک آپ کریٹ جزیرے پر پہنچ نہ جائیں اپنے راستے پر چلتے رہیں۔

اور سلطان کے ملک کا پاسپورٹ آپ کو اسکندریہ اور قاہرہ میں داخل ہونے کی اجازت دینے اور اپنے ساتھ لے جانے کا انتظار کر رہا ہے، اور اگر آپ کا پاسپورٹ ابھی تک کریٹ نہیں پہنچا ہے تو اس کے پہنچنے کا انتظار نہ کریں، بلکہ اپنا سفر جاری رکھیں، اس لئے کہ ممکن ہے کہ راستہ میں وہ آپ کو مل جائے، ورنہ آپ سفر جاری رکھیں گے، یہاں تک کہ آپ ابو قیر کی بندرگاہ تک پہنچ جائیں، پھر اپنے متبعین میں سے کسی کو اسکندریہ اور قاہرہ بھیجیں، اور اسکندریہ کے امیر کی خدمت میں اعتماد کا خط پیش کریں(۳۰۶)۔

اگر ایک طرف مذکورہ آراء اور معمولات مجمل طور پر اس بات کو پرزور انداز میں ثابت کرتے ہیں کہ ابتدائے اسلام میں قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلے کے لئے جس حکومت کی طرف سفیر روانہ کیا گیا ہے اس سے پیشگی منظوری لینا شرط لازم نہیں تھا، اور اس مملکت

۳۰۵- النووی، المجموع شرح المہذب للشیرازی، جدۃ، مکتبۃ الإرشاد ۱۹۷۲ء، ج۱۸، ص۲۱۹۔

۳۰۶- دکتور نعیم زکی، طرق التجارۃ الدولیۃ ومحطاتہا بین الشروق والغرب أواخر العصور الوسطی، القاہرۃ، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۷۳ء، ص۳۹۹-۴۰۰، نیز یہ بھی دیکھئے: دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص۷۷۔

کی طرف سے بعد میں سفراء کا جو استقبال کیا جائے اسے منظوری سمجھا جائے، تو دوسری طرف یہ حقیقت فقہاء کی آراء، تحریروں اور عملی معمولات سے مستحکم ہوجاتی ہے کہ اسلامی مملکت کی طرف آنے والا سفیر یا ایلچی دارالاسلام میں ذمہ دار حکام سے اجازت لئے بغیر داخل نہیں ہوسکتا تھا، پھر وہ اپنا ارادہ ظاہر کرتا، اور ذمہ داروں کو اختیار دیتا کہ اسے قبول کرلیا جائے، اور اس کے پیغام پر غور کرلیا جائے، یا اسے فوراً وہاں سے اس کے مطالبات کو سنے بغیر رخصت ہونے کی اجازت دی جائے، مگر دونوں حالتوں میں اسے مکمل تحفظ فراہم کیا جائے، جب عملاً یہ ثابت ہوجائے کہ وہ قاصد یا سفیر ہے، اس سلسلے میں بعض فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ ''جب کوئی حربی دارالاسلام میں امان لئے بغیر داخل ہوجائے تو اسے قتل کرنا اور اسے غلام بنانا درست ہے، اور اس پر احسان کرنا اور اسکے بدلے فدیہ لینا بھی جائز ہے، اور اگر اس کا یہ دعوی ہو کہ وہ کسی مشن کی خاطر آیا ہے تو ایسا کرنے سے اس وقت تک گریز کیا جائے گا جب تک کہ اس کے معاملہ کی تحقیق نہ ہوجائے''۔

اور ان میں سے جو کوئی دارالاسلام میں بغیر حفاظت لئے داخل ہوجائے، اور یہ دعوی کرے کہ وہ قاصد ہے، تو اس کا دعوی قبول کیا جائے گا، اور اگر حربی دارالاسلام میں ملے اور کہے کہ میں قاصد ہوں، اور خط نکال کر دکھائے اور ثابت ہوجائے کہ وہ اس کے بادشاہ کا خط ہے، تو وہ محفوظ رہے گا، جب تک کہ وہ اپنا خط پہنچا کر واپس نہ ہوجائے، اور اگر وہ خط نہ نکالے یا نکالے مگر وہ خط اس کے بادشاہ کا نہ ہو تو وہ اور جو اس کے ساتھ ہے مال غنیمت سمجھا جائے گا، اس لئے کہ جعلی خط کو تیار کیا جاسکتا ہے''، اسی طرح ''جب ہمیں دارالاسلام میں کسی کافر سے متعلق اطلاع ملے اور وہ کہے کہ میں اعتماد کا پیغام لے کر آیا ہوں تو اس سے تعرض نہیں کیا جائے گا، چاہے اس کے ساتھ خط ہو یا نہ ہو، جب اس کے آگے بڑھنے کا کوئی امکان نہ ہو'' (۳۰۷)۔

۳۰۷- ابن جماعۃ تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام، (تحقیق) فؤاد عبدالمنعم، قطر، رئاسۃ المحاکم الشرعیۃ والشئون الدینیۃ، طبع دوم، ۱۹۸۷ء، ص ۳۲۷۔ البہوتی، کشاف القناع عن متن الاقناع، القاہرۃ، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ ۱۹۴۷ء، ج ۳، ص ۱۰۸، الشیرازی، المہذب، مرجع سابق، ج ۲، ص ۲۵۹۔ ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸، السرخسی، بیروت، دارالمعرفۃ، المبسوط، ج ۱۰، ص ۹۲۔

گذشتہ باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دوسرے فریق کی طرف قاصد یا سفیر کو بھیجنے کی پیشگی منظوری اسلامی حکومت اور دوسری حکومتوں کے درمیان عارضی سفارت خانوں یا قاصدوں کے تبادلے کے لئے شرط کی حیثیت نہیں رکھتی، صرف اتنا کافی ہے کہ بھیجے گئے ایلچی کا استقبال کیا جائے تو اسے منظوری سمجھیں اور اگر اس سے ملاقات کو مسترد کر دیا جائے تو اسے عدم منظوری سمجھا جائے، مگر یہاں پر عارضی مشن کے لئے بھیجے جانے والے سفراء کے تبادلہ کا مسئلہ مختلف ہے، اس مسئلہ سے جو معاصر بین الاقوامی تعلقات کے دائرہ میں اس قسم کے مشن کے واسطے بھیجے جانے والے سفراء کے تبادلے کے حوالے سے ثابت اور طے شدہ ہے، جہاں اس قسم کے مشن پر بھیجنے کے لئے پیشگی منظوری کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اگر معاصر بین الاقوامی زندگی اسلامی مملکت کو تکنیکی معروضی نوعیت کی خاص وجوہات کی بنا پر دوسرے ممالک کے ساتھ عارضی مشن کے تبادلہ پر مجبور کرے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان مشنوں کے تبادلے کے حوالے سے مذکورہ بالا عمومی احکام کو احکام توقیفی سمجھا جائے یا زیادہ مناسب الفاظ میں انہیں جامد اور سخت احکام سمجھا جائے جو ہر حال میں لازم ہوں اور جن میں انحراف ممکن نہ ہو، یا یہ احکام اسلامی مملکت کے مصالح مرسلہ کے دائرہ میں آئیں گے، اس صورت میں جس ملک سے مشن متعلق ہے وہاں جانے کے لئے پیشگی رضامندی کی بنیاد پر مذکورہ بالا مشن کے تبادلے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان وقتی اور عارضی وفود کا سلسلہ جاری رہتا ہے، اس پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان مشنوں کے تبادلہ کی منظوری ضروری ہوتی تھی اگرچہ بعد ہی میں کیوں نہ ہو، اور خواہ اسے سفراء کے اس ملک تک جہاں وہ بھیجے گئے ہیں، پہنچنے تک مؤخر ہی کیوں نہ کیا جاتا ہو، تاہم آنے والے وفد کو قبول کرنے اور اسے اپنے مشن کو انجام دینے کے قابل بنانے کے لئے منظوری شرط تھی، اور کوئی بھی فریق وفد کے استقبال اور اسے صدر سے ملنے کی اجازت دینے کا پابند نہیں تھا، باوجود یکہ بعد میں دونوں فریقوں کے درمیان تعلقات کی شکل کا تعین کرنے کے لئے اکثر اس کی قبولیت اور رد پر انحصار کیا جاتا

تھا(۳۰۸)۔

اگر ہم اس میں یہ حقیقت شامل کریں کہ موجودہ دور میں مواصلاتی ذرائع ترقی یافتہ ہیں، جس کی وجہ سے پیشگی منظوری کا حصول آسان ہے، اس کے علاوہ ممالک کے پاس کنٹرول اور نگرانی کے وسائل کی بہتات ہے، جن کے ذریعہ حکومتوں کے لئے اپنی سرزمین پر آنے والے اجنبی افراد کی نگرانی ممکن ہے اور انکی آمدورفت کو منظّم کیا جاسکتا ہے، تو اس سب کے نتیجہ میں ہماری یہ رائے بنتی ہے کہ اسلامی مملکت اور دیگر مملکتوں کے درمیان خصوصی وفود بھیجنے اور ان کے تبادلے کے سلسلے میں پیشگی منظوری حاصل کرنے کے حوالے سے معاصر بین الاقوامی عرف کا ساتھ دینے میں شرعاً کوئی رکاوٹ نہیں ہے''۔ بالخصوص اس طرح کی منظوری کا حصول غالباً وفود کے لئے اپنی ذمہ داری اور مقاصد کی تکمیل کے حوالے سے ایک اہم گارنٹی سمجھا جاتا ہے۔

۳۰۸- اس کی مثالوں میں سے ایک وہ ہے جسے کتان نے روایت کی ہے کہ عائذ بن سعید الجسری نے کہا: ہم (وفد کی صورت میں) نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو ہم نے صبح کے وقت قبیلہ کلب کے ابن سفیان اور ابن اللحیہ کو بھی (وہاں) پایا، مگر انہیں (ابھی تک) اجازت نہیں ملی تھی، اس پر مالک، جو ہمارے وفد میں سے ایک تھے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے مالک! (دیکھو) حسیر کا وفد آچکا ہے، پس جب تم نبی ﷺ کے پاس داخل ہوجاؤ تو یوں اور یوں کہو، تو مالک نے جواب دیا: مجھے اجازت کی حاجت تلقین (یاددہانی) سے بڑھ کر ہے، پھر مالک نے (بلند آواز سے پکارا! اے اللہ کے رسول! حسیر کا وفد اجازت چاہتا ہے، تو نبی کریم ﷺ نے ہمیں اجازت مرحمت فرمادی۔ عبدالحی الکتانی، نظام الحکومۃ المدنیۃ المسمی بالترتیب الاداریۃ، بیروت، دارالکتاب العربی، ج۱، ص ۲۲ (مشارالیہ فی دکتور احمد ابو الوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص۹۱)، اس سلسلے کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے عمرو بن العاصؓ کو عمان کے دو بادشاہوں کے پاس بطور سفیر بھیجا تاکہ انہیں اسلام کی دعوت دیں، مگر ان میں سے ایک نے انہیں ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کردیا، تب عمرو بن العاصؓ نے کہا: میں کل واپس روانہ ہورہا ہوں، جب بادشاہ کو یقین ہوگیا کہ وہ واقعی جارہے ہیں، تو اس نے ان سے ملاقات کی اور وہ خود اور اس کا باپ دونوں اسلام لے آئے، اسی طرح اسپین کے باشندوں نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو جنہیں خلیفہ عثمان بن عفانؓ نے بھیجا تھا، ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کردیا، اور انہیں نہ اپنی دعوت پہنچانے دی، اور نہ ہی اپنے دین کی حقیقت واضح کرنے کا موقع دیا، اسی طرح سن ۶۵۸ھ میں سلطان الظاہر بیبرس نے بھی سیس کے حکمراں کے وفد کی طرف سے لائے گئے ہدیہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا، اور ان کی لائی گئی تحریری دعوت کو سننے سے بھی انکار کردیا، (المرجع السابق، ص ۹۳-۹۴، ۹۸)۔

۲-دائمی دوطرفہ سفارت کاری کے لئے پیشگی رضامندی شرط ہے:

اسلامی حکومت عہد اول میں دائمی وفود بھیجے جانے کے نظام سے واقف نہیں تھی، مگر موجودہ زمانہ میں اس نے اسے اپنے نظام کا حصہ بنایا، سوائے اس صورتحال کے جس میں اسلامی حکومت کو دائمی سفارتکاری کے نظام کے مشاہدہ کا موقع ملا، یعنی عباسی دور سلطنت کا آخری زمانہ جس میں عباسی خلیفہ وقت کی حکومت کمزور ہوچکی تھی، اور مملکت صوبوں اور امارتوں کے نظام میں تقسیم ہوچکی تھی، جن کے درمیان آپس میں دائمی سفراء اور قاصدوں کا تبادلہ ہو چکا تھا(۳۰۹)، جب معاملہ ایسا تھا، پھر سوال اٹھتا ہے، معاصر بین الاقوامی تعلقات سے متعلق دائمی سفارتکاری کے تبادلہ کے شعبہ میں متعارف کاروائی کی شرعی حیثیت کیا ہے جس میں دائمی مشن کے سربراہ کے لئے اس حکومت کی طرف سے جس نے اسے تسلیم کیا ہے پیشگی منظوری کو ضروری قرار دیا گیا ہے، اسی طرح ڈپلومیٹ، تکنیکی امور کے ماہر، منتظم کار اور دیگر خدمت گزار حضرات جو اس دائمی سفارتی مشن یا وفد کا حصہ ہیں، کے لئے پیشگی اطلاع دینا بھی ضروری شمار کیا گیا ہے؛ فقہ کا غالب رجحان یہ ہے کہ دائمی سفارتی وفود یا مشن کے نظام کے عام ہونے کے مدنظر جو متعلقہ ملک میں ایک مدت تک جو طویل بھی ہوسکتی ہے قیام کرے، نیز اسلامی مملکت اور دیگر غیر اسلامی ممالک کے درمیان اس طرح کے سفارتی وفود کے تبادلے کی اہمیت کا اعتبار کرتے ہوئے اسلامی شریعت کے عمومی احکام اسلامی مملکت کو اس طرح کے مستقل سرکاری تعلقات میں شامل ہونے سے نہیں روکتے، اور نہ وفد کے ممبران کے تسلیم شدہ ملک تک پہنچنے سے پہلے پہلے پیشگی اطلاع یا پیشگی منظوری لینے کی ضرورت سے جو وفود کے تبادلہ کے تقاضوں میں شامل ہے، ٹکراتے ہیں(۳۱۰)، علمائے تفسیر وفقہ کا غالب رجحان یہ ہے کہ غیر اسلامی حکومت کی طرف سے تسلیم شدہ دائمی نمائندہ اگر آتا ہے تاکہ وہ اسلامی حکومت کے سامنے اپنی حکومت کی نمائندگی

۳۰۹- راجع ماسبق، ص ۱۰۴-۱۰۵۔

۳۱۰- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۸۳-۵۸۴۔

کرے،تو وہ اس پناہ گزین یا پڑوسی سے زیادہ نہیں جو اسلامی حکومت کے حدود میں داخل ہو اور امن وسلامتی کے زیر سایہ مقیم ہو، اسے اس وقت تک پناہ ملتی رہے گی جب تک دارالاسلام میں اس کے آنے جانے کا سلسلہ جاری رہے گا، یہاں تک کہ وہ مستقل طور پر اپنے وطن لوٹ جائے (۳۱۱)، اس سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے فقہ کا حالیہ رجحان یہ ہے کہ اگر تحفظ کا معاملہ اس وقت تک روبعمل نہیں ہوسکتا جب تک کہ پناہ گزیں کو امن وتحفظ دینے والے کی طرف سے اس کا علم نہ حاصل ہو جائے، تو اگر بھیجنے والا ملک قبول کرنے والے ملک کی رائے طلب کرتا ہے، اور نمائندہ کو بھیجنے کے لئے اس سے پیشگی منظوری حاصل کرتا ہے، تو یہ اس بات کو یقینی بنانے کی ایک شکل ہے کہ نمائندہ نے قبول کرنے والے ملک میں اپنی رہائش گاہ پر جانے سے پہلے حفاظت اور قبولیت حاصل کر لی ہے، رہی یہ بات کہ اسلامی حکومت غیر اسلامی حکومت کی منظوری حاصل کرے تو ایسا کرنا ''مصلحہ مرسلہ'' کو زیر عمل لانا شمار کیا جائے گا، کیونکہ اس میں بھیجے گئے شخص کو اپنی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دینے کے لئے سازگار ماحول فراہم ہونے کا امکان ہے جو کہ منفعت کا حصول ہے (۳۱۲)۔

حقیقت یہ ہے کہ معاہدوں کو انجام دینے سے متعلق اسلامی شریعت کے عمومی احکام نیز ان احکام کے یہ تقاضے کہ یہ سارے کام طرفین کی مناسب اور کمی سے پاک رضامندی جس میں کسی کی بنیاد پر کئے جائیں اسی کے ساتھ پڑوسی ممالک کے حکمرانوں اور بادشاہوں کے ساتھ عارضی طور پر سفارت خانوں اور قاصدوں کے تبادلہ سے متعلق سنت کا استحضار اور ان معمولات سے استقبالیہ فریق کی رضامندی کے واجب ہونے کا جو اشارہ ملتا ہے اگرچہ یہ رضامندی اس وقت تک مؤخر رہتی ہے جب تک کہ نمائندہ بنا کر بھیجا گیا شخص اپنی منزل کی حدود تک نہ پہنچ جائے

۳۱۱- اس کی تفصیل درج ذیل کتب میں دیکھیں: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۳، ص ۳۳۷، القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، (طبعۃ ۱۹۶۱ء)، ج ۸، ص ۷۵-۷۷۔

۳۱۲- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۲۔

علاوہ ازیں مواصلات کے جدید ذرائع میں ہونے والی ترقی اور اس کے نتیجہ میں بھیجے جانے والے فرد کے لئے آسانی اور راحت کے ساتھ استقبال کرنے والے ملک سے رضامندی کے حصول کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وفد کے سربراہ کی تقرری کی پیشگی منظوری، یا پیشگی اطلاع اور استقبال کرنے میں اس کے ارکان کی آمد سے متعلق معاصر طریقہ کار دور کے مطابق اس کی قانونی حیثیت ثابت کرنے کے لئے زیادہ محنت کی ضرورت نہیں ہے، امن وتحفظ دینے واالی آیت کا بیان آگے آرہا ہے(۳۱۳)،تسلیم شدہ حکومت کی سرزمین میں دائمی وفود کی آمد کے لئے پیشگی منظوری کی درخواست کرنے کے طریقہ کار کی قانونی حیثیت کو ظاہر کرنے کی دلیل کے طور پر پیش نہیں کی جاسکتی، آیت کریمہ ایک ہی وقت میں اسلامی ریاست کی طرف سے پیشگی منظوری کے تقاضے کے درمیان اور غیر اسلامی ریاست کی طرف سے اس تقاضے کے درمیان جو کہ اسلامی مملکت کے ساتھ اس قسم کے وفود کا تبادلہ چاہتی ہو ایک قسم کے فرق پر مشتمل ہے، اگرچہ دونوں صورتیں ایک ہی نوعیت کی ہیں، جس کی وجہ سے دونوں ایک ہی حکم کے تحت شامل کئے جاسکتے ہیں، اس کے علاوہ، اگر اسلامی ریاست اور کسی دوسری غیر اسلامی ریاست کے درمیان مستقل وفود کے تبادلے کے لئے ہونے والے معاہدہ کے سلسلے میں شرعا یہ طے ہو کہ ایسا معاہدہ اسلامی مملکت کے مسلک کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے نقطہ نظر سے معاہدہ کی درستگی کی جو لازمی معروضی شرائط ہیں وہ ان تمام کا حامل ہوگا، جس میں متعلقہ فریقوں کے لئے واضح اور بے عیب رضامندی کا حصول بھی شامل ہے، جب معاملہ ایسا ہوگا تو وفد کے سربراہ کے تقرر کے لئے پیشگی منظوری اور تسلیم شدہ مملکت تک وفد کے اراکین کی آمد کی پیشگی اطلاع وفد کے ممبران اور بہ طور خاص اس کے سربراہ کی اس ملک کی طرف سے قبولیت اور مکمل رضامندی کی روشنی میں جس نے وفد کی منظوری دی ہے بدرجہ اولی ایک شرعی اور ممکن بلکہ اہم مسئلہ تصور کی جائے گا، اس لئے ایسے افراد اس مملکت کی سرزمین پر جہاں انہیں تسلیم کیا گیا ہے

۳۱۳- دیکھئے: ص ۱۴۳۔

اپنے فرائض کو عرصہ دراز تک انجام دیتے ہیں، جس طرح وفد کا صدر بھی اس ملک کے حکام سے ہر اس چیز کے حوالے سے رابطہ میں رہتا ہے جو اس کے اپنے ملک کے تعلقات کے حوالے سے اہم ہوتی ہے، لہذا پیشگی منظوری یا پیشگی اطلاع کے تقاضے سے متعلق طریقہ کار، معاہدات اور باہمی تعلقات میں رضامندی کے اصول کے وسیع تر اور عام معنی کے تحت آتا ہے، اسے سفارتی وفود کے تبادلے سے متعلقہ ممالک کے درمیان متواتر رسم ورواج اور باہمی تعاون کی بنیاد پر انجام دیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں سفیر جس ملک کے نزدیک تسلیم شدہ ہوتا ہے وہاں اس کی شناخت پوری طرح معروف ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے متعلقہ ممالک کے تعلقات ترقی کرتے ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ دونوں کے درمیان تعاون کے رابطے مستحکم ہوتے ہیں، اسی طرح ان کے بیچ منافع کا تبادلہ بھی مؤثر طریقہ پر ہوتا ہے، اس سے پہلے آپ ﷺ اور خلفائے راشدین کے متعدد اقوال کی طرف اشارہ کیا جاشکا ہے، جن میں قاصد یا سفیر کے انتخاب میں جانچ پڑتال اور گہرائی سے جائزہ لینے پر زور دیا گیا ہے، یہاں تک کہ اسے جہاں بھیجا جائے وہاں وہ پوری طرح قبول کیا جاسکے(۳۱۴)، اسلامی مملکت کے بہت سے معمولات سے واضح ہوتا ہے کہ متعدد مواقع ایسے آئے، جن میں بطور سفیر بھیجا گیا شخص ہی اس جگہ سے واپس لوٹایا گیا جہاں اسے بھیجا گیا تھا، اور جس کام کے لئے اسے بھیجا گیا تھا اس میں وہ خود ہی رکاوٹ بن گیا، اس کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے دس آدمیوں پر مشتمل ایک وفد مقوقس کے پاس بھیجا، جس میں حضرت عبادہ بن صامتؓ تھے تاکہ صلح پر گفتگو کی جاسکے، اور حضرت عمرؓ نے حضرت عبادہؓ کو امیر وفد بنایا تاکہ وہ اپنی قوم کی طرف سے گفتگو کرسکیں، جب وفد مقوقس کے سامنے حاضر ہوا، تو حضرت عبادہؓ آگے بڑھے، مقوقس ان کے کالے پن سے ڈر گیا، اور کہنے لگا اسے میرے پاس سے ہٹاؤ اور کسی دوسرے کو پیش کرو جو مجھ سے گفتگو کرے، مگر وفد حضرت عبادہؓ ہی کو آگے کرنے پر مصر رہا، کیونکہ وہ ان تمام لوگوں میں ہر اعتبار سے افضل تھے، اور کالا پن ان کے درمیان

۳۱۴- مرجع سابق، ص ۹۹-۱۰۴۔

قابل نکیر نہیں تھا، تو مقوقس نے حضرت عبادہ سے کہا کہ اے اسود آ دٰاور مجھ سے بڑی نرمی سے گفتگو کرو، کیونکہ مجھے تمہارے کالے پن سے ڈر محسوس ہو رہا ہے، اگر سخت کلامی کرو گے تو میں تم سے اور زیادہ ڈر جاؤں گا (۳۱۵)۔

چوتھا مطلب

سفیر کا استقبال اور بھیجے گئے ملک کی طرف سے اس کا تسلیم کیا جانا

اسلامی حکومت کی طرف سے قاصد اور سفراء کے بھیجے جانے کے حوالے سے یہ معمول رہا ہے کہ جب کبھی سفراء اور قاصد پڑوسی ملک بھیجے جاتے، تو انہیں کچھ ایسے کاغذات دیئے جاتے جنہیں موجودہ وقت میں 'سفارتی پاسپورٹ' یا 'ایکریڈیشن' کے کاغذات کا نام دیا جاسکتا ہے، چنانچہ سفیر کے ساتھ منظوری کا خط یا 'ایکریڈیشن ٹکٹ' ہوتا جس میں بھیجنے والے کا نام اور اس کی حیثیت درج ہوتی، اسی طرح سفیر کا نام، اس کا لقب، عہدہ اور وہ جگہ جہاں کا ارادہ ہوتا، لکھا ہوتا، ساتھ ہی اسے جس کام کی خاطر بھیجا گیا ہوتا اس کی نوعیت تحریر ہوتی، علاوہ ازیں اس ملک سے جو اس کے پیش نظر ہوتا درخواست کی جاتی کہ وہ اسے وہاں جانے کی منظوری دے، اس کی دیکھ بھال اور اس کا احترام کرے، اور اس کے سپرد کردہ کام کو آسان بنائے، اس کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب اللہ کے رسول ﷺ نے حدیبیہ سے لوٹنے کے بعد سن ۶ ھ میں قاصدوں اور سفراء کو پڑوس میں واقع ممالک کے حکمرانوں کی خدمت میں بھیجنے کا ارادہ فرمایا تو عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول ﷺ! بادشاہ اسی خط کو پڑھتے ہیں جس پر مہر ہوتی ہے، تو اللہ کے رسول ﷺ نے چاندی کی انگوٹھی لی جس پر ''محمد رسول اللہ'' کندہ تھا اور اس سے خط پر مہر لگادی،

۳۱۵- ابن تغردی بردی الاتابکی، النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ، القاہرۃ، ج ۱، ص ۱۲ (نقلاعن دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۹۷)۔

یہ سلسلہ ترقی پذیر رہا خلفائے راشدین اور ان کے بعد کے دور میں بھی یہاں تک ''دیوان الخاتم'' کے نام سے ایک شعبہ قائم ہوگیا، جس میں خلیفہ کے احکام اور ریکارڈ محفوظ کئے جاتے تھے، اور وہ خطوط بھی درج کئے جاتے جن پر سربراہ مملکت کی مہر لگنی ضروری ہوتی (۳۱۶)، اور منظوری کے خطوط کے جو نمونے اللہ کے رسول ﷺ کے مکاتیب میں پائے جاتے ہیں، وہ دراصل وہی خطوط ہیں جو دربار نبوی ﷺ سے اسلامی حکومت کے پڑوس کے حکمرانوں اور بادشاہوں کو چاہے وہ جزیرۃ العرب کے حدود میں رہتے ہوں یا جزیرۃ العرب کے حدود سے باہر لکھے گئے، جیسے آپ ﷺ نے اپنے ایک خط میں جو زرعہ بن یزن کے نام تھا، تحریر فرمایا: أما بعد! اللہ کے رسول ﷺ زرعہ بن یزن کے پاس اپنے سفراء اور قاصد بھیج رہے ہیں، جب تمہارے پاس ہمارے قاصد پہنچیں تو میں تم کو ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنے کی تاکید کرتا ہوں، اور سفراء میں معاذ بن جبل، عبداللہ بن یزید، مالک بن عباد، عقبہ بن غر، مالک بن حرث اور ان کے رفقاء شامل ہیں، اور ان سب کے امیر معاذ بن جبل ہیں (۳۱۷)، اور بعض نے ایک ایسا نمونہ بھی پیش کیا ہے جس کے مطابق اس دستاویز کی ڈرافٹنگ کی جائے گی جسے لے کر قاصد جائے گا۔

''بسم الله الرحمن الرحيم:تذكرة منجحة،صدرت على يدفلان بن فلان عندوصوله إلى فلان بن فلان–قداستخرنا الله عزوجل وفديناک أو وجهناک الى فلان لإ يصال ما أودعناک وشافهناک به من كذا وكذا، ويقضى جميع الأغراض التى ألقيت اليه محملة''(۳۱۸)۔

۳۱۶- ابن الفراء، رسل الملوم، مرجع سابق، ص۲۸-۲۹، ابن القیم، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، مرجع سابق، ج۲، ص۲۵۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص۱۲۵-۱۲۶، ۱۳۸۔

۳۱۷- محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق، ص۱۹۲، کنز العمال، مرجع سابق، ج۱۰، ص۶۳۳، ابن الأثی ابن سعد، الطبقات الکبری، بیروت، د، ت، ج۵/۵۳۱۔

۳۱۸- القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج۱۳، ص۸۱، ۹۱، ۹۹، سفیر کے ذریعہ پہنچائے جانے والے اعتماد نامے (یعنی سفارتی اسناد) کی عملی شکلوں میں سے ایک مثال وہ ہے جو سلطان الملک الناصر برقوق کے ایک مکتوب میں مذکور ہے، جو انہوں نے چنگیز خان کے ایک سردار کو بھیجا تھا، اس میں کہا گیا: ہم نے اپنی رسالت کو نافذ کرنے اور اس

وہ کاغذات اور دستاویزات جو قاصد یا سفیر لے کر آتے تھے اسلامی حکومت میں انہیں حکام کے ذریعہ بڑے اہتمام سے محفوظ کیا جاتا تھا، خاص طور سے دفتری نظام کے متعارف ہونے اور خط وکتابت کے شعبہ کے قیام کے بعد خطاط رکھے جاتے تھے جن کی یہ ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ ان دستاویزات کو خوبصورت لکھاوٹ میں تیار کریں، اور انہیں خط وکتابت کی پوزیشن اور ان ذمہ داریوں کی اہمیت ونزاکت سے ہم آہنگ کر کے سجائیں، جن کا سفیر کو مکلّف بنایا گیا ہے(۳۱۹)۔

جب سفیر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتا تو وہ اس وقت منظوری لیٹر سربراہ مملکت کو پیش کرتا، جس وقت اس کے استقبال کی اجازت دی جاتی، اور وہ اس وقت وزراء حاشیہ بردار اور بڑے ذمہ داروں کے جم غفیر کے سامنے کھڑا ہوتا، سفیر منظوری نامہ پڑھ کر سناتا، اور ہلکے اشارہ سے اس کام کی وضاحت بھی کرتا جس کے لئے اسے بھیجا گیا ہے، اور سفراء کا یہ معمول بھی تھا کہ وہ جس ملک میں بھیجے جاتے اس ملک کی زبان میں منظوری نامہ کا ترجمہ ساتھ رکھتے تھے، اور جب ایسا نہیں ہوتا تو سفیر خط عربی زبان میں پڑھتا، اور مترجم حضرات جس ملک میں بھیجا گیا ہے اس ملک کی زبان میں ترجمہ کی ذمہ داری لیتے (۳۲۰)، رہی بات قاصدوں اور سفراء کے استقبال سے متعلق رسم ورواج کی، اور ان کی طرف سے منظوری نامہ پیش کئے جانے کے طریقہ کار کی، تو اسے اسی شکل میں انجام دیا جاتا جس میں عہد نبوت ﷺ، عہد خلافت راشدہ اور اسلامی حکومت کے بعد کے ادوار میں انجام دیا جاتا تھا، یہ شکل اپنے مزاج ومذاق کے اعتبار سے موجودہ سفارتی تعلقات میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے مختلف نہیں ہے یعنی اس موقع پر مہمان نوازی اور متعدد

کی امانت ادا کرنے کے لئے اعلی معزز مجلس کے مقرر ومعتمد قاصد کو منتخب کیا ہے، جنہیں اللہ تعالی نے عزت وشرف سے نوازا ہے، ہم نے ان کے ساتھ اپنا سلام بھیجا ہے، جو ''زوی اسری'' کی خوشبو سے کم نہیں، بلکہ ماہانہ عنبر اور دار چینی کستوری کی خوشبو سے بھی بڑھ کر ہے۔ المرجع السابق، ج ۷، ص ۳۰۱۔

۳۱۹-۳۲۰-المرجع السابق، ج ۲، ص ۴۷۶۔ دکتور عمر کمال توفیق، مرجع سابق، دکتور محمد سعید البوطی، فقہ السیر ۃ، مرجع سابق، ص ۳۴۵-۳۴۶۔

طریقوں سے اعزاز وتکریم کا اہتمام کیا جاتا ہے،اورسفیر یا ایلچی ایک اعزازی ٹیم کا معائنہ کرتا ہے،جس میں اس کے ساتھ آداب یا پروٹوکولز کا ڈائیریکٹر ہوتا ہے،ان تمام مرحلوں سے گزرتے ہوئے سفیراس ہال میں پہنچتا ہے جہاں وہ سربراہ مملکت،وزیرخارجہ اور چیف سکریٹری کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے، اور اپنے سربراہ مملکت کا سلام پیش کرتا ہے، پھر وہ اپنی منظوری کے کاغذات پیش کرتا ہے، جسے استقبال کرنے والے ملک کا سربراہ وصول کرتا ہے، پھراسے چیف سکریٹری کے حوالے کرتا ہے(۳۲۱)،حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے دوسرے ممالک کے سفراء کے استقبال کی جورسم انجام دی جاتی ہے،اس کی بہت سی قرآنی آیات اور آپ ﷺ کے اعمال وافعال میں دلیل موجود ہے، جیسے اللہ تعالی کا یہ فرمانا:"**وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها أوردوها**"اورقرآن کریم کی یہ آیت:"**ولا تستوى الحسنة ولا السيئة ادفع بالتى هى أحسن، فإذا الذى بينك وبينه عداوة كأنه ولى حميم**"(۳۲۲)۔

پہلی آیت کے بارے میں مفسرین کا یہ کہنا ہے کہ اللہ تعالی نے جب اپنے قول"**من يشفع شفاعة حسنة يكن له نصيب منها ومن يشفع شفاعة سيئة يكن له كفل منها وكان الله على كل شئ مقيتا**" کے ذریعہ سفارش کرنے کے اچھے برے دونوں طریقے سکھائے، اور شفاعت لوگوں سے تعلقات استوار کرنے کا ہم ذریعہ ہے،تو پھر ایمان والوں کوایمان کے اعتبار سے کمزور ومستحکم دونوں طرح کے لوگوں کے درمیان سلام کا طریقہ بتایا، اورآپس میں کس طرح باادب سلوک اورسفر میں ملنے والوں سے کیسے ادب وتہذیب کے ساتھ ملاقات کی جاتی ہے، بتایا،اس لئے ارشادفرمایا:"**وإذا حييتم بتحية فحيوا بأحسن منها**

۳۲۱- دکتورمحمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام،مرجع سابق،ص ۵۹۵، الحسن بن عبداللہ، اثارالاول فی ترتیب الدول،مرجع سابق،ص ۹۴-۹۵۔

۳۲۲- سورۂ نساء:۸۶،سورۂ فصلت:۳۳۔

أو ردوها'' اللہ تعالی نے اس آیت میں ہمیں مکلّف بنایا ہے کہ جو ہمیں سلام کرے ہم اسے اس سے اچھے انداز میں یا اسی طرح یا بالکل اسی کے مماثل جواب دیں، مگر کتاب وسنت سے اس کی کوئی دلیل نہیں کہ سلام کا جواب جب مسلمان کو دیا جائے تو اس سے اچھے انداز میں، اور جب اہل کتاب یا کفار کو دیا جائے تو بالکل اسی کے مماثل، اس لئے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے فرمایا: اللہ کی مخلوق میں سے جو کوئی آپ کو سلام کرے اس کا جواب دو اگر چہ وہ مجوسی ہو، جبکہ بعض مسلمان اس چیز کو پسند نہیں کرتے کہ غیر مسلم انہیں لفظ ''السلام'' سے سلام کرے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ غیر مسلموں کے سلام کا جواب نہیں دینا چاہئے، تو ان سے یہ نکتہ فوت ہوگیا کہ جب کوئی قوم مسلمانوں سے مانوس ہوجائے اور اس کے دین کی برتری سے بھی واقف ہوجائے اور ان کے درمیان اسلامی آداب رواج پا جائیں، تو بسا اوقات یہ صورت حال اسلام کی جانب ان کے لئے وجہ کشش بنتی ہے، اور مومن کی صفات میں سے ہے کہ وہ مانوس ہو اور مانوس کرے، اور اسلام ایک عمومی دین ہے، جس کے مقاصد میں دین کے آداب وفضائل کی اگر چہ بتدریج ہی سہی اشاعت ہے، اور لوگوں کو باہم ملانا شامل ہے تا کہ سارے انسان آپس میں بھائی بھائی ہوجائیں، صحیح روایتوں میں آیا ہے کہ یہودی مسلمانوں کو سلام کرتے تھے اور مسلمان ان کے سلام کا جواب دیتے تھے، پھر ان کی طرف سے کی گئی تحریف کے نتیجہ میں آپ ﷺ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ انہیں ''وعلیکم'' کے ذریعہ جواب دیں، تا کہ مسلمان تحریف کرنے والوں سے دھوکا نہ کھائیں، اور قاعدہ ہے کہ جب کسی حکم کا سبب ختم ہوجاتا ہے تو وہ حکم بھی آپ سے آپ ختم ہوجاتا ہے (جیسے کہ وہ جنگیں جو مسلمان اور یہود کے درمیان جاری تھیں ان میں زیادتی کرنیوالے چونکہ یہود تھے اس لئے ایسا حکم تھا) اور صحابہ کرامؓ میں سے کسی سے یہ مروی نہیں کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہود کو سلام کرنے سے روکا ہو، اس لئے کہ وہ دوسرے لوگوں کو اسلامی آداب سے نہیں روکتے تھے (۳۲۳)۔

۳۲۳- محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق، ج۵، ص ۲۵۳-۲۵۷۔

دوسرے حضرات کا یہ کہنا ہے کہ جب اللہ تعالی نے اہل ایمان کو جہاد کا حکم دیا تو انہیں یہ بھی حکم دیا کہ جب دشمن مصالحت پر راضی ہو جائیں تو مصالحت کرلو، جیسا کہ ارشاد ہے: ''وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله''، کیونکہ مسلمان جب دارالحرب یا اس سے قریب کسی کافر سے ملتا اور وہ اسے سلام کرتا، تو وہ اسکے سلام کی طرف توجہ نہ دیتا، بلکہ اسے قتل کر دیتا، اللہ تعالی نے اہل ایمان کو اس سے منع فرمایا، اور ان کو حکم دیا کہ ہر سلام کرنے والے سے ملیں یا ان کا ایک طرح سے اکرام کریں یا تو اسی طرح ملیں یا پھر اس سے بڑھ کر تپاک سے ملیں (۳۲۴)۔

حدیث میں مروی ہے کہ آپ ﷺ کی طرف سے غیر ملکی سفیر کے استقبال سے پہلے ایک ذمہ دار ہوتا جو سفیر کے سامنے اس کی ذمہ داری اور جس چیز کا خیال رکھنا اس کے لئے ضروری ہوتا، اس کی وضاحت کرتا، اور معمول یہ تھا کہ سفیر کا استقبال ایسی جگہ پر ہوتا جہاں بڑی مسجد ہوتی اور صحابہ کرامؓ کا بڑا مجمع موجود ہوتا، جو خوبصورت اور زرق برق لباس زیب تن کئے وہاں حاضر ہوتا (۳۲۵)، زمانہ کی ترقی کے ساتھ مسلمان غیر ملکی سفراء کے استقبال اور ان کی مہمان نوازی کے خصوصی اصول وضابطوں سے واقف ہوتے رہے، جو دراصل ان رسم و رواج کا مجموعہ قرار پائے، جن کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ہر اس چیز کے اظہار کی خواہش ہو جس سے غیر مسلموں کو اسلامی حکومت کی قوت وعظمت کے نقوش کا بھرپور اندازہ ہو سکے، اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمنوں کو مرعوب کیا جائے، ساتھ ہی غیر ملکی سفراء کو اسلام کی طرف مائل کیا جائے اور ان کا دل جیتا

۳۲۴- الفخر الرازی، التفسیر الکبیر، القاہرۃ، البہیئۃ المصریۃ، ۱۹۳۸ء، ص ۲۵۳، نیز دیکھئے: الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق ۱/ ۵۴۵، ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق ۱/ ۴۶۴-۴۶۵، اس میں اشارہ اس جانب ہے کہ آیت کے مفہوم میں حقیقی طور پر اسلام کا مفہوم شامل ہے اور مجازی طور پر ہدایت کا مفہوم، ج ۴، ص ۱۶۵۰-۱۶۵۱، ج ۳، ص ۱۳۱۰- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم مرجع سابق ۴/ ۱۰۰-۱۰۱۔

۳۲۵- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۶۔

جائے، مسلمانوں نے مختلف زمانوں میں قاصدوں اور سفراء کے استقبال اور مہمان نوازی کا نظام ایجاد کیا، عباسی دور میں ان امور کا ذمہ دار ''الوظائفي'' کے نام سے، فاطمی دور میں ''نائب الدار'' کے نام سے اور مملوکی اور ایوبی دور میں ''المہمندار'' کے نام سے جانا جاتا تھا، جو ان تمام ذاتی خوبیوں، علمی اوصاف اور علمی خوبیاں اور عملی تجربات کا حامل ہوتا تھا جن کی وجہ سے وہ اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دینے پر قادر ہوتا(۳۲۶)، آج بھی یہ طریقہ ہے کہ سفیروں اور سفارت کاروں کی استقبالیہ تقاریب میں عمومی طور پر سفارت کاروں کی تکریم میں فرق مراجب کو ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس کے علاوہ ان حالات کی بھی رعایت کی جاتی ہے جن سے دونوں ممالک چاہے بھیجنے والا ملک ہو یا استقبال کرنے والا کے تعلقات دوچار ہوتے ہیں، اور بھیجنے والے ملک کا استقبال کرنے والے ملک کے نزدیک جو مقام ومرتبہ ہوتا ہے اس کا بھی اثر ہوتا ہے، یہ صورتحال موجودہ سفارتی تعلقات میں پیش آتی رہتی ہے، اس سلسلے میں اسلامی حکومت کے معمولات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ غیر ملکی سفراء کے استقبال کے طور طریقے گذشتہ سطروں میں مذکور عوامل اور محرکات کی بنیاد پر مختلف ہوا کرتے ہیں، اگر قاصد ایسا ہوتا کہ بادشاہ کو ان سے ملنا چاہئے، اور بذات خود اس کا استقبال کرنا چاہئے، تو بادشاہ ایسا کرتا، اور سفیر کا معاملہ اور اس کا مقام ومرتبہ بھیجنے والے حکمراں کے مقام ورتبہ سے طے ہوتا ہے، مگر بعض سفراء اور قاصد ایسے بھی ہوا کرتے ہیں جن کی ذاتی حالت اور پوزیشن کا اعتبار کیا جاتا ہے، اگر بادشاہ کے لئے ممکن نہیں ہوتا کہ وہ براہ راست ملاقات کر سکے تو وہ اپنی حکومت کے عہدیداروں میں سے کسی کو ملاقات کے لئے بھیجتا ہے، جس کا عہدہ سفیر اور اس کو بھیجنے والے حکمراں کے مقام ومرتبہ سے ہم آہنگ ہوتا ہے، اور اگر قاصد ان کی طرف سے ہوتا جو سرحد کے محافظ ہوتے، یا ان کی طرف سے جو

۳۲۶- دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۱۵۳۔ دکتور عمر کمال توفیق، مرجع سابق، ص ۱۲۸۔

جنگ کا ذمہ دار ہوتا تو اسی وقت بادشاہ ان سے ملتا اور اس کا پیغام سنتا، اس لئے کہ بسا اوقات ایسا کرنے میں ہی فائدہ ہوتا اور تاخیر کرنے میں نقصان ہوتا، اور اگر معاملہ اس طرح کا نہ ہوتا تو اسے مہمان خانہ میں تین دن تک رہنے دیا جاتا، اور کسی آدمی کو اس سے ملنے کی اجازت نہ دی جاتی، پھر اسے بلایا جاتا، اور جس دن بلایا جاتا اس دن شاہی محل آراستہ کیا جاتا، سارے فوجی جمع ہوتے، اور بادشاہ اپنی خاص شان وشوکت کا اظہار کرتے ہوئے شاہی لباس میں ملبوس تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتا (۳۲۷)، بعض نے اس مسئلہ کی تلخیص اس طرح کی ہے کہ غیر ملکی سفراء کا استقبال اس سلسلے میں جو رسم ورواج چلا آتا رہا ہے، اسی کے مطابق کیا جانا چاہئے جیسے کہ یہ دستور ہے کہ اگر کسی بادشاہ کا قاصد اس کی سلطنت کے نواح میں پہنچتا ہے، تو اس علاقہ میں تعینات بادشاہ کا نمائندہ اسے قاصد کے آنے کی اطلاع دیتا ہے، اور بادشاہ سے سفیر کے افراد کی اس کے دربار میں باریابی کی اجازت طلب کرتا۔

تو شاہی تقریبات اس کی موجودگی میں جب اس کی آمد ہوتی ہے منعقد ہوتی ہیں، جب اس کی آمد کا احساس ہوجاتا ہے تو اگر قاصد کو بھیجنے والا بلند مقام بادشاہ ہوتا ہے تو بڑے امراء جیسے نائب اور محافظ اعلی وغیرہ اس سے ملنے باہر آتے ہیں، اور اگر اس سے کم مرتبہ کا حامل ہوتا ہے تو اس سے مہندار ملاقات کرتے ہیں، اور دوادار اس کے سلسلے میں اجازت طلب کرتے ہیں، اور اسے مہمان خانہ میں ٹھہرا دیتے ہیں، اور بعض دیگر مقامات کی بھی اس کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے سیر کرا دیتا ہے، وہ قاصد حاضر ہوتا ہے، بادشاہ کے دربار میں اور اسکے ساتھ اس کا اپنا خط بھی ہوتا ہے، جسے وہ چومتا ہے پھر اسے بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتا ہے، بادشاہ اسے کھولتا ہے، اور اسے اپنے خفیہ کاتب کے حوالے کرتا ہے، جسے وہ بادشاہ کو پڑھ کر سناتا ہے، اور وہ اس سلسلے میں اپنا حکم جاری کرتا ہے'' (۳۲۸)۔

۳۲۷- الحسن بن عبداللہ، اثار الأول فی مراتب الدول، القاہرۃ، ۱۳۹۵ھ، ص ۹۴-۹۶۔

۳۲۸- القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق ۴/ ۵۸-۵۹۔

گذشتہ تفصیلات کا خلاصہ یہ نکلا کہ موجودہ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلہ میں جو سفارتی عرف جاری ہے غیر ملکی سفراء کے استقبال کے طور طریقے سے متعلق، وہ اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے اس سلسلے کے پہلے دور کے مسلمانوں کے متعارف طریقے سے جو اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے میل کھاتے ہیں، سے مختلف نہیں ہیں، جن میں مکارم اخلاق کی پاسداری، سلام کا اچھے انداز میں جواب دینے، اور مسلمانوں کی شان وشوکت اور غلبہ کے غیر اسلامی ممالک کے سفراء کے سامنے اظہار، مہمان کی مہمان نوازی، اور برائی کا بدلہ اچھائی سے دینے کی ترغیب دی گئی ہے، نیز یہ کہ یہ سب کچھ اعتدال کے ساتھ ہو، مبالغہ آرائی اور حدود سے بڑھ کر نہ ہو۔

تاہم سفراء اور ایلچی حضرات کے استقبال کی بحث میں اس جانب اشارہ کرنا مناسب ہے کہ وہ خطوط جنہیں سفیر اپنے استقبال کے وقت بادشاہ اور حکام کی خدمت میں پیش کرتا ہے، ان کی ڈرافٹنگ ان بادشاہوں اور حکمرانوں کے حالات کے اعتبار سے جن کی طرف وہ ارسال کئے جاتے ہیں، اسی طرح وہ لوگ جس درجہ میں اسلامی مملکت کے حوالے سے خطرہ یا چیلنج ہیں، اس کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف ہوتی ہے، اس کی دلیل آپ ﷺ کے وہ خطوط ہیں جو آپ ﷺ نے کسری ہرقل اور مقوقس کے نام لکھے، ان میں ان کے القاب اور مقام ومرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے خطاب کرنے کے علاوہ، انہیں اسلامی کی دعوت دینے، اور اسلام سے اعراض کرنے کے نتیجے میں، اور اپنی رعایا اور اسلام کی دعوت کے درمیان رکاوٹ بننے کی وجہ سے ان کو گناہ کا جو بوجھ اٹھانا ہوگا، اس سے ڈرانے پر اکتفاء کیا، جس میں جنگ کی کوئی دھمکی نہیں دی گئی، برخلاف ان خطوط کے جو آپ ﷺ نے عمان، بحرین اور یمامہ کے حکمرانوں کے نام لکھے، جن میں اسلام کی دعوت کے ساتھ بادشاہوں کو ان کے اقتدار شاہی پر برقرار رکھنے کے سلسلے میں بھرپور تعاون دینے کی یقین دہانی کرائی گئی اور جنگ کی دھمکی بھی دی گئی، شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سلطنتیں مملکت اسلامیہ کی قریبی اور پڑوس میں واقع تھیں، جہاں سے اس کی سلامتی اور امن کو براہ

راست خطرہ لاحق تھا، اس کی وضاحت اس خط سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے جیفر ادر عبدابن الجلندی کے نام روانہ فرمایا جس میں یہ تحریر تھا'' اگر تم دونوں نے اسلام قبول کرلیا تو تم دونوں کو والی بنادوں گا اور اگر اسلام قبول کرنے سے انکار کردیا، تو تم دونوں کی حکومت ختم ہوجائے گی، اور میرا لشکر تمہارے حدود میں داخل ہوجائے گا اور میری نبوت تمہاری بادشاہت پر غالب آجائے گی''، اسی طرح کا خط آپ ﷺ نے یمامہ کے حکمراں ہوذۃ بن علی کو لکھا'' جان لو میرا دین وہاں تک پہنچ کر رہے گا جہاں تک قدم اور کھر کی انتہا ہے، اسلام لے آؤ سلامتی کے ساتھ رہو گے اور جو کچھ تمہارے کنٹرول میں ہے اسے تمہارے ہی تحویل میں رہنے دوں گا'' (۳۲۹)۔

پانچواں مطلب

اسلام میں سفراء اور سفارتی عملے کی ذمہ داریاں

حقیقت یہ ہے کہ عہد نبوی سے لے کر اب تک اسلامی حکومت کا دوسری حکومتوں کے ساتھ سفراء اور سفارت خانوں کے تبادلہ کا جو طریقہ کار رہا ہے، وہ بذات خود مطلوب ومقصود نہیں ہوتا، بلکہ اسے چند اغراض ومقاصد کی تکمیل کا اہم ذریعہ ووسیلہ سمجھا جاتا رہا ہے، اس سلسلے میں وزیر نظام الملک نے اپنی مشہور زمانہ کتاب'' سیاست نامہ'' میں جو انہوں نے پانچویں صدی ہجری میں' تصنیف فرمائی' لکھا ہے کہ'' یہ بات جان لینی چاہئے کہ بادشاہوں کے سفراء بھیجنے

۳۲۹- محمد ابوزھرۃ، خاتم النبیین فی العہد المکی والعہد النبوی، الدوحۃ، ۱۹۸۰ء، ج ۳، ص ۲۹۱ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور احمد محمد احمد، الجانب السیاسی لحیاۃ الرسول ﷺ، مرجع سابق ص ۱۱۵، احمد زینی دحلان، السیرۃ النبویۃ والآثار المحمدیۃ، بیروت، دار المعرفۃ، طبع دوم، ۱۹۸۰ء، ج ۲ ص ۱۷۶-۱۷۷، عبد الرحمٰن ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون (کتاب العبر ودیوان المبتدا والخبر) بیروت، دار الکتاب اللبنانی، ۱۹۶۸ء، ج ۲، ص ۲۶ اور اس کے بعد کے صفحات۔

کا مقصد صرف خط حوالے کرنا یا سفارت خانہ منتقل کرنا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیچھے سینکڑوں مقاصد ہوتے ہیں جو انہیں مطلوب ہوتے ہیں (۳۳۰)، بالعموم مندرجہ ذیل مقاصد اور کاموں کے درمیان عارضی اور دائمی اسلامی وفود کے ذریعہ انجام پانے والے کاموں کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے:

۱-اسلامی ریاست کی نمائندگی کرنا:

یہ ذمہ داری جسے سرکاری نقطہ نظر سے بجاطور پر سفارتی نمائندگی کا جوہر قرار دیا جانا چاہئے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلم ایلچی یا سفیر کو اسلامی حکومت کا سرکاری نمائندہ سمجھا جائے، وہ اپنی حکومت کے عزائم کا ترجمان اور اس ملک میں جہاں اسے بھیجا گیا ہے یا جہاں اسے نمائندہ مقرر کیا گیا ہے کے متعلق اپنی حکومت کی سرکاری پالیسی کا اظہار کرتا ہے، اس لئے اس کی حکومت پہلے اس سے اس کی ان تمام سرگرمیوں کی بابت استفسار کرتی ہے جن کے ذریعہ وہ اپنی ان سرکاری ذمہ داریوں کو انجام دے گا، جن کے لئے اسے بھیجا گیا ہے، اسی وجہ سے اسلامی ریاست اپنے دور اول یعنی عہد نبوی اور خلافت راشدہ کے وقت سے جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے، اس بات کا اہتمام کرتی رہی کہ سفیر یا ایلچی کے انتخاب میں بڑی باریک بینی سے کام لیا جائے، تاکہ منتخب سفیر مفوضہ ذمہ داری اور نمائندگی کے معیار پر کھرا اتر سکے (۳۳۱)۔

۲-اسلام کی دعوت دینا:

یہ کام مسلمانوں کے سفیر یا ایلچی کو سونپے گئے کاموں میں اصل کام کی حیثیت رکھتا ہے، خصوصا جب عارضی طور پر کوئی وفد بھیجا جائے، کیونکہ ایلچی کو بھیجنے اور غیر اسلامی حکومت کے ساتھ اس کے تبادلہ کا مقصد بنیادی طور پر یہ ہوتا ہے کہ جس ملک کی طرف سفیر بھیجا گیا ہے وہاں تک

۳۳۰- سیاست نامہ (الترجمۃ الفنسیۃ)، ص ۱۳۸-۱۳۹ (نقلا عن دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق ص ۱۰۳-۱۰۴)۔

۳۳۱- سابقہ مراجع، ص ۹۹-۱۰۴۔

دعوت اسلامی کا پیغام پہنچا دیا جائے، اور وہاں کی آبادی کو دین اسلام کے احکام سے واقف کرادیا جائے، اور یہ ذمہ داری اس طرح مکمل ہوسکتی ہے کہ اسلامی شریعت کے کلی خصائص اور عمومی صفات کے حوالے سے اسلام کی اشاعت کی جائے، اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا جائے کہ اسلام ایک ہمہ گیر عمومی شریعت کا نام ہے، جو پوری دنیا سے خطاب کرتی ہے، اور جو اسلامی حکومت کے سربراہ کو اس بات کا مکلّف بناتی ہے کہ وہ متعدد ذرائع ووسائل سے کام لیتے ہوئے روئے زمین کے گوشے گوشے میں رہنے والے غیر مسلموں تک دعوت کی تبلیغ کی ذمہ داری ادا کردے۔

اس کے علاوہ اسلامی حکومت کا بالخصوص عہد نبوت اور خلافت میں جو معمول رہا، اس سے ان خطوط کا پتہ چلتا ہے جنہیں لے کر مسلم سفراء اور قاصدین غیر اسلامی ممالک تک پہنچے، جن کا مقصد دعوت اسلامی کی نشر واشاعت تھا، مثال کے طور پر اللہ کے رسول ﷺ کے وہ خطوط جو آپ ﷺ نے حبشہ کے نجاشی، روم کے ہرقل، مصر کے مقوقس اور فارس کے کسری کے نام روانہ فرمائے، ان میں ایلہ کا پادری اور غسانسہ کا حکمراں حارث بھی شامل ہے (۳۳۲)۔

سیرت وتاریخ کی کتابیں یہ واقعہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت مصعب بن عمیرؓ اسلامی حکومت کے پہلے سفیر تھے، جنہیں آپ ﷺ نے ہجرت سے پہلے عقبہ کی دوسری بیعت کے بعد مدینہ روانہ فرمایا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہاں آباد لوگوں کو دین کی تعلیم دیں، انہیں قرآن پڑھائیں اور اسے یاد کرائیں (۳۳۳)۔

جس قاصد یا سفیر پر غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، اس کو چاہئے کہ وہ اس دعوت کی عظمت کے معیار پر ہو جسے غیر مسلموں تک واضح انداز میں ایسے اسلوب بیان کو اختیار کرتے ہوئے پہنچانے کی ذمہ داری اسے سونپی گئی ہے، جس کے ذریعہ وہ

۳۳۲- سابقہ مراجع، ص ۹۷۔

۳۳۳- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، سابق مراجع ۲/ ۵۸، دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، سابقہ مراجع، ص ۴۷۔

طے شدہ عمومی اصول کی خلاف ورزی کئے بغیر مکالمے کے دوران ہوشیاری، ذہانت اور برتاؤ میں لچک نرمی اور گفتگو کی مہارت سے کام لیتے ہوئے غیر مسلموں کو ان کی زبان میں مخاطب کر سکے، اس کی مثال وہ گفتگو ہے جو اللہ کے رسول ﷺ کے سفیر حاطب بن بلتعہ اور مصر کے مقوقس کے درمیان ہوئی، جس میں مقوقس نے سفیر کا خط لینے اور پڑھنے کے بعد جب حاطب نے اس کو پختہ اسلوب میں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی تو ان سے پوچھا: ''محمد اگر وہ نبی ہیں تو اپنے مخالفین کو بددعاء دینے اور ان کو ملک بدر کرنے سے انہیں کس چیز نے روکا ہے؟ اس کا جواب حضرت حاطب بن بلتعہ نے یہ دیا: '' حضرت عیسی علیہ السلام کو کس چیز نے ان لوگوں کے خلاف ہلاکت کی بددعاء کرنے سے روکا تھا جو انہیں گرفتار کر کے قتل کرنے کے لئے گئے تھے؟'' اس پر مقوقس نے کہا کہ آپ نے صحیح جواب دیا، آپ ایک دانا اور ایک صاحب دانش کے پاس سے آئے ہیں (۳۳۴)۔

۳- مذاکرات کرنا:

دستور یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ایلچی کو صرف نظر اس سے کہ وہ دائمی وفد کا سربراہ ہے یا عارضی وفد کا، جس ملک کی طرف روانہ کیا گیا ہے اس ملک کی ذمہ دار اتھارٹیز سے مذاکرات کرنے کی ذمہ داری دی جاتی ہے، تاکہ دونوں ملکوں کے عوام کے مخصوص حالات سے متعلق یا دونوں کے درمیان تجارتی اور اقتصادی لین دین سے متعلق کسی معاہدہ پر اتفاق ہو جائے، اس کے علاوہ دونوں ممالک کے درمیان دوطرفہ تعلقات کے اور بھی مختلف پہلو ہیں جن سے متعلق معاہدہ کی ذمہ داری دی جاسکتی ہے، اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ ان تمام حالات میں سفیر یا مسلم ایلچی کو وہ تمام دستاویزات یا خطوط اور کاغذات حوالے کئے جائیں گے، جو متعلقہ ملک کے ساتھ

۳۳۴- مرجع سابق ص ۱۰۰-۱۰۰۔ نیز دیکھئے: الطبری بتاریخ الطبری، مرجع سابق ۳/۲۱۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل، الدبلوماسی فی الاسلام مرجع سابق، صفحہ نمبر ۱۲۷۔

مذاکرات کرنے کی ذمہ داری سونپے جانے کا ثبوت سمجھے جائیں گے، جیسا کہ یہ بھی اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ایلچی اور قاصد حضرات نے ۶ھ صلح حدیبیہ کے موقع پر اللہ کے رسول ﷺ اور قریش کے درمیان جو مذاکرات ہوئے ان میں اہم بنیادی کردار ادا کیا، یہی صورتحال صلح کے ان معاہدوں کی بھی ہے جو مسلمانوں اور ان سے برسر پیکار لوگوں کے درمیان ہوئے (۳۳۵)۔

۴-جس ملک کی طرف بھیجا جائے وہاں کے حالات کی چھان بین کرنا اور وہاں کے تمام احوال سے باخبر رہنا:

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے سفیر یا ایلچی کو اس طرح کی ذمہ داری سپرد کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جو بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے، خاص طور پر اسے جس ملک کی طرف سفیر کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے اس کے متعلق اسلامی حکومت کے موقف اور پالیسی کے تعین کے حوالے سے اس کی ذمہ داری مزید بڑھ جاتی ہے، جب دونوں ممالک کے تعلقات ایک طرح سے کشیدہ ہوں، یا دونوں کے مزاج میں عداوت اور کشمکش کا عنصر غالب ہو، نظام الملک نے اپنی متذکرہ بالا کتاب ''سیاست نامہ'' میں اس کام کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، جس کی ذمہ داری قاصد یا ایلچی کو دی جاتی ہے اس ملک کے تمام حالات دریافت کرنے سے متعلق جہاں اسے بھیجا گیا ہے، خصوصا جب اس ملک سے اسلامی حکومت کو دشمنی اور جنگ جیسی صورتحال کا سامنا ہو، صاحب کتاب نے قاصدوں کو بھیجنے اور سفارت خانہ کے تبادلے کے پیچھے جو متعدد اور متنوع مطلوبہ مقاصد کارفرما ہوتے ہیں ان کی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد، اس بات پر زور دیا ہے کہ یہ حضرات حقیقت میں راستہ کی صورتحال سے باخبر ہونا چاہتے ہیں، اور یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ راستے ہموار ہیں یا نہیں جن سے فوجیوں کا گزرنا ممکن ہے، اور ان راستوں میں ایسی جگہیں ہیں یا نہیں جہاں چارہ کے لئے گھاس مل سکتی ہیں، اور ایسی جگہیں کون سے ہیں جہاں یہ سب کچھ

۳۳۵- مرجع سابق، نیز دیکھئے: ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح الرسالۃ والسفارۃ مرجع سابق، ص ۱۵۲۔ القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق ۶/ ۴۵۳۔

دستیاب نہیں، وہ یہ بھی جاننا چاہتے ہیں کہ فوجی قوت کا کیا حال ہے اور تعداد کیا ہے، راشن، دفاع اور حملہ کی تیاری کے لحاظ سے ان کی پوزیشن کیا ہے؟ سربراہ مملکت کی طرز زندگی کیسی ہے؟ اور وہ کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہے؟ یہ بھی جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کے دربار کا انتظام وانصرام کیسا ہے؟ اور دربار کے رسم ورواج کیا ہیں؟ کیا مملکت آبادی کی لحاظ سے ترقی پذیر ہے، یا کھنڈرات ہی کھنڈرات ہیں؟ اس سے اس کے فوجی خوش رہتے ہیں یا ناراض رہتے ہیں؟ تاکہ اگر کسی دن وہ اس کی سلطنت پر حملہ کریں، یا اس کے کسی منصوبہ کو ناکام بنانا چاہیں یا اس کے عیوب اور خامیوں پر تنقید کریں تو وہ پوری طرح باخبر ہوں اور اس کے فائدے اور نقصانات کو مدنظر رکھتے ہوئے اقدام کریں (۳۳۶)۔

بعض علماء کا کہنا ہے کہ اللہ تعالی کا قول: ''**اذهب بكتابي هذا فألقه اليهم ثم تولَّ عنهم فانظر ماذا يرجعون**'' جو حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف سے جواب میں ہے جو ان کے پاس ملکہ سبا بلقیس کے حالات لے کر آیا تھا، اس دلیل شرعی پر مشتمل ہے کہ مسلمان سفیر یا ایلچی کو اس ملک کے حالات کی انکوائری کی ذمہ داری دی جائے جہاں اسے بھیجا جارہا ہے، تاکہ وہ اپنی مملکت کو وہاں کی حقیقت حال سے باخبر کرسکے، چنانچہ متذکرہ آیت میں ایسا اشارہ ہے جس سے ایلچی کا کام اس رخ میں متعین ہوجاتا ہے جس طرف اسے بھیجا جاتا ہے کہ وہ اس خطہ میں اپنی مملکت کا نمائندہ ہے، اور اس پر لازم ہے کہ بڑی باریکی سے تمام احوال کی چھان بین کرے، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جیسا کہ آیت کریمہ سے واضح ہے ہدہد کو ہدایت کی کہ وہ قریب کی کسی جگہ ہی کنارہ کش ہوکر چھپ جائے، اور غور کرے اور جانے کہ وہ لوگ آپس میں ایک دوسرے کو کیا کہتے ہیں، کیونکہ جو خط دے کر اسے بھیجا گیا تھا، اس میں سب ہی کو اسلام کی دعوت دی گئی تھی (۳۳۷)، حدیث کے ذخیرہ میں آپ ﷺ کے متعدد اقوال

۳۳۶- سیاست نامہ (الترجمۃ الفرنسیۃ) ص ۱۳۸-۱۳۹ (نقلا عن دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق ص ۱۰۳-۱۰۴)۔

۳۳۷- ابوالسعود، تفسیر ابی السعود، مرجع سابق، ج ۴/ ۲۰۲، الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق ۳/ ۲۶۶، ابن کثیر،

وافعال ہیں جو مسلمان سفیر یا ایلچی کی ذمہ داری کی شرعی حیثیت طے کرتے ہیں، اور سفیر یا ایلچی کا بھیجے گئے خطہ کے حالات کی دستیاب جائز وسائل وذرائع کے ذریعہ انکوائری کرنے میں جو اہم رول ہوتا ہے، اسے یقینی بناتے ہیں، جیسے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مدینہ کے وفود سے عقبہ کی بیعت کے بعد، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ بھیجا، تاکہ انہیں دین سکھائیں، اور نماز میں ان کی امامت کریں، علاوہ ازیں دوسری بنیادی ذمہ داری یہ تھی کہ مدینہ کے معاشرہ پر گہری نظر رکھیں، قریب سے ان کے حالات کا جائزہ لیتے رہیں، اور دعوت کے تعلق سے انکا رخ کیا ہے اس سے بھی باخبر رہیں، یہاں تک کہ آپ ﷺ کے سامنے اس کی صورتحال بالکل واضح ہوجائے، خاص طور سے جب کہ آپ ﷺ کی توجہ اس جانب مرکوز ہوگئی تھی کہ مدینہ منورہ کو آئندہ اسلامی مملکت کے قیام کا مرکز بنائیں گے، اور حضرت مصعب بن عمیرؓ جب مکہ واپس آئے تو وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے مدینہ کی سماجی صورتحال کی مکمل اور جامع تصویر کشی کرسکیں، جس کی وجہ سے اللہ کے رسول ﷺ کا مدینہ کی طرف یعنی ایسی قوم کی طرف جو ان سے اور دین اسلام سے حد درجہ محبت کرنے والی تھی، ہجرت کا فیصلہ مستحکم ہوجائے (۳۳۸)، اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کا وہ خط جو آپ نے ہجر (بحرین) کے بادشاہ کے نام تحریر فرمایا تھا، جس میں آپ ﷺ کا یہ قول مبارک تحریر تھا: ''**قدحمد رسلی مکانک**'' (میرے سفراء نے آپ کے اثر ورسوخ کی تعریف کی ہے) آپ ﷺ کا وہ نامہ گرامی جو منذر بن ساوی کے نام تھا، اس میں یہ درج تھا: '' میرے ایلچیوں نے آپ کی تعریف کی ہے اور آپ کا ذکر خیر کیا ہے'' (۳۳۹)، ان کے علاوہ اور بھی دلائل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ

تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ۳/ ۶۶۔

۳۳۸- دکتور محمد رواس قلعۃ جی، قراءۃ جدیدۃ للسیرۃ النبویۃ، مرجع سابق ص ۱۲۰-۱۲۱۔

۳۳۹- محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ، مرجع سابق ص ۵۷، ۶۰، ۶۵۔ ابن سعد، الطبقات الکبری مرجع سابق ج ۱-۲، ص ۱۹-۲۷، اسی طرح دیکھیں: ڈاکٹر احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۲۱۶۔

مسلمان ایلچی یا سفیر کو چاہئے کہ جس خطہ میں جائے وہاں کے احوال کا باریکی سے جائزہ لے، اور جو کچھ اچھا یا برا نظر آئے اس سے اپنی حکومت کو باخبر کرتا رہے، تاکہ اسلامی مملکت کے سربراہان صحیح صورتحال سے واقف ہوتے رہیں، اور متعلقہ حکومت کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے ملک کی پالیسی بنائیں۔

معلومات جمع کرنے کے کام میں مثبت اور منفی پہلو:

سفیر یا ایلچی جسے اس خطہ کے حالات کی انکوائری کی ذمہ داری دی گئی ہو، جہاں اسے بھیجا گیا ہے، اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے باہمی تعلقات کے تبادلے کے پس منظر میں، بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس متذکرہ ذمہ داری کی اسلامی شریعت کے اصولی مراجع میں شرعی دلیل پائی جاتی ہے اور اس کے دو پہلو ہوتے ہیں: ایک پہلو ایجابی اور دوسرا سلبی، رہی بات غیر اسلامی مملکت کے حالات کی انکوائر کرنے اور اس سے متعلق معلومات اکٹھا کرنے کی جو ذمہ داری سپرد کی گئی ہے اس کے مثبت پہلو کی، تو اس کا تعلق مسلم ایلچی کی اس کوشش سے ہے، جو متعلقہ خطہ کے احوال سے واقف ہونے کی خاطر کی جاتی ہے، اور اس سلسلے میں جتنی معلومات حاصل ہوتی ہیں ان سے اپنی حکومت کو واقف کرانے کے لئے کی جاتی ہے، لہذا ایلچی کا اس ذمہ داری کو انجام دینا، سفراء اور قاصد کو بھیجنے کے بنیادی مقاصد میں شمار ہوتا ہے، اور ان سب سے زیادہ مؤثر ذرائع و وسائل میں شمار ہوتا ہے، جن کی مدد سے متعلقہ مملکت کے سلسلے میں فعال، مبنی بر حکمت اور درست و مستحکم پالیسی وضع کی جاتی ہے، اس طریقہ کار کی اہمیت اور دیگر ممالک کے ساتھ اسلامی ریاست کے تعلقات کے تناظر میں اس کا کردار اور اس کے اثرات اس حد تک اہم ہیں کہ حضرت عمرو بن العاصؓ جب فلسطین کے اجنادین میں رومی کمانڈر کو شکست دینے سے قاصر ہوئے، تو از خود وہاں گئے اور اس طرح گئے جیسے کہ وہ قاصد ہوں، اسے اپنی چاہت بتائی، آپ نے اس کی باتیں سنیں، اور اس کے قلعوں پر غور کیا، یہاں تک کہ وہ آپ کے مقصد سے پوری

طرح واقف ہوگیا(۳۴۰)۔

مثبت پہلو میں وسعت ہے اور وسعت کے دائرہ میں غیر اسلامی مملکت کی صورتحال کی انکوائری اور معلومات اکٹھا کرنا شامل ہے، تاکہ ان ممالک کے احوال سے باخبر ہونے کی کوشش کی جائے، اور ان میں پائے جانے والے کمزور اور مضبوط پہلو کا ادراک کرلیا جائے، خصوصا جب اس غیر اسلامی ملک کے اسلامی ملک سے تعلقات دشمنی اور جنگ سے متاثر ہوں، اور ایسا اسی وقت ممکن ہوگا جب اسلامی ریاست میں موجود اس کے ملک کے قاصدوں سے رابطہ کیا جائے گا، تاریخ اور سیرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ انگریزوں کے قاصد صلاح الدین سے ہونے والے مذاکرات کے درمیان اسلامی مملکت میں آتے جاتے رہے، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی حکومت کے سامنے انگریزوں کے حالات اور ان کے زیر نگیں ممالک کے سیاسی اتار چڑھاؤ واضح ہوجائیں(۳۴۱)۔

رہی بات منفی پہلو کی تو مدمقابل ملک سے متعلق معلومات حاصل کرنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو اسلامی مملکت اس کی کوشش کرے کہ دوسرے ملک کا سفیر یا غیر ملکی ایلچی ان رازوں تک نہ پہنچ جائے جو آئندہ اسلامی مملکت کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوں، خصوصا جب دونوں ممالک کے درمیان تعلقات جنگ سے متاثر ہوں، یا دونوں کے درمیان نظریہ اور مذہب کا فرق ہو، جیسا کہ اسلامی مملکت کا یہ معمول رہا ہے کہ دوسرے ممالک کے سفراء اور ایلچیوں کا ریاست کے مضافاتی علاقوں میں پرجوش استقبال کیا جاتا ہے، مگر جب تک وہ مملکت میں قیام

۳۴۰- ابن الاثیر الکامل فی التاریخ، مرجع سابق ج ۲، ص ۲۴۷۔

۳۴۱- ابن شداد، النوادر السلطانیۃ والمحاسن الیوسفیۃ (سیرۃ صلاح الدین)، تحقیق جمال الشال، القاہرۃ، ۱۹۶۵ء، ص ۲۳۱ (مشار الیہ، دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۲۱۴، اور اس میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو فارس (ایران) کے ساتھ سفیروں اور نمائندوں کے تبادلے سے جو فوائد حاصل ہوئے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ انہیں اپنے دشمن کے حالات کو جاننے، اس کی قوت و کمزوریوں کا اندازہ لگانے اور اس کی بہت سی داخلی کیفیتوں کو سمجھنے کا موقع ملا۔

پذیر ہوتے ہیں ان پر گہری نگاہ رکھی جاتی ہے، چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے دس مسلمانوں کو جو یونانی جانتے تھے، دس بازنطینیوں پر مشتمل سفارتی مشن کے ساتھ جانے اور اسلامی ریاست کی صورتحال سے متعلق رومیوں کے مشاہدات ریکارڈ کرنے کی ذمہ داری سونپی، انہیں یہ بتائے بغیر کہ وہ ان کی زبان جانتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب اپنے متعلق رومیوں کے خیالات سے واقف ہوئے، کیونکہ جب بازنطینی امیوں کی جامع مسجد کا دورہ کررہے تھے، اور اس کے فنی نقوش پر غور کررہے تھے تو ان کا سربراہ بے ہوش ہوکر گر پڑا اور جب اس کے بیدار ہونے کے بعد اس کے ساتھیوں نے بے ہوشی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ رومی عربوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ان کا اقتدار مختصر مدتی ہے، لیکن جب اس نے عربوں کے تعمیری شاہکار دیکھے تو اسے یہ احساس ہوا کہ وہ طویل مدت تک حکومت کریں گے، اس لئے اس غم میں اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوا(۳۴۲)، اسلامی حکومت غیرملکی قاصدوں اور سفیروں سے متعلق جس کڑی نگرانی اور چوکسی کا مظاہرہ کررہی تھی، اس کے نتیجے میں وہ بہت سے معاملات میں ان سفیروں کے بارے میں حقیقت دریافت کرنے میں کامیاب رہی، جو اسلامی ممالک کے اندرونی احوال کی جاسوسی کررہے تھے، اور اندرون ملک افراتفری اور بے چینی پھیلانے کے لئے کام کر رہے تھے، جیسے تیمورلنگ نے جن قاصدوں کو شام بھیجا تھا اس پر لشکرکشی سے پہلے پہلے، ان میں سے ایک گرفتار کرلیا گیا، کیونکہ وہ ملک شام کی صورتحال کی جاسوسی کررہا تھا، جب تیمورلنگ نے اس کے خلاف احتجاج کیا ظاہر بادشاہ برقوق سے تو متأخرالذکر نے جواب دیا کہ آپ کا بھیجا گیا مذکورہ قاصد ایک ایک کرکے مکانات کو نشان زد کررہا تھا ہماری حفاظتی زمین پر، اور ہماری ایک ٹیم کو اس کی اطلاع ملی، جب وہ شام کے محفوظ وسیع علاقہ میں پہنچا تو اس نے وہاں کے نمائندہ سے

۳۴۲- فتحی عثمان، الحدود الاسلامیۃ البیزنطیۃ بین الاحتکاک الحربی والاتصال الحضاری، الکتاب الثانی، القاہرۃ دار الکتاب العربی للطباعۃ والنشر، ص۴۰۹۔

کہا کہ بس یہ زمین امیر وقت تیمور لنگ کی ہے، اور ان ہی کے نام سے خطبہ پڑھیں، اگر قاصد اصلاحی کام کرتا تو نہ مکانات کو نشان زد کرتا، اور نہ غیر مناسب فضول کام میں مشغول ہوتا اور نہ غیر متعلق امور پر گفتگو کرتا، اس لئے کہ قاصد کو گونگا، اندھا، کمزور دماغ اور بھاری سر والا ہونا چاہے(۳۴۳)۔

۵-اسلامی ریاست کی طرف سے تسلیم شدہ ممالک میں اپنی ریاست اور اس کے شہریوں کے مفادات کا تحفظ:

اسلامی حکومت کے عمومی مفاد اور وہاں کے شہریوں کے اندرونی اور بیرونی مصالح کے تحفظ کی فکر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سفارتوں اور ایلچیوں کے تبادلے میں بنیادی مقصد کی حیثیت سے موجود ہوتی ہے، اسلامی ریاست کے سفراء جن ممالک میں بھیجے جاتے ہیں وہاں اسلامی ریاست کے مفاد کا تحفظ اسلامی ریاست کے بنیادی فرائض میں شامل ہے تاکہ وہ اپنی سرزمین سے باہر رہنے والے اپنے شہریوں کی حفاظت کرے چاہے وہ مسلمان ہوں یا ذمی، اسے معاصر بین الاقوامی قانون میں سفارتی تحفظ قرار دیا گیا ہے، اس سلسلے میں چند آیات و احادیث ہیں جو اسلامی مملکت کو تحفظ کے اس جیسے فریضہ کا مکلّف بناتی ہیں، جیسے اللہ تعالی کا ارشاد ہے:''**ومالكم لاتقاتلون فی سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنا من لدنک وليا واجعل لنا من لدنک سلطانانصيرا**''(آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لئے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و

۳۴۳- القلقشندی، صبح الأعشی، مرجع سابق، ج۷، ص۳۱۶، ابن الفراء، یرسل الملوک، مرجع سابق، ص۱۱۶۔

مددگار پیدا کردے)(۳۴۴)، یہ آیت اس طرف شارہ کرتی ہے کہ ''مسلمان کے لئے کوئی عذر یا کوئی رکاوٹ نہیں جو اسے شر کی جگہ خیر قائم کرنے اور شرک کی جگہ توحید کا غلغلہ بلند کرنے کی خاطر اللہ کے راستہ میں قتال کرنے سے روکے، اور ظلم وزیادتی کی جگہ رحم وکرم اور عدل وانصاف عام کرنے سے اسے باز رکھے، اور ''سبیل اللہ'' کے عموم سے نکال کر ان کمزوروں کی جان بخشی کو خاص کردیا گیا جو مومن تھے اور مکہ میں محصور تھے، اور مشرکین ہر طرح سے ان پر ظلم وزیادتی کر رہے تھے، اس میں نخوت وغیرت کو ابھار دیا گیا ہے، اور فطری سکون کو متحرک کیا گیا ہے، اور رحمت ومودت اور غیرت وحمیت کے احساس کو بیدار کیا گیا ہے، کیونکہ یہ کمزور سمجھے جانے والے افراد اپنے دین کی خاطر اپنی قوم کی طرف سے کی جانے والی ہر امداد ونصرت سے دور کردیئے گئے تھے، اور ہر مددگار کے تعاون سے محروم کردیئے گئے تھے اور یہ افراد چونکہ انہیں امید کے سارے اسباب ختم ہوتے نظر آرہے تھے، اپنے رب سے مدد کے طلب گار تھے، اپنے رب کو پکارتے تاکہ ان کا رب ان کی مصیبت دور کردے اور ان کو ان کے وطن سے نکال دے، کیونکہ وہاں کے رہنے والے ان پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے تھے، اور جو چیز ان کمزور سمجھے جانے والے افراد کی خلاصی پر زور دیتی ہے وہ کہ اللہ تعالی نے ان حضرات کے لئے مذکورہ آیت میں خصوصی راستہ تشکیل دیا ہے جسے ''سبیل اللہ'' پر عطف کیا ہے جبکہ وہ راستہ ''سبیل اللہ'' میں پہلے سے داخل ہے(۳۴۵)۔

حدیث کے ذخیرہ میں مندرجہ ذیل روایتیں ہیں جن سے اسلامی مملکت کے شہریوں کے مفاد کے تحفظ کا ثبوت فراہم ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**المسلمون**

۳۴۴- سورۂ نساء:۷۵۔

۳۴۵- محمد رشید رضا، تفسیر المنار، مرجع سابق ۵/ص۲۱۰-۲۱۱، نیز دیکھئے: القرطبی، الجمع لاحکام القرآن، مرجع سابق (طبعۃ ۱۹۵۲ء)، ج۵، ص۲۷۹-۲۸۰، سمید قطب، فی ظلال القرآن، مرجع سابق (طبعۃ ۱۹۸۵ء) ج۵، ص۷۰۸-۷۰۹۔

يدعلى من سواهم تتكافأ دماء هم''(مسلم دوسروں کے خلاف متحد ہیں، ان کے خون کی حرمت برابر ہے)،''**وأن ذمة المسلمين واحدة، فإن جارت عليهم جائرة فلا تخفروها**''(مسلمانوں کا عہد ایک ہے، اگر کوئی ان پر ظلم کرے تو تم ان کے ساتھ بدعہدی نہ کرو)اور''**ألمسلم أخوالمسلم لايظلمه، ولا يخذله ولا يسلمه فى مصيبة نزلت به**''(ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس پر ظلم نہیں کرتا، نہ اسے بے سہارا چھوڑتا ہے اور نہ اسے اس پر نازل ہونے والی مصیبت دشمن کے حوالے کرتا ہے)اور''**أن المؤمن أخوالمؤمن يكف عليه ضيعته ويحوطه من ورائه**''(ایمان والا ایمان والے کا بھائی ہے، وہ اس کی جائیداد کی حفاظت کرتا ہے اور اس کے غائبانہ میں اس کی حفاظت کرتا ہے)(۳۴۶)۔

یہ ساری روایتیں اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ اسلامی مملکت کے وہ شہری جو مملکت سے باہر رہتے ہوں ان پر ہونے والے ظلم اور انہیں پہنچنے والے نقصانات کے خاتمہ کی خاطر اٹھ کھڑا ہونا دوسرے ممالک کے نزدیک اسلامی حکومت کی نمائندگی کے لئے تسلیم شدہ سفراء اور ایلچیوں کی بنیادی ذمہ داریوں کے دائرہ کار میں درج ہے۔

سفیر کو بھیجے گئے ملک میں اسلامی مملکت کے شہریوں کے مفاد کے تحفظ کی خاطر سپرد کی گئی ذمہ داری پر دلالت کرنے والا ایک واقعہ یہ ہے کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جب اپنے عہد خلافت میں اپنا قاصد روم کے بادشاہ کے پاس بھیجا، تو قاصد کا گزر جبکہ وہ بادشاہ کے دربار سے باہر نکل رہا تھا، ایک ایسے مسلمان کے پاس سے ہوا جسے رومیوں نے قید کرلیا تھا، اور اسے نصرانیت قبول کرنے پر مجبور کیا تھا، مگر اس نے انکار کردیا، تو ان لوگوں نے اس کی آنکھ نکال لی،

۳۴۶- کنز العمال، مرجع سابق ج۱،ص۹۵-۱۴۱، ج۴ص۴۳۵، الالبانی، صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ، ج۱،ص۶۴۵۔

اور اسے ایسی جگہ پھینک دیا جہاں اس کی طرف وہ لوگ گیہوں پھینکتے جسے وہ پیتا اور روٹی پھینکتے جسے وہ کھاتا، جب خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ کو اس شخص کے مسئلہ کا قاصد کے توسط سے علم ہوا تو انہوں نے روم کے بادشاہ کو لکھا کہ اسے رہا کر دیا جائے، نہیں تو وہ اس پر ایسے لشکر جرار سے حملہ آور ہوں گے جس کا اگلا حصہ روم کے باشاہ کے پاس ہوگا اور آخری حصہ عمر بن عبدالعزیز کے پاس، باجودیکہ روم کے بادشاہ نے اس مسلم شخص کی رہائی کو اور اسے خلیفہ کے قاصدوں کے ساتھ صحیح سالم لوٹانے کو ٹال دیا، مگر وہ اخیر میں قاصد کو یہ کہتے ہوئے خلیفہ کے مطالبہ کے سامنے جھکنے پر مجبور ہوا'' خلیفہ نے اپنی زندگی میں جو حکم دیا تھا اس پر تو لبیک نہیں کہہ سکے مگر ان کی وفات کے بعد ان کے حکم کی تعمیل کی طرف لوٹتے ہیں'' (۳۴۷)، اور اس آدمی کو قاصد کے ساتھ بھیج دیا، اس طرح وہ واقعات جو اسلامی مملکت کے باہر رہنے والے شہری کے مفاد کے تحفظ پر دلالت کرتے ہیں ان میں ایک واقعہ وہ ہے جو خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ میں پیش آیا جب ایک مسلمان خاتون نے دشمنوں کی تکلیفوں سے کراہتے ہوئے ''**وامعتصماہ**'' کہہ کر مدد کی اپیل کی تھی (۳۴۸)۔

تاہم مسلمان ایلچی کو اسلامی مملکت کے باہر رہنے والے شہریوں کے تحفظ کی جو ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے، اس سے متعلق اسے بھی شریعت کے مقرر کردہ حدود کا پابند ہونا چاہئے، اور ان احکام وضابطہ کا پابند ہونا چاہئے جن پر اسلامی مملکت اور جس مملکت میں مسلم مملکت کے یہ شہری حضرات قیام پذیر ہیں، کے درمیان اتفاق ہو چکا ہو، اس کے علاوہ اسلامی ریاست کے حالات مناسب ہیں یا نہیں اس کو بھی مدنظر رکھنا ضروری ہے، اس سے ہمارا مطلب یہ ہے کہ اس ریاست کے ساتھ جہاں مقیم اپنے شہریوں کے تحفظ کی ذمہ داری دی گئی ہے، اسلامی ریاست کے تعلقات کی کمزوری یا مضبوطی کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے، اس کی وضاحت کے لئے اتنا عرض کر دینا

۳۴۷- دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۱۱۶۔

۳۴۸- راجع مبدا الوفاء بالعہود والمواثیق فی الدراسۃ المتعلقۃ بالأساس الشرعی والمبادی الحاکمۃ للعلاقات الخارجیۃ للدولۃ الاسلامیۃ، مرجع سبق ذکرہ۔

کافی ہے کہ وہ فرد جس کے مفاد کے تحفظ کے لئے مداخلت کی جاتی ہے، اس فرد میں مذہبی یا شہریت کی خصوصیت کا پایا جانا ضروری ہے، مطلب یہ ہے کہ اس فرد کا مسلمان یا ذمی ہونا ضروری ہے، یعنی اس کا اسلامی مملکت کا شہری ہونا لازمی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس آدمی نے اس ملک کے داخلی قوانین کی جہاں وہ مقیم ہے، اس قدر مخالفت نہ کی ہو کہ وہاں کے شہریوں کے لئے امن وآشتی کا ماحول خطرہ میں پڑ گیا ہو، یا وہاں کا حسن انتظام بگڑ گیا ہو، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس نے اس ملک کے اندر قانونی چارہ جوئی کا راستہ اختیار کیا ہو، اور اپنے حقوق حاصل کرنے یا اپنے خلاف ہونے والی ناانصافی کو دور کرنے کی کوشش کی ہو مگر اسے کامیابی نہ ملی ہو، اس کے علاوہ اگر اسلامی ریاست اور دوسری ریاست کے درمیان کوئی معاہدہ ہوا ہو جس میں تحفظ فراہم کرنے کی غرض سے مداخلت کی گئی ہو، تو ایسے معاہدہ کے احکام کے تقاضوں کی تعمیل کو اہل ایمان کے لئے مدد کے اصول پر عمل کرتے ہوئے ترجیح دی جائے گی، نہ کہ اسے اسلامی مملکت کے حق میں غیر معتبر قرار دیا جائے گا(۳۴۹)، اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری بیرون ملک مقیم اپنے شہریوں کے مفادات کے تحفظ سے متعلق اپنے قاصدوں اور سفارت خانوں کے ذریعہ اپنے دائرہ کار اور حالات کے مطابق ہے، جو عصری بین الاقوامی برادری میں سفارتی تحفظ کے عنوان سے رائج ہے، جو چیز اسلامی ریاست کی طرف سے قبول کی گئی تحفظ کی ذمہ داری کو معاصر بین الاقوامی قانون میں ریاست کی طرف سے قبول کی گئی تحفظ کی ذمہ داری سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ کہ ریاست قانونی طور پر اپنے شہریوں کی حفاظت کی پابند ہے، چاہے وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، لہذا متعلقہ ریاست کے ساتھ چارٹرز اور معاہدوں میں بندھے ہونے کی صورت کو چھوڑ کر کسی اور صورت میں اسلامی ریاست عمومی مصلحت سے متاثر ہو کر تحفظ کے لئے سرگرم ہونے یا

۳۴۹- راجع مبدا الوفاء بالعہود والمواثیق فی الدراسۃ المتعلقۃ بالأساس الشرعی والمبادی الحاکمۃ للعلاقات الخارجیۃ للدولۃ الاسلامیۃ، مرجع سبق ذکرہ۔

اس سے پرہیز کرنے کا اختیار نہیں رکھتی ہے، دوسرے الفاظ میں اگر اسلامی ریاست عمومی مفاد اور غیر اسلامی ممالک کے ساتھ کئے گئے معاہدوں کی تکمیل کے پیش نظر بیرون ملک اپنے شہریوں کی حفاظت کے لئے مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کرتی ہے، ان کے حق میں یا ان کے خلاف تحفظ کی ذمہ داری کے جواز کی نفی نہیں ہوتی، اور شرعاً اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ تحفظ کی ذمہ داری کو مؤخر کرنے والے اسباب کے ختم ہوتے ہی اس فرض کو ادا کرے (۳۵۰)۔

جب مسلم سفیر کی ذمہ داری مصالح اور مفاد کا تحفظ ٹھہرا، تو مفاد کا تحفظ اپنی وسعت کی وجہ سے اسلامی مملکت اور اس کے شہریوں کے مفادات کے تحفظ پر بھی مشتمل ہوگا، وہ حالات جن میں اس ملک کے ساتھ اپنے ملک کے مفادات کے تحفظ کے لئے مسلمان سفیر کی ذمہ داری کی نشاندہی ہوتی ہے، جہاں اسے بھیجا جاتا ہے، وہ اس ملک کے حکام کے ساتھ بہت سے معاملات میں جیسے کہ تاوان کی ادائیگی، اور قیدیوں کے تبادلہ جیسے مسائل پر مذاکرات کرنا ہے، مسلم ایلچی اس سلسلے میں اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں کے مطابق اپنی اس ذمہ داری کو انجام دیتا ہے جیسے کہ قتل کا مسئلہ ہو، تاوان کا مسئلہ ہو یا بلا معاوضہ معاف کرنے کا معاملہ ہو، اور ایسا جو کچھ بھی عمل میں آئے گا وہ اسلام اور عام مسلمانوں کے مفادات کی تکمیل کے پیش نظر قاضی کے فیصلے کے مطابق ہوگا۔

اس مسئلہ پر بدر کے قیدیوں کے متعلق اللہ کے رسول ﷺ کا جو طرز عمل تھا اس سے استدلال کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مالدار گھرانے کے ہر فرد کا فدیہ چار ہزار درہم مقرر فرمایا، پھر اسے کم کر کے تین ہزار اور پھر دو ہزار کر دیا اور ایک ہزار ان کا رکھا جو لوگ مالداری میں

۳۵۰- راجع حول احکام الحمایۃ الدبلوماسیۃ فی القانون الدولی العام وکیف ہی لم تزل حقا، دولۃ الفرد المتضرر، بینما ہی فی الشریعۃ الاسلامیۃ، حق للدولۃ الاسلامیۃ وواجب علیہا فی آن: -شارل روسو، القانون الدولی العام (ترجمۃ شکر اللہ خلیفۃ وعبد المحسن سعد)، بیروت، الأہلیۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۸۲ء، ص ۱۱۱-۱۲۰، دکتور محمد سامی عبد الحمید، أصول القانون الدولی العام، الجماعۃ الدولیۃ، مرجع سابق۔

کچھ کم تھے، اور جو خصوصی عہدوں پر فائز تھے ان کا فدیہ بارہ ہزار طے فرمایا، اسی طرح ان لوگوں کا فدیہ معاف کر دیا جن کے پاس مال واسباب میں سے کچھ نہ تھا مگر یہ کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں (۳۵۱)، اسی طرح روایت ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوعؓ نے اللہ کے رسول ﷺ کو قبیلہ فزارہ کے قیدیوں میں سے ایک خاتون قیدی ہبہ کی، جس سے اللہ کے رسول ﷺ نے ان چند مسلمانوں کا فدیہ ادا کیا، جو مکہ میں قید تھے (۳۵۲)، قیدیوں کے فدیہ سے متعلق اسلامی سفارتوں میں نصر بن الازہر کی سفارت بھی تھی، جسے المتوکل نے ۸۶۱ء میں بغداد میں ۸۵۹ء کی رومی سفارت کے جواب میں قائم کیا تھا، اس سفارت کے ذریعہ ۷۰ فیصد مسلمان قیدیوں کو فدیہ کے تبادلے کے حوالے سے رہا کرنے کی بات چیت کی گئی تھی (۳۵۳)، اسی طرح ان حالات میں جن میں مسلم سفیر کو اسلامی مملکت کے مفاد کے تحفظ کی ذمہ داری سونپی جاتی ہے، میں سفراء اور ایلچی حضرات ان ممالک سے جن کی طرف وہ بھیجے جاتے ہیں بات چیت کرتے ہیں، تاکہ مختلف معاملات میں دونوں ممالک کے مفادات کی تکمیل کی غرض سے معاہدے انجام پا جائیں، جیسے کہ صلح کا معاہدہ جو حدیبیہ کے موقع پر کیا گیا، اس میں قریش اور اللہ کے رسول ﷺ کے درمیان قاصدوں کا تبادلہ کیا گیا تھا، اسی طرح مفاہمت یا عہد ذمہ یا ضروری اسلحہ جات کی خریداری سے متعلق گفتگو کرنے کا معاہدہ کرنے کا مقصد یہ ہوسکتا ہے کہ حضرت یعلی بن امیہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں ایک خط بھیجا جس میں یہ تحریر تھا: ''جب تمہارے پاس ہمارے قاصد پہنچیں تو انہیں بطور قرض تیس زرہ دے دینا'' (۳۵۴)، مسلمانوں کی ترقی اور تجارت

۳۵۱- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق ج ۲، ص ۱۶۳-۱۶۸۔ الطبری، تاریخ الطبری، مرجع سابق ۴۵۸/۲۔

۳۵۲- دکتور محمد صادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۴۹۔

۳۵۳- دکتور عزالدین فودۃ، النظم الدبلوماسیۃ، مرجع سابق ص ۱۳۶۔

۳۵۴- الصنعانی، سبل السلام (تحقیق) طہ عبدالرؤف سعد، القاہرۃ، مکتبۃ الجمہوریۃ، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء، ج ۳، ص ۸۵۔ ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۱۵۲۔ صبیح الأعشی، مرجع سابق، ۶/ ۴۵۳۔

کے میدان میں ان کی پیش رفت اور اس کے نتیجے میں چین اور سط ایشیا کے سمندروں، بحر بالٹک اور اندلس کے ساحلوں، بحر اوقیانوس اور بحر سفید کے ساحلوں، اور افریقہ کے مشرقی ساحل اور بحر ہند کے جزائر کے درمیان تجارتی راستوں کا جو اہتمام کیا گیا، اس کی وجہ سے قاصدوں سفراء اور سفارت خانوں کی یہ ذمہ داری طے پائی کہ اسلامی مملکت اور دیگر ممالک کے درمیان تجارتی تعلقات کو ترقی دینے کی کوشش کریں گے، اور انہیں اس قدر مستحکم کریں گے کہ فریقین کے مفادات کے لئے اور دعوت اسلامی کے لئے معاون ثابت ہوں (۳۵۵)، چند ایسے سفارتی کام ہیں جن کا آپس میں تبادلہ یعنی اسلامی مملکت اور دیگر غیر اسلامی ممالک کے درمیان محض اس غرض سے ہوا کہ دونوں کے درمیان تجارتی لین دین منظّم ہوجائے، اور دونوں کے درمیان تجارتی تعلقات ترقی کر جائیں، ان میں حلب کے امیر اور بازنطینی بادشاہ کے درمیان سال ۹۵۳ء/ ۹۶۹ء میں طے پانے والا معاہدہ ہے، اور عکا اور اس کے ماتحت علاقوں میں سلطان قلاوون اور انگریزی بادشاہت کے درمیان طے ہونے والا معاہدہ ہے، جس میں اس بات کی صراحت کی گئی تھی کہ تمام سوداگر اور سفراء جن کی خشکی اور تری، نشیبی اور پہاڑی علاقوں میں دن اور رات آمد ورفت ہوتی رہتی ہے، وہ آتے اور جاتے دونوں حالتوں میں اپنی جان، و مال اولاد، خواتین، سامان، بچے، غلام چوپائے، جانور اور اپنے پاس موجود چیزوں کے حوالے سے مطمئن رہیں گے، اور جو چیز بھی ان کے ہاتھ میں ہوگی وہ محفوظ رہے گی (۳۵۶)۔

۳۵۵- المقریزی، السلوک فی معرفۃ دول الملوک، القاہرۃ، لجنۃ التألیف والترجمۃ ۱۹۳۶ء، ص ۶۹۲، دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلومسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق ص ۱۳۷-۱۳۹، دکتور مجید خدوری، مرجع سابق ص ۳۳۳-۳۳۴۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق ص ۴۵-۴۶۔

۳۵۶- دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق ص ۱۰۹۔

چھٹا مطلب

اسلام میں سفراء اور سفارتی عملے کا تحفظ

درحقیقت قاصدوں اور سفیروں کو حاصل مراعات اور استثنا کا بنیادی ماخذ دساتیر واعراف ہیں جن پر بین الاقوامی برادری میں معروف ومروج وہ اعراف ہیں جو اتنے ہی قدیم ہیں جتنے ممالک کے باہمی سفارتی تعلقات، یہاں تک کہ گروٹیس (Grotius) جو بین الاقوامی قانون کا بابائے اعظم کہلاتا ہے کا یہ کہنا درست ثابت ہوا کہ قوموں کے قانون میں دو اصول ہیں جو طے شدہ اور متفق علیہ ہیں: پہلا اصول سفیروں کے استقبال کا اور دوسرا یہ کہ ان کو کسی طرح کا نقصان یا تکلیف نہ پہنچے (۳۵۷)۔

اسلام بھی اس ترقی پذیر قانون سے یا قاصدوں اور سفارت خانوں کے معاملات سے متعلق خصوصی احکام سے دور نہیں رہا، بلکہ اس دستور اور روایت کو مستحکم کرنے کا خواہشمند رہا ہے تاکہ ایلچی یا سفیر کو تحفظ حاصل رہے، اور ان کی ذات، مال ومتاع سے تعرض نہ کیا جائے، اور اسے پوری قدرت حاصل رہے کہ پرامن ماحول میں اپنا خط سربراہ تک پہنچا سکے، ساتھ ہی مفوضہ ذمہ داری ادا کر سکے (۳۵۸)، اللہ کے رسول ﷺ کا طرز عمل اور خلفاء راشدین کا طریقہ کار

۳۵۷- دکتور عزالدین فودۃ، النظم الدبلوماسیۃ، مرجع سابق ص ۵۔

۳۵۸- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۶۰۰ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن قیم الجوزیۃ، زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، مرجع سابق، ج ۲، ص ۷۵ اور اس کے بعد کے صفحات، السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج ۵، ص ۱۹۸۴ اور اس کے بعد کے صفحات، ۲۱۳۴-۲۱۳۶، الرملی، نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، مرجع سابق، ج ۷، ص ۲۱۷ اور اس کے بعد کے صفحات، ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۱، ص ۶۰۲-۶۰۳، ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۷ اور اس کے بعد کے صفحات، نیز دیکھئے: دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۷ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور احمد ابو الوفا محمد، القانون الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۳۴ اور اس کے بعد کے صفحات۔

متواتر انداز میں قاصدوں اور سفارتوں کو تحفظ فراہم کرنے اور انہیں خصوصی مراعات دینے پر جن سے ان کے لئے اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی آسان ہوجائے، زور دیتا ہے۔

اگر ایک طرف اسلامی ریاست کے ابتدائی دور میں قاصدوں اور سفارتوں کے تبادلے نے عارضی شکل اختیار کی تو دوسری طرف قرآن کی آیات اور احادیث نبوی ﷺ کے اشارے، اسی طرح عہد نبوی اور عہد خلاف میں اسلامی مملکت کے طرز عمل میں بھی اس طرح کی عارضی نمائندگی کا ثبوت ملتا ہے، یہ سب کچھ اس کے دائرہ کار اور مندرجات میں توسیع کرتے ہوئے اسے اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے درمیان دائمی سفارتوں کے تبادلے میں شامل کر دیتا ہے۔

ذیل میں ہم ان اہم مراعات استثناء کا ذکر کرتے ہیں جن سے اسلام میں سفراء اور نمائندے مستفید ہوتے ہیں، اور اس دلیل شرعی کی حقیقت کا بھی تعین کرتے ہیں جس پر وہ تمام مراعات مبنی ہوتے ہیں۔

۱- دائمی سفارتی وفد مشن کو حاصل مراعات اور استثناء:

اسلامی حکومت کے دور اول میں قاصدوں اور سفارتوں کا تبادلہ عارضی طور پر ہوتا تھا، اور چونکہ اس وقت یہ رواج تھا کہ قاصدوں اور ایلچیوں کا استقبال عام مہمان خانوں اور ان رہائش گاہوں میں ہوتا تھا، جنہیں حکومت ان حضرات کے لئے تیار کراتی تھی، جبکہ اس وقت اس مقصد کے لئے مستقل اور خصوصی عمارتیں نہیں ہوتی تھیں، اس لئے ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض حضرات کی رائے یہ ہوئی کہ دائمی سفارتی مشن کے لئے جو عمارتیں مخصوص کی جائیں گی، انہیں وہ احترام اور تقدس میں نہیں مل سکتا جو مقامات مقدسہ کو حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اگر اس طرح کا احترام اسلامی مملکت کی آزادی اور اس کے اقتدار اعلی کو متاثر کرے گا (۳۵۹)۔

۳۵۹- دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۴۸-۳۴۹، دکتور عبدالغنی عبدالحمید، التمثیل السیاسی فی احکام القانون الدولی العام مقارنا بالشریعۃ الاسلامیۃ، رسالۃ ماجستیر، کلیۃ الشریعۃ والقانون، جامعۃ

حقیقت یہ ہے کہ قرآنی آیات اوراحادیث رسول اللہ ﷺ اور معاصر بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں اسلامی حکومتوں کے طرز عمل نیز عائمی مندوبین کے باہمی تبادلہ سے متعلق طرفین کی رضامندی کے رجحان پرغور کرنے کے نتیجہ میں ایسے بہت سے شواہد اور دلائل سامنے آئے ہیں جو ظاہر کرتے ہیں کہ دائمی سفارتی نمائندوں کی رہائش گاہوں اوران کی ذیلی عمارتوں کو مکمل استثناء اور مراعات حاصل ہونی چاہئیں، جیسا کہ معاصر بین الاقوامی تعلقات میں تسلیم شدہ ہے، اس ضمن میں سفارتی مندوبین کی رہائش گاہ کو خصوصی تحفظ حاصل ہونا چاہئے اور اس میں سربراہ کی اجازت کے بغیر داخلہ ممنوع ہونا چاہئے، اسی طرح اس کے اندر موجود دستاویزات اور ریکارڈ سے چھیڑ چھاڑ پر پابندی ہونی چاہئے، اس کے علاوہ سفارتی مندوبین کو اس بات کی مکمل آزادی حاصل ہونی چاہئے کہ وہ اپنے ملک سے جب چاہیں تب رابطہ کر سکتے ہیں، علاوہ ازیں سرکاری استعمال کے لئے مندوبین کی طرف سے درآمد کردہ اشیاء کو ڈیوٹیوں اور ٹیکسوں سے مستثنیٰ قرار دیا جانا چاہئے۔

پہلی جہت سے اس کی تفصیل یوں ہے کہ اللہ تعالی کے قول: "**يأيها الذين آمنوا لاتدخلوا بيوتا غير بيوتكم حتى تستأنوا وتسلموا على أهلها، ذلكم خيرلكم لعلكم تذكرون، فإن لم تجدوافيها أحدا فلا تدخلوها حتى يؤذن لكم، وان قيل لكم ارجعوا فارجعوا هوأزكى لكم والله بما تعملون عليم**" (اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ گھر والوں کی رضا نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ بھیج لو، یہ طریقہ تمہارے لئے بہتر ہے توقع ہے کہ تم اس کا خیال رکھو گے، پھر اگر وہاں کسی کو نہ پاؤ تو داخل نہ ہو جب تک کہ تم کو اجازت نہ دی جائے، اور اگر

الازہر، ۱۹۸۰ء، ص ۱۸۶-۱۸۷۔ محمد التابعی، الدبلوماسیۃ فی الاسلام، دراسات قومیۃ، عدد (۸)، القاہرۃ، مرکز النیل للاعلام، ۱۹۸۱ء، ص ۱۲۴۔

تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس ہو جاؤ، یہ تمہارے لئے زیادہ پاکیزہ طریقہ ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے خوب جانتا ہے)(۳۶۰)، میں عموم ہے جس کی وجہ سے یہ آیت اسلامی مملکت میں موجود تمام گھروں پر منطبق ہو سکتی ہے، چاہے وہ گھر ذاتی ملکیت میں ہوں، یا اداروں کے ماتحت ہوں، یا چاہے دوسرے ممالک کے لئے الاٹ کئے گئے ہوں، چاہے گھر کا مالک مسلمان ہو یا ذمی ہو، یا پناہ گزیں حربی ہو، ان تمام گھروں میں سے کسی بھی گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت طلبی مشروع قرار دی گئی ہے، تاکہ دوسرے ان معاملات سے واقف نہ ہو سکیں جنہیں لوگ عام طور پر دوسروں سے چھپاتے ہیں، اور اس قدر احتیاط برتتے ہیں کہ کسی کو ان کی خبر نہ ہو، یہ پابندی اس لئے بھی ہونی چاہئے کہ ایسا کرنا گویا دوسرے کی ملکیت میں بیجا تصرف اور مداخلت کرنا ہے، اس لئے اس کی اجازت ضروری ہے، ورنہ یہ عمل غصہ اور زبردستی کرنے کے مشابہ سمجھا جائے گا(۳۶۱)، اس کے مطابق غیر ملکی سفارتی مندوبین کی رہائش گاہیں اور ان کی ذیلی عمارتیں مذکورہ آیت میں موجود عمومی دفعات کے تحت آتی ہیں، اس لئے کہ ان کے اندر جو کاغذات اور راز کی چیزیں موجود رہتیہ یں جن کے حوالے سے سفارتی مندوبین کا ملک کبھی اس کو گوارہ نہیں کرے گا کہ دوسرے اس سے واقف ہوں، وہ اس کے لئے جواز ہیں کہ حرمت وتحفظ کا حکم ان پر منطبق کیا جائے، اس لئے کسی ایسے ملک کے مقامی حکام کو جس کے نزدیک سفارتی مندوبین کا ملک تسلیم شدہ ہے، اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ اس کے سربراہ یا اس کے قائمقام کی اجازت کے بغیر اندر داخل ہوں، ورنہ اسے تقدس کی پامالی اور غصہ اور زبردستی کا عمل سمجھا جائے گا، اگرچہ سفارتی نمائندوں کی عمارت کرایہ ہی کی کیوں نہ ہو۔

۳۶۰- سورۂ نور: ۲۷، ۲۸۔

۳۶۱- ابن العربی، احکام القرآن، مرجع سابق، ج ۳،ص ۱۳۴۶-۱۳۴۹، الزمخشری، الکشاف، مرجع سابق، ج ۳،ص ۲۲۶-۲۲۸، القرطبی، الجامع لاحکام القرآن، مرجع سابق، ج ۱۴،ص ۲۲۳، الشنقیطی، اضواء البیان، مرجع سابق، ج ۶،ص ۱۶۶-۱۸۶، ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ۳،ص ۲۷۸-۲۸۱۔

اگر ایک طرف مؤخرالذکر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ غیر ملکی سفارتی مندوبین کے لئے الاٹ کئے گئے گھر اور اس کی ذیلی عمارتوں کو تحفظ و احترام دیا جائے، تو دوسری طرف احترام اور تحفظ کا یہ معاملہ حدیث نبوی ﷺ سے ثابت شدہ احکام سے مستحکم ہوجاتا ہے، جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے عام گھروں میں داخل ہونے کے سلسلے میں فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص تین دفعہ اجازت طلب کرے، اور اسے اجازت نہ ملے تو اسے لوٹ جانا چاہئے''، اسی طرح خصوصیت کے ساتھ اہل کتاب کے گھروں میں داخل ہونے کے متعلق فرمایا: ''اللہ تعالی نے تمہیں اہل کتاب کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے کی اجازت نہیں دی (۳۶۲)، اس کے علاوہ اللہ کے رسول ﷺ سے ثابت ہے کہ ''مسلمان کے مقابلے میں ایک کافر کو حق شفعہ حاصل ہوگا''، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی پناہ گزیں حربی دار الاسلام میں کسی گھر کا مالک ہوجائے اور اس کے بازو میں واقع گھر بیچا جائے تو اسے شفعہ کی بنا پر لینے کا حق ہوگا (۳۶۳)، اسی طرح آپ ﷺ سے یہ بھی ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے تحفظ اور مراعات ان گھروں کو بھی دی ہے جو چند افراد کی ملک میں ہوں، جیسے کہ فتح مکہ کے وقت ہوا، آپ ﷺ نے فرمایا: ''جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا وہ مامون ہوگا، اور جو اپنے گھر میں داخل ہوا وہ بھی مامون ہوگا، اور جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے گا وہ بھی مامون ہوگا، اور جو مسجد میں داخل ہوگا وہ بھی مامون ہوگا، تو لوگ اپنے گھروں اور مسجد میں منتشر ہوگئے (۳۶۴)، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی گھر ان صحیح بنیادوں پر جو معاملات کو منظّم کرنے والے احکام کے تقاضے اور اسلام کے عمومی نظام کے برخلاف نہ ہوں، زیر ملکیت قائم آجائے یا اسے کرایہ پر لے لیا جائے، تو ایسا گھر اس ضروری

۳۶۲- الشنقیطی، اضواء البیان، مرجع سابق، ج۶/ ۱۶۹، دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص۳۵۱۔

۳۶۳- السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، مرجع سابق، ج۵، ص۱۹۸۵۔

۳۶۴- ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج۴، ص۴۷۔

آزادی سے فیض یاب ہوتا رہے گا، جس کے نتیجہ میں وہ اپنے مالک کا ٹھکانہ اور پناہ گاہ قرار پائے، جہاں وہ ہمیشہ آرام کی سانس لیتا رہے، اور اپنی جان اور مال اور سامان کے حوالے سے مطمئن زندگی گزارتا رہے، مندرجہ بالا باتوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ایک طرف قرآن وسنت میں قانونی شواہد عام افراد کے گھروں کے تحفظ وتقدس کے حوالے سے متواتر ہیں تو دوسری طرف اسلامی دعوت کے مزاج کے تقاضے اور غیر مسلم ممالک کے ساتھ دائمی سفارتوں کے تبادلہ سے متعلق عام مسلمانوں اور اسلامی ریاست کے عمومی مصالح کے پیش نظر اس طرح کے اسلامی ریاست میں موجود غیر ملکی سفارتی نمائندوں کے گھروں پر زیادہ ضروری اور واجب ہوجاتا ہے(۳۶۵)۔

دوسری جہت یہ ہے کہ اسلام جیسا کہ ہم بعد میں بیان کریں گے-ایلچی یا غیر ملکی سفیر کے لئے ضروری تحفظ کو تسلیم کرتا ہے، کیونکہ وہ نمائندہ ہے، اور اس لئے بھی تاکہ وہ مطلوب طریقہ پر اپنی ذمہ داری انجام دینے کے قابل ہوسکے، لہذا عقل ومنطق کا تقاضا ہے کہ وہ گھر جس میں قاصد یا سفیر مستقل طور پر قیام پذیر ہوکر اپنے فرائض انجام دے رہا ہے خصوصی تحفظ اور احترام سے بہرہ ور ہوتا رہے، دوسرے الفاظ میں جب عارضی مشن پر مامور ایلچی یا سفیر کے لئے تحفظ لازم اور ضروری ہے تاکہ وہ اپنا فرض ادا کرنے کے قابل ہوسکے تو منطق اور قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ تحفظ سے متعلق یہ حکم اس گھر پر زیادہ تاکید واہتمام کے ساتھ منطبق کیا جائے جس میں دائمی مشن پر مامور نمائندہ یا سفیر رہائش پذیر ہو، تاکہ وہ اپنے فرائض انجام دے سکے۔ خاص طور پر اس پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اسلامی ریاست میں عارضی طور پر مقیم مندوبین کے استقبال اور قیام کے لئے تیار کئے گئے مکانات کو ریاست کے متعلقہ حکام کی جانب سے اس عارضی مدت

۳۶۵- ابن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری، مرجع سابق، ج ۱۲، ص ۸، الطبری، تاریخ الطبری، مرجع سابق، ج ۳، ص ۵۴، دکتور ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۵۲۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۱۱۳۔

میں بھی غیر معمولی تحفظ حاصل ہوتا تھا(۳۶۶)۔

تیسری جہت سے سفارتی نمائندگی کا تبادلہ چاہے عارضی ہو یا دائمی، معاصر بین الاقوامی تعلقات میں رضامندی اور باہمی تعاون کے اصول پر مبنی ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور کسی غیر اسلامی حکومت کے درمیان دائمی سفارتی نمائندوں کے تبادلے سے متعلق طے پانے والا معاہدہ اسلامی شریعت کے احکام پر اتنا مبنی نہیں ہوتا جتنا کہ وہ دو حکومتوں کے باہمی اتفاق کا نتیجہ ہوتا ہے، اور ایسا کرنا اسلامی حکومت کے لئے اس وقت مباح ہے جب تک کہ یہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے متصادم نہ ہو، اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کی طرف سے منظور شدہ سفارتی نمائندہ کا گھر یا رہائش گاہ کسی بھی غیر اسلامی مملکت میں اسی تحفظ اور احترام کا حق دار ہوگا جو اس ملک کے سفارتی عملے کو اسلامی ریاست میں حاصل ہے۔

مؤخر الذکر ملک کو یہ اختیار حاصل ہوگا کہ ایسی صورت حال میں کہ جب اسے محسوس ہو کہ اس باہمی سفارت کاری کو جاری رکھنے کے نتیجہ میں اسے نقصان اٹھانا پڑ سکتا ہے تو وہ متعلقہ ملک سے اپنے تعلقات منقطع کر لے، اور وہاں اپنی سفارتی موجودگی کو ختم کر دے(۳۶۷)۔

گذشتہ تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ موجودہ بین الاقوامی صورت حال کے تناظر میں اسلامی شریعت کے احکام، قیاس اور اسلامی ریاست کے عمومی مصالح کی روشنی میں دائمی سفارتوں کو ان ممالک میں جہاں وہ تسلیم شدہ ہیں، حاصل مراعات وحقوق میں بڑی وسعت ہے، اس میں سفیروں کی ڈاک کا تحفظ اور ان کے تقدس کی پامالی کا ناجائز ہونا بھی شامل ہے، سوائے ان حالات کے جن میں ایلچی کے ذاتی سامان کی جانچ پڑتال جائز ہوتی ہے، یہ وہ حالات ہیں جو بہت سے عرب اور اسلامی ممالک کے ان تحفظات سے ہم آہنگ ہیں جو انہوں نے ۱۹۶۱ء میں

۳۶۶-۳۶۷-دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص۵۹۷-۵۹۸، دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص۳۵۰۔

سفارتی تعلقات پر منعقد ویانا کنونشن میں سفارتی مشن کے تحفظ کے لئے پیش کئے تھے(۳۶۸)۔

لیکن اگر ایک طرف متأخرالذکر شرعی، منطقی اور عملی دلائل کا حاصل یہ ہے کہ غیر ملکی سفراء کی رہائش گاہوں اور ان کی ذیلی عمارتوں کے ساتھ احترام اور ضروری تحفظ کا برتاؤ کیا جائے، تاکہ وہ تسلیم شدہ ملک میں جو ذمہ داری ان سے متعلق کی گئی ہے اس کی ادائیگی پر قادر ہوسکیں، تو دوسری طرف ان غیر ملکی سفراء کے لئے بھی لازم ہے کہ وہ میزبان ملک میں قائم نظام، اور ضوابط کی پاسداری کریں، اور سفارتی کام کے لئے جو مکان الاٹ کیا گیا ہے اسے کسی بھی ایسی سرگرمی کے لئے استعمال نہ کریں جس سے میزبان ملک کی سلامتی کو خطرہ لاحق ہو یا اس ملک کے شہریوں کا امن وسکون غارت ہوتا ہو، اس لئے اسلامی قانون کی عمومی دفعات اس سے متصادم نہیں جو معاصر بین الاقوامی تعلقات میں سفارتی روایت کی شکل میں رائج ہے کہ انسانی تقاضوں اور وجوہات کی بنا پر غیر ملکی سفراء کے لئے مختص عمارت کا سہارا لینے کی اجازت دی جائے، لیکن غیر ملکی سفراء کے لئے کسی بھی حال میں جائز نہیں کہ اس طرح سہارا لینے کی اجازت کسی ایسے شخص کو دیں جو اسلامی شریعت کے خلاف کسی جرم کا ارتکاب کرے، اسی طرح اسلامی شریعت کے وہ عمومی احکام جو دین میں زور وزبردستی کو ناجائز قرار دیتے ہیں، غیر ملکی سفراء کے لئے اپنے مذہبی رسم و رواج اور شعار کی پابندی میں رکاوٹ نہیں بنتے ہیں، لیکن ضروری ہے کہ مذہبی رسم ورواج پر عمل غیر ملکی سفراء کیلئے مختص عمارت کے اندر ہو یا پھر ان مقامات پر ہو جو اسلامی مملکت کے اندر میں اس

۳۶۸- اس کی مثال وہ تحفظ ہے جسے مملکت سعودی عرب نے ویانا کنونشن برائے سفارتی تعلقات میں شمولیت کے وقت ۱۹۸۱ء میں اختیار کیا، جس میں یہ کہا گیا کہ اگر سعودی عرب میں متعلقہ حکام کو یہ قوی اندیشہ ہوجائے کہ سفارتی بیگ میں وہ اشیاء نہیں ہیں جو سفارتی مشن کے جائز استعمال کے لئے مخصوص ہیں، تو مملکت کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس بیگ کی تلاشی کا مطالبہ کرے، بشرطیکہ تلاشی بیگ رکھنے والے سفارت کار اور سعودی وزارت خارجہ کے نمائندے کی موجودگی میں ہو، اگر متعلقہ سفارت خانہ تلاشی سے انکار کرے، تو بیگ کو اس کے منبع (یعنی جہاں سے آیا ہو) واپس کردیا جائے گا، نیز دیکھئے: دکتور محمد عمر مدنی، العلاقات الدبلوماسیۃ للمملکۃ العربیۃ السعودیۃ، الریاض، معہد الدراسات الدبلوماسیۃ، ۱۹۸۳ء۔

کام کے لئے خاص کئے گئے ہیں، بشرطیکہ یہ ساری سرگرمیاں اسلام کی عمومی تصویر کے خلاف نہ ہوں(۳۶۹)۔

۲-اسلام میں نمائندگان اور سفارت کاروں کو حاصل استثناء:

ایلچی یا غیر ملکی سفیر استثناء کی ان تمام صورتوں سے مستفید ہوگا جو اسلامی شریعت نے اس کے حق میں تسلیم کی ہیں، چاہے معاملہ ایلچی یا سفیر کی جان کی حفاظت سے متعلق ہو، یا اسلامی ریاست میں اس کی طرف سے سرزد ہونے والے جرائم اور خلاف ورزیوں پر اسلامی شریعت کی دفعات کے اطلاق کے موقوف کے تعین کا ہو، اس کے علاوہ مالی نوعیت کے وہ متعدد احکام بھی اس کے ذیل میں آتے ہیں جو اسلامی ریاست میں ایلچی کی رقم اور سامان کو محفوظ رکھنے کے حوالے سے وضع کئے گئے ہیں۔

الف-سفیر کو حاصل شخصی تحفظ-کا شمار اہل عرف میں ہوتا ہے جسے اسلامی شریعت نے جائز ٹھہرایا ہے، اس میں یہ شامل ہے کہ سفیر کی جان کو ہر طرح کی تکلیف دہ چیز سے محفوظ رکھا جائے، اسے ہر اس زیادتی سے بچایا جائے جس کا اسے خطرہ لاحق ہو، اس کی عزت کی حفاظت کی جائے، اس میں یہ بھی شامل ہے کہ بلا وجہ نہ اس کی اور نہ اس کے ذاتی سامان کی تلاشی لی جائے، الا یہ کہ ایسے حالات پیش آ جائیں جو اس کا تقاضا کریں، مثلاً اس حوالے سے قوی شکوک پیدا ہو جائیں کہ اس کے سامان میں ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا داخلہ اسلامی شریعت کے نقطہ نظر سے اسلامی مملکت میں ممنوع ہے- غیر ملکی نمائندہ یا سفیر کو ان احوال میں بھی تحفظ حاصل ہوتا ہے جب یہ ثابت ہو جائے کہ اس کی طرف سے اس کے منصب کے تقاضوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے، مثلاً اس کی طرف سے اسلامی ریاست یا اس کے عوام کی توہین کی گئی ہو، یا وہ کوئی ایسا کام کرے جو ملک کے عمومی نظام کے خلاف ہو، یا جاسوسی کرتا ہوا اور ناجائز طور پر اپنے ملک کے

۳۶۹- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۹۸۔

مفاد میں خفیہ معلومات حاصل کرتا ہوا پکڑا جائے، ان تمام صورتوں میں سفیر یا ایلچی کی جان محفوظ رہے گی، اسے جسمانی طور پر کسی طرح کی سزا دینا جائز نہیں ہوگا نہ اس کے خلاف کوئی ایسی کاروائی کی جائے جس سے اس کی نقل وحرکت پر پابندی لگے یا اس کی آزادی سلب کرنا ہو، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے باز پرس نہ کی جائے اور اسے اس کے ملک کے قانون کی مطابق سزا نہ دی جائے، اور نہ اس تحفظ کے نتیجہ میں اسلامی مملکت کا یہ حق ختم ہوتا ہے کہ وہ اسے اب اپنے ملک کے لئے ایک نامناسب شخص قرار دے اور اسے مملکت سے باہر نکالے، دوسرے الفاظ میں ایلچی یا قاصد کی جان پوری طرح محفوظ رہے گی، اس سے کسی طرح بھی تعرض نہیں کیا جائے گا، چاہے معاملہ جیسا بھی ہو یا جس انداز سے بھی وہ اسلامی مملکت کے حدود میں داخل ہوا ہو، قاصد یا ایلچی نے دارالاسلام میں چاہے جیسا بھی جرم کیا ہو اس کو ذاتی طور پر جو تحفظ دئے جانے کی سب سے واضح دلیل اللہ کے رسول ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ ﷺ نے مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصدوں سے اس وقت فرمایا تھا جب ان دونوں نے مسیلمہ کے اس دعوی کو سچ قرار دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی نبوت میں شریک ہے'' کہ اگر سفراء کا قتل ناجائز نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا'' (۳۷۰)، اسی طرح آپ ﷺ کا یہ قول بھی ایک بڑی دلیل ہے کہ'' اے اللہ مجھے عام بن طفیل سے بچا'' یہ آپ ﷺ نے اس وقت فرمایا جب وہ آپ ﷺ کے پاس اپنی قوم کا سفیر بن کر آیا تھا اور اس نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ یا تو آپ ہموار علاقے لے لیں اور اسے یعنی عامر کو خشک علاقے دے دیں یا پھر قبیلہ غطفان کی طرف سے حملے اور جنگ کا نشانہ بننے کے لئے تیار ہو جائیں (۳۷۱)، لہذا ایک قاصد یا سفیر دارالاسلام میں بغیر امان لئے داخل ہو سکتا ہے،

۳۷۰-۳۷۱- ناصر الالبانی، صحیح الجامع الصغیر وزیادتہ، مرجع سابق، ج ۲، ص ۷۵، نیز دیکھئے: دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۷۵، دکتور محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ مرجع سابق، ص ۲۵۶، دکتور احمد ابو الوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلام مرجع سابق، ص ۳۸۴-۳۸۶، دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۸۰-۸۲۔

کیونکہ یہ ان مراعات میں شامل ایک لازمی حق ہے جو اسے ذمہ داری کی انجام دہی کے دوران حاصل رہتی ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے فرائض کو ملحوظ رکھے، اور ناجائز کاموں سے بچے جیسے کہ جاسوسی اور دارالحرب لے جانے کی غرض سے ہتھیار کی خریداری (۳۷۲)۔

اگر حکام کے سامنے کوئی قاصد آئے تو وہ اس سے اس کا نام دریافت کریں گے، اگر وہ کہے کہ میں بادشاہ کا نمائندہ ہوں، انہوں نے مجھے مسلمانوں کے بادشاہ کے پاس بھیجا ہے اور یہ ان کا خط ہے میرے ساتھ یعنی موجودہ دور میں شناخت کے لئے جو کچھ معروف ہے وہ پیش کرتا ہے تو اسے درست سمجھا جائے گا، اور اس سے کسی طرح تعرض نہیں کیا جائے گا، اگر مسلمان نے سمندر میں کوئی کشتی پکڑ لیں اور اس میں سوار کچھ لوگ یہ کہنے لگیں کہ ہم لوگ تو قاصد ہیں، ہمارے بادشاہ نے ہمیں بھیجا ہے (یعنی وہ چیز پیش کر دیں جس سے ان کی حیثیت واضح ہو جائے) تو ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی جائے گی (۳۷۳)، اسی طرح جب کوئی حربی دارالاسلا میں پایا جائے اور کہے کہ میں قاصد ہوں، اگر وہ خط نکالے اور خط سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ اس کے بادشاہ کا خط ہے (یعنی وہ ثبوت فراہم کرے جس سے اس کی شناخت معلوم ہو جائے) تو وہ اس وقت تک امن وسلامتی کے ساتھ اقامت پذیر رہے گا جب تک کہ وہ اپنا پیغام پہنچا کر لوٹ نہ جائے، اس لئے کہ قاصدوں کو ہمیشہ تحفظ ملتا رہا ہے، چاہے اسلام کا زمانہ رہا ہو یا جاہلیت کا (۳۷۴)، اسی طرح جب کوئی حربی دارالاسلام میں بغیر امان حاصل کئے داخل ہو جائے تو اسے قتل کرنا اور غلام بنانا جائز ہوگا، اس پر احسان کرتے ہوئے اسے رہا کر دینا یا اس سے فدیہ لینا درست ہوگا، مگر جب وہ دعوی کرے کہ وہ کوئی پیغام لے کر آیا ہے تو اس میں سے اس وقت تک کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا،

۳۷۲- ۳۷۳- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸-۱۸۹، ۲۲۳، السرخسی شرح السیر الکبیر، مرجع سابق، ج ۴، ص ۶۶-۶۷، دکتور مجید خدوری، مرجع سابق، ص ۳۲۴۔

۳۷۴- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸، السرخسی، المبسوط، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۹۲-۹۳۔

جب تک کہ اس کے معاملہ کی تحقیق نہ کر لی جائے گی (۳۷۵)، ان کے علاوہ بھی دلائل اور عملی مثالیں ہیں جو اسلام میں غیر ملکی ایلچی یا سفیر کو ذاتی تحفظ اور مراعات دیئے جانے پر زور دیتے ہیں۔

ب-نمائندہ یا سفارت کار کو فوج داری قوانین سے حاصل استثناء:

جیسا کہ معلوم ہے کہ ایلچی یا سفیر کے لئے عدالتی تحفظ کے موضوع پر بحث و تحقیق کا مقصد یہ طے کرنا ہے کہ اسے اس صورت میں اسلامی شریعت کے احکام سے کیسے معاف رکھا جائے جب وہ اسلامی احکام کے تقاضوں کے خلاف کوئی کام کر لے اس میں تمام صورتیں برابر ہیں، چاہے اس کا یہ عمل شریعت کے فوج داری قوانین کے دائرہ سے متعلق ہو، یا شہری یا انتظامی نوعیت کا ہو، اور چاہے خلاف ورزی کرنے والے ایلچی یا سفیر کا یہ عمل سرکاری کام کے دائرہ کار میں انجام دیا گیا ہو، یا اس نے اسے اپنے سرکاری دائرہ سے باہر ذاتی حیثیت میں انجام دیا ہو۔

اگر ایک طرف معاصر سفارتی تعلقات میں یہ اصول طے شدہ ہے، اور جس پر اسلامی ممالک آپس میں بھی اور غیر اسلامی ممالک کے ساتھ روابط میں بھی عمل کرتے ہیں یعنی یہ کہ سفارتی نمائندہ کو فوج داری قانون کے حوالے سے مکمل عدالتی تحفظ حاصل رہے گا، اسی طرح سول اور انتظامی قانون کے حوالے سے بھی اسے تحفظ ملتا رہے گا، سوائے ان حالات کے جن میں معاملہ کسی ایسے ترکہ سے متعلق ہو جس میں اس نمائندہ کی حیثیت ایگزیکیوٹر کی ہو، یا منیجر کی ہو، یا موصی الیہ کی (یعنی جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو) یا وہ ذاتی حیثیت میں وارث ہو، یا معاملہ تسلیم شدہ ملک میں نمائندہ کی کسی خاص جائیداد سے متعلق ہو یا معاملہ کسی آزادانہ پیشے سے یا کسی

۳۷۵- ابن جماعۃ، تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام، مرجع سابق، ص ۲۳۷، نیز دیکھئے: الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۳، ص ۲۰۱، سابقہ مراجع، ص ۹۷-۹۸۔

تجارتی سرگرمی سے متعلق ہو، جسے نمائندہ نے تسلیم شدہ ملک میں اپنے سرکاری دائرہ کار سے باہر انجام دیا ہو(۳۷۶)، جب معاملہ ایسا ہے تو دوسری طرف اسلام میں غیر ملکی سفیر یا ایلچی کو دیئے گئے فوجداری تحفظ کے سلسلے میں مفسرین اور فقہاء کی آراء کی روشنی میں درج ذیل رجحانات کے درمیان فرق کیا جاسکتا ہے(۳۷۷)۔

پہلا رجحان: اس کا مفہوم یہ ہے کہ اسلام اس ایلچی یا غیر ملکی سفیر کے لئے جسے اسلامی مملکت نے تسلیم کیا ہو، مملکت کی اندرونی عدالت کے مقابلہ میں کسی طرح کا تحفظ فراہم نہیں کرتا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ کوئی جرم کرتا ہے تو اس کی حیثیت دارالاسلام میں موجود عام افراد کی طرح ہوگی، وہ مقدمہ کی زد میں آئے گا اور شریعت کی طرف سے متعین کردہ سزا یا حالات اور جرم کو دیکھتے ہوئے عدالت جو سزا طے کرے گی، اس کا وہ مستحق ہوگا(۳۷۸)، اس رجحان کے حامی حضرات کئی ایک دلیل پیش کرتے ہیں جس سے وہ اپنے نقطہ نظر یعنی سفیر یا غیر ملکی ایلچی کو اسلامی شریعت کے احکام کے خلاف کسی طرح کا عدالتی تحفظ نہیں دیا جائے گا، پر استدلال کرتے ہیں۔

جیسے کہ ایلچی یا غیر ملکی سفیر حقیقت میں پناہ گزیں ہے یا وہ اسلامی مملکت کا ہمسایہ ہے پھر تو اس کی حیثیت عام پناہ گزینوں کی ہوگی، اور وہ لازماً اسلامی شریعت کے احکام کا احترام

۳۷۶- راجع احکام اتفاقیۃ فیینا للعلاقات الدبلوماسیۃ لعام ۱۹۶۱ء، بشأن حصانات الممثل الدبلوماسی۔

۳۷۷- دیکھئے: عرضا شاملا ومفصلا الاتجاہات الفقہ القہ الاسلامی بشأن الحصانۃ الجنائیۃ للسفیر أو المبعوث الاجنبی فی دارالاسلام فی: دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۸۶-۴۰۴، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۱۵-۶۲۱، دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۹۲-۹۶۔

۳۷۸- دیکھئے: محمد ابوزہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، القاہرۃ، دارالنہضۃ العربیۃ، ۱۹۷۶ء، ص ۳۴۴ اور اس کے بعد کے صفحات، محمد ابوزہرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۷۲ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۹۰-۳۹۲۔

کرنے کا مکلّف ہوگا (۳۷۹)، اس کے علاوہ اسلامی ریاست کی سرزمین پر کسی غیر ملکی ایلچی یا سفیر کی محض موجودگی ہی اس کے شریعت کے احکام کے تابع ہونے کا جواز فراہم کرتی ہے، چاہے وہ جس مقصد کے لئے بھی یہاں آیا ہو، یہ فساد کو ختم کر دیتی ہے، فتنہ کو روکتی ہے، مسلم معاشرہ کی ہم آہنگی کو برقرار رکھتی ہے، اور اس کے وجود کو تحفظ عطا کرتی ہے، دوسرے الفاظ میں غیر ملکی ایلچی کا اسلامی مملکت کی مقامی عدالتی کارروائی کا تابع ہونا، ایک طرف تو یہ دار الاسلام میں جاری تمام لوگوں کے درمیان مساوات کے اصول کے مطابق ہے اور دوسری طرف یہ ان افراد کے حقوق کے تحفظ کی بنیادی ضمانت ہے جن کے خلاف جرم کیا گیا تھا، علاوہ ازیں ایلچی یا غیر ملکی سفیر جس وقت جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ اس رائے کے مطابق یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اسے کسی طرح کا تحفظ نہ دیا جائے، اور جو ذمہ داری اسے سپرد کی گئی ہے اس کی ادائیگی کی صلاحیت اس میں مفقود ہے، اس مسئلہ کی نزاکت کو سمجھنے کے لئے اتنا عرض کر دینا کافی ہے کہ جب نمائندہ کو شرعی احکام کی تابعداری سے بری قرار دیا جائے گا، تو آئندہ ایسا ہوسکتا ہے کہ وہ اس تحفظ اور اس طرح کی مراعات سے ناجائز فائدہ اٹھائے، اور اسے مسلمانوں پر اپنی برتری ثابت کرنے کا ذریعہ سمجھے، خصوصاً ان حالات میں جب مسلمان کمزور ہوں (۳۸۰)، مذکورہ رجحان آگے یہ بھی کہتا ہے کہ غیر ملکی نمائندہ کے اسلامی ریاست کی عدلیہ کے تابع ہونے کی رائے اختیار کرنے کے نتیجہ سے متعلق بعض لوگوں کے جو اندیشے ہیں وہ ان خدائی احکامات کے پیش نظر بے بنیاد ہیں جو عدل کے ساتھ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے بارے میں وارد ہوئے ہیں، چاہے ان کے درمیان جس قدر اختلافات ہوں اور اگرچہ مذہب کے سلسلے میں ہی میں کیوں نہ ہو، اللہ تعالی کے اس قول پر عمل کرتے ہوئے: ''**واذاحکمتم بین الناس أن تحکموا بالعدل**''، اور اللہ تعالی کا یہ

۳۷۹-۳۸۰-محمد ابوزہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۴۵-۳۴۶، دکتور عبد القادر عودۃ، التشریع الجنائی الاسلامی، بیروت، دار الکتاب العربی، ۱۹۶۰ء، ج ۱، ص ۲۸۵۔ دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام مرجع سابق، ص ۹۲-۹۳۔

قول بھی اس بارے میں رہنمائی کررہا ہے، "**ولا یجرمنکم شنآن قوم علی ألا تعدلوا اعدلوا هو أقرب للتقوی**"، جس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر غیر ملکی ایلچی کو اسلام کے عدالتی فیصلے سے بری سمجھا جائے، بالخصوص ان فیصلوں سے جو حدود وقصاص کے جرائم سے متعلق ہیں، تو اس سے ان آیات قرآنی (۳۸۱) میں وارد عمومی احکام متاثر ہوں گے جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیتی ہیں، اگر یہ شبہ ہو کہ اسلامی مملکت اور دیگر ممالک کے درمیان ان کی سابقہ آراء کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی دراڑ پیدا ہو جائے گی، تو مذکورہ رجحان کے پیروکاروں کا خیال ہے کہ بین الاقوامی عرف اس حقیقت پر مبنی ہے کہ اس قسم کی صریح خلاف ورزی کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے، جس کی سزا قرآنی نصوص میں مذکور ہے، نیز یہ کہ اگر بعض سیاسی ایلچیوں کے متعلق ان کے ممالک کو اس نوع کے یا اس سے کم تر کسی گناہ کی طرف میلان کا احساس ہوگا تو وہ ملک جہاں وہ سیاسی ایلچی بھیجا گیا ہے متعلقہ ملک کو اسے واپس بلانے کی سفارش کرے گا قبل اس کے کہ اس طرح کا کوئی سنگین مسئلہ پیش آئے۔

اس طرح یہ کام اسلامی فکر سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے (۳۸۲)، ان سب کے علاوہ مذکورہ رجحان کے نقطہ نظر سے اس بات کی کوئی ممانعت نہیں ہے کہ مسلم حکمراں غیر ملکی سفیر کی ریاست سے اس بات پر اتفاق کرلے کہ اسے اسلامی عدلیہ کی ماتحتی سے مستثنی قرار دیا جائے گا، ان تعزیراتی جرائم کے سلسلے میں جن کی سزا قرآن یا سنت کے کسی متن سے ثابت نہیں ہے، یہ اس لئے کیونکہ ان جرائم کا اثبات اور ان کی سزا کا تعین سربراہ مملکت کے اختیارات کے دائرہ میں آتا ہے (۳۸۳)۔

۳۸۱- دکتور عبد القادر عودۃ، مرجع سابق، ص۲۸۶-۲۸۷، سعید حوی، الاسلام، القاہرۃ، مکتبۃ وہبۃ، ۱۹۷۷ء، ص۵۷۶-۵۷۷۔

۳۸۲-۳۸۳- محمد ابوزہرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص۷۲، محمد ابوزہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص۳۳۸-۳۳۹، نیز دیکھئے: دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص۴۰۶۔

دوسرے رجحان کا مطلب یہ ہے کہ سفیر یا قاصد کو جو مراعات اور تحفظ حاصل ہوں گے وہ اس جرم کی نوعیت کے تابع ہوں گے، جو اس سے اسلامی مملکت میں سرزد ہوں، اس اصول کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ غیر ملکی سفیر جب کوئی ایسا جرم کرے جس کا تعلق حقوق اللہ سے ہو جیسے کہ شراب پی لے تو اسے اس جرم پر سزا نہیں دی جائے گی، اور اسے اس سلسلے میں اسلامی عدالت کے فیصلے کے خلاف مکمل تحفظ حاصل رہے گا، لیکن اگر معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو مثال کے طور پر وہ کوئی ایسا جرم کرے جس کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو جیسے کسی کو ناحق قتل کردے، یا کسی پر الزام لگادے وغیرہ تو ایسی صورتحال میں اسے کسی طرح کا تحفظ نہیں ملے گا، الا یہ کہ صاحب حق اسے معاف کردے (۳۸۴)، اس رجحان کے حامی غیر ملکی سفیر کو دیئے جانے والے تحفظ کے سلسلے میں اس سے سرزد ہونے والے جرائم کی نوعیت پر انحصار کرنے کی ضرورت کے بارے میں یہ دلیل دیتے ہوئے اپنی رائے کا جواز پیش کرتے ہیں کہ غیر ملکی نمائندہ چونکہ پناہ گزیں ہے، اس لئے وہ اللہ تعالی کے حقوق سے متعلق امن وسلامتی کے حدود پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہیں، اس لئے وہ ان حقوق سے متعلق کسی طرح کا بھی جرم کرے اس میں اسے تحفظ ملتا رہے گا، مگر یہ کہ وہ ہمیشہ اس مقصد کا لحاظ کرنے کا پابند رہے گا، جس کی غرض سے اس کا دارالاسلام آنا ہوا، یعنی بندوں کے تمام تر حقوق، اس لئے ان حقوق سے متعلق جو بھی اسلامی عدالت کاروائی کرے گی اسے تسلیم کرنا ہر حال میں اس پر لازم ہوگا، تاکہ صاحب حق کو حق ملنے کی گارنٹی باقی رہے، جب تک کہ اس کی طرف سے یعنی صاحب حق کی طرف سے اسے معافی نہ مل جائے ان حالات میں جن میں اسے معاف کرنے کی اجازت ہو (۳۸۵)۔

البتہ سابق رائے کے قائل حضرات کے درمیان آپس میں اختلاف ہے، خواہ خدا کے

۳۸۴-۳۸۵-الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۷، ص ۳۲۵ اور اس کے بعد کے صفحات، الشیرازی، المہذب، مرجع سابق، ۱۳۴۳ھ، ج ۲، ص ۲۷۹، دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام مرجع سابق، ص ۹۴۔

حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق سے متعلق جرائم کی نوعیت کے تعین کے سلسلے میں، یا اس حقوق اللہ سے متعلق جرائم کے سلسلے میں ایلچی کو حاصل تحفظ، کے نتیجے میں مرتب ہونے والے اثرات کے تعین کے سلسلے میں، مثلاً ان حضرات کا اختلاف ہے ان جرائم کے سلسلے میں جو متعین ہوتے ہیں جیسے کہ چوری، زنا وغیرہ یہ جرائم اللہ کے حقوق سے متعلق جرائم کے ایک زمرہ میں آتے ہیں، یا پھر وہ بندوں کے حقوق سے متعلق جرائم میں شمار ہوتے ہیں، اسی طرح اگر جرائم اس نوعیت کے ہوں کہ وہ حقوق کی دونوں قسموں سے متعلق ہو سکتے ہوں، تو پھر اختلاف اس سلسلے میں ہے کہ کس قسم کا عنصر غالب رہے گا ان حقوق کی تشکیل میں (۳۸۶)، علاوہ ازیں مذکورہ رجحان کے حامیوں میں سے بعض حضرات نے ''حقوق اللہ سے متعلق جرائم کے سلسلے میں غیر ملکی ایلچی کو حاصل تحفظ حاصل'' پر مرتب ہونے والے اثرات کی تعیین پر سکوت اختیار کیا ہے، جبکہ بعض دوسرے حضرات کا اس مسئلہ میں کہنا ہے کہ اسلامی حکومت غیر ملکی سفیر یا ایلچی کو اس چیز کا پابند کرے کہ وہ حقوق اللہ کے مخالف سرگرمیوں سے باز رہے، ورنہ آئندہ اسے نکال باہر کرے گی اور اسے اس کی محفوظ جگہ پہنچا دے گی۔

اس قول کے مطابق اگر دار الحرب کے لوگ دار الاسلام میں امان حاصل کر کے داخل ہوں، اور وہ حدود کو پامال کریں، تو اس کے دو پہلو ہیں: ان میں سے جس میں اللہ کا اختیار ہے اس میں انسان کا کوئی حق نہیں، یعنی انسان کا حق معطل سمجھا جائے گا، لیکن ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اس پر امان کیوں نہیں کیا؟ اب اگر تم باز رہو تو ٹھیک ورنہ ہم تمہارا امن لوٹا دیں گے، اور تم کو تمہارے ٹھکانے تک پہنچا دیں گے، اگر وہ پھر وہی کریں تو انہیں ان کے ٹھکانے تک

۳۸۶- مثال کے طور پر بعض اہل علم کا خیال ہے کہ چوری اور زنا ان جرائم میں سے ہیں جو اللہ کے حقوق سے متعلق ہیں، لہذا اگر کوئی غیر مسلم (مستامن یا معاہد) اسلامی سرزمین میں چوری یا زنا کا ارتکاب کرے تو اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی، جبکہ دوسرا گروہ یہ رائے رکھتا ہے کہ یہ جرائم بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں، اس لئے ایسے شخص پر حد قائم کرنا واجب ہے، نیز دیکھئے: الشیرازی المہذب، مرجع سابق، ج ۸، ص ۲۳۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔

پہنچادیا جائے گا، اور ان سے دارالاسلام کی طرف سے کی گیا امن و سلامتی کا معاہدہ ختم کردیا جائے گا(۳۸۷)۔

مذکورہ رجحان پر بہت سے مسلمان فقہاء نے شدید تنقید کی ہے، چنانچہ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ دارالاسلام میں غیر ملکی قاصد یا ایلچی کو دئے جانے والے تحفظ کا یہ رجحان ایسا ہے جس سے اسلامی مملکت اور عامۃ المسلمین کو بہت زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے، اور یہ غیر ملکی گروہ جسے اس قدر مراعات دی جارہی ہیں، ممکن ہے کہ وہ ان کا غلط فائدہ اٹھائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری اسلامی مملکت میں انتشار اور انارکی عام ہوجائے گی، بالخصوص اس زمانے میں جب مملکت غیر اسلامی ممالک کے مقابلہ میں کمزور ہو(۳۸۸)۔

تیسرا رجحان جو غیر ملکی ایلچی کے لئے عدالتی تحفظ سے متعلق ہے اس کے حامی اس بات کے قائل ہیں کہ سفیر یا قاصد کو اس نقل وحرکت سے متعلق حاصل تحفظ پر غور کرنے میں اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ اس سے سرزد ہونے والے اعمال اس کی سرکاری ذمہ داری یا اس مقصد سے متعلق ہیں جس کے لئے اسے مقرر کیا گیا ہے یا اس سے ہٹ کر ہیں، پہلی حالت میں غیر ملکی سفیر کو پورا تحفظ دیا جائے گا، اور دوسری حالت میں اسے اسلامی مملکت کی اندرونی عدالت کے تابع سمجھا جائے گا، اور جو جرم اس سے سرزد ہوا ہے، اس کے متعلق اس سے باز پرس کی جائے گی، اور اسے سزا دی جائے گی(۳۸۹)۔

تاہم اس رجحان کے حامی ان اثرات کے تعین میں وسعت اختیار کرتے ہیں، جو کسی

۳۸۷- الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۷، ص ۳۲۵، اور دیکھئے: دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۸۸۔

۳۸۸- محمد ابوزہرہ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۴۴، محمد ابوزہرہ، العلاقات الدولیۃ فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۷۳، دکتور عبدالقادر عودۃ، التشریع الجنائی فی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۲۸۰ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۳۸۹- دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۹۲-۳۹۳۔

غیر ملکی سفیر کی طرف سے ایسے جرائم کے ارتکاب کے نتیجے میں پیدا ہوتے ہیں، جن کا تعلق اس کے سرکاری کام کے فرائض یا اس کی ملازمت کے تقاضوں سے نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا یہ ماننا ہے کہ اسلامی حکومت کے اختیار میں ہے کہ وہ ایلچی پر متعین سزا کا نفاذ کرے، اور اسے یہ بھی اختیار ہے کہ معاف کردے، لیکن یہ لوگ اس بات پر خاموش ہیں کہ آیا یہ معافی کس حد تک ہے؟ کیا ایلچی کلی طور پر تمام قانونی پہلوؤں سے بری ہے، یا یہ معافی صرف حکومتی دائرہ اختیار کی حد تک ہے، اور سفیر کی اپنی حکومت کا جو داخلی قانون ہے اس کا نفاذ اس پر ہوگا اس سے معافی نہیں ہوسکتی، چنانچہ اس ملک کی داخلی عدالتوں میں اس پر مقدمہ کیا جائے گا، اور اس جرم کی جو طے شدہ سزا ہوگی وہ اس پر نافذ کی جائے گی، اس کی مزید وضاحت بعض حضرات کی اس رائے سے ہوتی ہے کہ تمام مشرکین کے بارے میں آیت کریمہ "**فإذا انسلخ الأشهر الحرم، فاقتلوا المشركين كافة**" میں جو حکم دیا گیا ہے وہ قتل کا ہے، لیکن اس سے قاصدوں کو مستثنیٰ رکھا گیا ہے، اگرچہ ان کے ساتھ ایسا خط ہو جس میں مسلمانوں کو ڈرایا اور دھمکایا گیا ہو، پھر بھی ان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا، جب تک وہ اسے صرف آپس میں ایک دوسرے تک پہنچانے تک محدود رہیں، مگر جب ان سے ایسی حرکت سرزد ہو جو تجسس اور خیانت کے قبیل کی ہو، یا اس سے مسلمانوں کی مذمت ہو رہی ہو تو پھر ان کو قتل کرنا جائز ہوگا (۳۹۰)۔

جو مسئلہ چوتھے رجحان سے متعلق ہے، اس کے حامی حضرات کی اکثریت محدثین کی ہے، ان کا یہ کہنا ہے کہ غیر ملکی ایلچی اسلامی مملکت میں مکمل عدالتی تحفظات سے سرفراز کیا جائے گا، چاہے اس نے جس طرح کے جرائم کا ارتکاب کیا ہو، وہ اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں جو آپ ﷺ نے مسیلمہ کے دونوں قاصدوں سے فرمایا تھا: "اگر قاصدوں کو قتل کرنا جائز نہ ہوتا تو میں تم دونوں کی گردنیں مار دیتا"، جبکہ ان دونوں نے اللہ کے رسول کے

۳۹۰- الشرقاسی علی التحریر، القاہرۃ، البابی الحلبی ج ۲ ص ۴۰۷ (نقلا عن دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۹۲)۔

سامنے سنگین جرم کیا تھا، یعنی ان دونوں نے مسیلمہ کذاب کے اس خط کی تائید کی تھی اور اسے آپ ﷺ تک پہنچانے کا کام کیا تھا جس میں مسیلمہ کا یہ مطالبہ درج تھا کہ اسے نبوت اور نصف زمین کا مالک ہونے میں شریک قرار دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کے فیصلہ کے مطابق اس جرم کی سزا موت تھی مگر اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان دونوں پر سزا نافذ نہیں فرمائی (۳۹۱)، اس تحفظ کا احترام کرتے ہوئے جس سے سفراء حضرات فیضیاب ہوا کرتے ہیں، متذکرہ بالا رجحان کے حامی حضرات غیر ملکی سفیر کے مجرمانہ استثناء کو باہمی تعاون کے اصول پر قائم رکھتے ہیں کہ اس رجحان کی منطق کو اپنانے کا مطلب جو تحفظ کے اصول کی مخالفت کرے یہ ہے کہ اس کے مدمقابل مسلمان سفیر یا قاصد کو غیر اسلامی ریاست میں عدالتی تحفظ سے محروم کر دیا جائے، لہذا یہ نمائندگی کے فریضہ منصبی کے اس تقاضا سے متصادم ہے جسے سفیر یا ایلچی تسلیم شدہ ملک میں انجام دیتے ہیں، علاوہ ازیں اس سے تو پوری دنیا میں قائم ممالک کے درمیان امن اور مصالحت پر مبنی تعلقات کے قیام کے ایک بنیادی ذریعہ کا خاتمہ ہو جائے گا (۳۹۲)۔

گذشتہ تفصیلات میں یہ اضافہ کیا جا سکتا ہے کہ غیر ملکی ایلچی کو جرائم سے متعلق اسلامی عدالت کی کاروائی کی تابعداری سے بری قرار دینا، مذکورہ رجحان کے نقطہ نظر سے قرآنی آیات میں وارد ہونے والے احکام کے تقاضے سے جو دار الاسلام میں پیش آنے والے ہر معاملہ میں اسلامی شریعت کے نفاذ کو ضروری قرار دیتے ہیں، متصادم نہیں، ان آیات میں ایسے بھی احکام ہیں جو ذمی اور حربی حضرات سے متعلق ہیں، یہ آیتیں اس قانون کی صراحت کرتی ہیں جسے مسلم قاضی نافذ کرے گا، چنانچہ خاص بین الاقوامی قانون سے متعلق ایک قاعدہ کی تشکیل عمل میں آتی ہے، اور قاضی کے سامنے جب مسئلہ پیش کیا جائے گا تو وہ مذکورہ آیات کے حکم کا پابند ہوگا، لیکن ان

۳۹۱-۳۹۲- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۱۵-۶۱۶، دکتور احمد ابوالوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۴۰۵، اور اس کے بعد کے صفحات، ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۲۲۴-۲۲۵، السرخسی، شرح السیر الکبیر، مرجع سابق ج ۱، ص ۲۰۶۔

آیات میں ایسا کوئی حکم نہیں ملتا جو صرف مسلم قاضی کے دائرہ اختیار میں ہو، کیونکہ ان کے بنیادی ڈھانچہ میں ایسا کچھ نہیں ہے جو صرف مسلم قاضی کو دار الاسلام میں پیش آنے والے مسائل میں غور وفکر کا پابند بنائے (۳۹۳)، مذکورہ رجحان کے حامی حضرات ان وسائل کی تعیین میں کشادہ قلب نظر آتے ہیں جن کے توسط سے اسلامی مملکت میں عدالتی تحفظ سے فیضیاب ہونے والا غیر ملکی ایلچی جب کوئی جرم کر بیٹھے تو اس کا سامنا کرنا ممکن ہو سکے، ان کا ماننا ہے کہ اسلامی ریاست کی مقامی عدلیہ کے خلاف غیر ملکی سفیر کے مجرمانہ استثناء سے مستفید ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ سفیر کو اس کے جرم کے نتیجے میں ہونے والے تمام مادی یا اخلاقی نقصان کو دور کرنے کی شہری ذمہ داری سے مستثنی قرار دیا جائے، اس کے علاوہ اسلامی اسٹیٹ سفیر کی مملکت سے مطالبہ کر سکتی ہے کہ اسلامی مملکت کی عدالتوں میں اس کے خلاف مقدمہ کی تیاری کی خاطر اسے جو تحفظ فراہم ہے اسے ختم کر دے، اور یہ بھی اختیار ہے کہ اس کی طرف سے سرزد ہونے والے جرائم کی ایک مکمل فائل تیار کرے تا کہ اس کے خلاف اس کے اپنے ملک کی عدالت میں مقدمہ کر سکے، اسلامی مملکت کو اختیار ہے کہ اس سلسلے میں ایسی شرط لگائے جس میں مقدمہ کی سنجیدگی کی گارنٹی لی گئی ہو، جیسے مقدمہ کی کاروائی کے دوران اپنے کسی ایک مندوب کے موجود رہنے کا مطالبہ کرے، اسی طرح اسلامی مملکت کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ وہ تسلیم شدہ غیر ملکی ایلچی کو ایک ناپسندیدہ شخص قرار

۳۹۳- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۱۸، وہ آیتیں جو ان احکام کی جانب اس سلسلے میں اشارہ کرتی ہیں، وہ درج ذیل ہیں: "ومن لم یحکم بما انزل الله فأولئک هم الکافرون" (جو اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ کافر ہے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: "ومن لم یحکم بما انزل الله فأولئک هم الظالمون" (جو اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ ظالم ہے)، اور اللہ تعالی فرماتے ہیں: "ومن لم یحکم بما انزل الله فأولئک هم الفساقون" (جو اللہ کے نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کرے وہ فاسق ہے)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: "وان احکم بما انزل الله ولا تبع اهواء هم واحذرم ان یفتنوک عن بعض ما انزل الله الیک" (جو آپ کی طرف اتارا گیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کیجئے اور ان کی خواہش کی پیروت مت کیجئے اور اس بات سے چوکنا رہئے کہ کہیں وہ لوگ آپ کو آپ کی جانب نازل کردہ حکم سے موڑ دیں) (سورۂ مائدہ: ۴۴، ۴۵، ۴۷)، راجع فی ذلک ایضا الشنقیطی، اضواء البیان، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۰۱-۱۰۴۔

دے کر اپنی مملکت کے حدود سے باہر کر دے، اسی طرح اس کے اختیار میں یہ بھی ہے کہ احتیاط اور استثناء کے راستہ پر چلتے ہوئے سفیر کو عارضی طور پر یا تو قید کر لے یا اسے روکے رکھے، یا پھر اسے کنٹرول میں رکھے اور اس پر مقدمہ کئے بغیر یا سزا نافذ کئے بغیر جانچ پڑتال کرے، اور یہ اس صورت میں ہے کہ داخلی سلامتی اور استحکام کے لئے اس کی ضرورت ہو، اس مسئلہ پر اس واقعہ سے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے قریش کے سفراء کو اپنے پاس رکھا جب تک حدیبیہ کے مقام پر مذاکرات کا سلسلہ جاری رہا، یہاں تک کہ آپ ﷺ کا سفیر مکہ سے صحیح سالم واپس آ گیا(۳۹۴)، اور اخیر میں اسلامی مملکت کو یہاں تک اختیار ہے کہ وہ سفیر کے ملک سے اپنے تعلقات منقطع کر لے، اگر یہ ثابت ہو جائے کہ مؤخر الذکر اپنے سفیر یا ایلچی کو اسلامی ریاست میں کئے گئے جرائم کے لئے جوابدہ ٹھہرانے کے طریقہ کار کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہے(۳۹۵)۔

درحقیقت یہ آخری رجحان جس کی رو سے اسلامک اسٹیٹ میں غیر ملکی سفیر کو فوجداری عدالتی استثناء حاصل ہے، اس طرح کے استثناءات کی شرعی بنیادوں سے میل کھاتا ہے، جن کی وضاحت آئندہ سطور میں کی جائے گی، یہ قاصدوں اور سفیروں کے استثناء کے تعین کے سلسلے میں قدیم زمانے سے موجود بین الاقوامی اصولوں سے بھی مطابقت رکھتا ہے، اور رضامندی کے اصول سے بھی مطابقت رکھتا ہے، جو عصری بین الاقوامی تعلقات میں دائمی اور عارضی سفارتی نمائندگی کے تبادلے کا سنگ بنیاد ہے۔

۳۹۴- G.M.Bader, A Historical View of Islamic International Law, Revue Evyptienne De Droit International, 1982, PP 7 et seq.M Hamidullah, The Muslim Conduct of State, Hyderabad, 1945, PP.138.

۳۹۵- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۱۵-۶۱۶، ۶۱۹، دکتور احمد ابو الوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۴۱۳-۴۱۴۔

ج-سول اور دیوانی عدالت کے بالمقابل استثناء:

اسلامی مملکت میں غیر ملکی سفیر کو دیئے جانے والے دیوانی اور سول تحفظ واستثناء کے سلسلے میں قدیم فقہاء کی آراء کا تجزیہ یہ واضح کرتا ہے کہ اس طرح کے تحفظ کا دائرہ وسیع نہیں بلکہ تنگ ہے جب اس کا موازنہ مذکورہ اس استثناء وتحفظ سے کیا جاتا ہے جو مذکورہ طریقہ پر اسلامی مملکت میں فوجداری قوانین سے متعلق دائرہ اختیار کے خلاف دیا جاتا ہے، اس کی وجہ جس پر تمام مفسرین اور فقہاء نے اتفاق کیا ہے یہ ہے کہ قاصد یا ایلچی پناہ گزیں کی طرح ہی اسلامی شریعت کے احکام کا پابند ہے، خاص طور پر افراد کے حقوق کے حوالے سے، اس لئے افراد کے حقوق سے متعلق کسی بھی عمل کے سلسلے میں اس سے باز پرس کی جائے گی، اور اس کے نتیجہ میں افراد کو لاحق ہونے والے کسی بھی طرح کے نقصان کا اسے ضامن سمجھا جائے گا (۳۹۶)، لیکن اسلامی فقہ میں جدید رجحان ۱۹۶۱ء کے سفارتی تعلقات پر ویانا کنونشن کی دفعات سے اسی طرح اسلامی ریاست میں پناہ گزینوں کے لین دین اور سماجی تعلقات سے متعلق عدلیہ کے بارے میں قدیم فقہاء کی آراء سے متاثر ہے، اس رجحان کے مطابق غیر ملکی سفیر کو سول اور دیوانی استثناء وتحفظ اس وقت تک حاصل رہے گا جب تک وہ سرکاری ذمہ داریاں انجام دیتا رہے گا، تاہم اسلامی حکومت اس دوسرے شخص کے حقوق کی ضامن ہوگی، جسے سفیر کے غلط افعال کی وجہ سے نقصان پہنچا ہے، جبکہ مؤخرالذکر اپنے نجی معاملات سے متعلق ہر چیز میں اسلامی ریاست کی مقامی عدلیہ کے تابع ہے، یا وہ اسلامی ریاست کی سب سے بڑی عدلیہ کے تابع ہے اس پر اپنی رضامندی کی صورت

۳۹۶- الشافعی، الام، مرجع سابق، ج ۷، ص ۳۲۴-۳۲۶، وقارن فی ذلک: ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸-۱۸۹، ۲۰۴، جہاں یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ وہ شخص جو رومی بادشاہ کی طرف سے بطور سفیر بھیجا گیا ہو اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، السرخسی شرح السیر الکبیر، مرجع سابق، ج ۴، ص ۶۶-۶۷۔ ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۱۴۱۔

میں (۳۹۷)، اس رجحان کے حامی اپنے اس خیال کو اس دلیل سے درست ثابت کرتے ہیں کہ ایک غیر ملکی ایلچی کو سرکاری کام کے لئے سول تحفظ اور استثناء اس لئے حاصل ہوگا، کیونکہ اس سے اسلامی ریاست کے عمومی مصالح پورے ہوں گے، اور اس کے نتیجہ میں غیر اسلامی ممالک اسلامی ممالک کے ساتھ پر امن تعلقات قائم کرنے پر آمادہ ہوں گے، خاص طور پر موجودہ حالات جن میں اسلامی ممالک کو غیر اسلامی ممالک سے تعلقات قائم کرنے کے سلسلے میں کافی لچک پیدا کرنے کی ضرورت ہے (۳۹۸)۔

د- اہل وعیال اور مال کا تحفظ:

پناہ گزینوں کے حقوق اور ان کے احترام سے متعلق ضمانتوں، نیز اسلامی ریاست یا اس کے باشندوں کی طرف سے ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کئے جانے کے حوالہ سے تمام مفسرین اور فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ غیر مسلم کو دیا جانے والا تحفظ اس کے اہل وعیال اور مال ودولت تک وسیع ہوگا، کیونکہ اسلامی مملکت میں پناہ گزین سے تعلق رکھنے والے خاندان اور مال اسی کے متعلقات میں شمار کئے جاتے ہیں، دوسرے الفاظ میں ان کا تحفظ اور استثناء (ان امور سے بچنے کے زمرہ میں آتے ہیں جن سے اسے یعنی پناہ گزین کو تکلیف پہنچے) (۳۹۹)، اور اس سلسلہ میں

۳۹۷- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۷-۱۸۸، یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ کسی غیر ملکی سفیر کی تجارت اگر ذاتی نوعیت کی ہو اور اس کی سرکاری سفارتی ذمہ داریوں سے ہٹ کو ہو، تو وہ عشر (مالی محصول یا تجارتی ٹیکس) سے مستثنیٰ نہیں ہوگی۔ دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی السلام، مرجع سابق، ص ۶۱۳-۶۱۴، دکتور وہبہ الزحیلی اثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۱۴-۳۱۵، دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۱۳۶۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔

۳۹۸- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۲۴۔

۳۹۹- دیکھئے: ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸-۱۸۹، ۲۰۴، السرخسی، شرح السیر الکبیر، مرجع سابق، ج ۴، ص ۶۶-۶۷۔ الخطابی، معالم السنن، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۳۰-۳۳۱۔ الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازہار، مرجع سابق، ج ۲، ص ۱۰۱ اور اس کے بعد کے صفحات۔

فقہاء اور مفسرین کی اس رائے سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے کہ قاصد یا سفیر کو اس نظر سے دیکھنا چاہئے کہ وہ پناہ گزیں ہے، اس کے علاوہ جس ملک میں وہ بھیجے جاتے ہیں وہاں ان کو تفویض کی گئی سرکاری ذمہ داریوں یا مشن کے تقاضوں کو مدنظر رکھا جانا چاہئے۔

ان تمام امور کے پیش نظر اس بات پر اجماع منعقد ہے کہ قاصد یا سفیر کا خاندان جو اسلامی مملکت میں اس کے ساتھ قیام پذیر ہو، اسی طرح اس کے ساتھ جو مال و اسباب ہوں وہ سب تحفظ کے قانون کے تحت آئیں گے، لہذا قاصد اور سفراء اور جو لوگ ان کے ساتھ ہوں گے ان تمام کو جان کا تحفظ حاصل رہے گا، نہ ان کا قتل جائز ہوگا، اور نہ ان کے ساتھ کسی طرح کے غلط رویہ کی اجازت ہوگی، اور نہ کسی کو اس کی اجازت ہوگی کہ ان کے ساتھ برا برتاؤ کرے یا ان سے چھیڑ چھاڑ کرے، اور جب کوئی کافر امن وامان کے ذریعہ دارالاسلام میں پناہ لے تو اس کے ساتھ اس کے مال واولاد کو بھی امن وسلامتی دی جائے گی، یہاں تک کہ اگر وہ امن کی شرط بھی لگا دے تو اسے تاکید پر مبنی حکم سمجھا جائے گا (۴۰۰)، اور اہل حرب میں سے جو پناہ گزیں کی حیثیت سے دار الاسلام کا رخ کرے، تو جو کچھ اس نے دارالحرب میں اہل وعیال اور مال و دولت چھوڑا ان پر اسے کسی طرح کا امن نہیں مل سکتا (۴۰۱)، مفہوم مخالف کے طور پر اس کا مطلب یہ ہے کہ قاصد اور سفیر جو کچھ اپنے ساتھ یعنی اہل وعیال اور مال و دولت لے کر دارالاسلام آئے گا، اسے مکمل تحفظ ملے گا، بلکہ اہل وعیال اور مال و دولت کے تحفظ کا سلسلہ برابر جاری رہے گا، یہاں تک کہ اگر قاصد یا سفیر کی حیثیت ختم بھی ہو جائے تب بھی جو کچھ اپنے پیچھے دارالاسلام میں قرض یا امانت چھوڑ کر آئے گا اسے بھی تحفظ حاصل رہے گا، جب تک وہ زندہ رہے گا (۴۰۲)، یہاں تک کہ

۴۰۰- M.Hamidullah, op.cit., PP.39-40۔

۴۰۱- ابن الفراء، رسل الملوک، مرجع سابق، ص ۱۴۱، دکتور صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ، فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۷۶، دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۵۵۔

۴۰۲- ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۴۳۸۔

جب وہ وفات پا جائے گا اور اس کا مال اس کے وارث کی طرف لوٹ جائے گا تب بھی وارث کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس ملک میں امن کے معاہدہ کے بغیر داخل ہو، کیونکہ مورث کی وفات کا عذر اس کے لئے وجہ امن ثابت ہوگا، جیسے کہ کوئی سفارتی امور کو انجام دینے کی خاطر آئے تو اسے بلا روک ٹوک اجازت ہوگی (۴۰۳)۔

جس طرح سفیر کے مال ومتاع کو لوٹ کھسوٹ، غصب اور دوسروں کے ناجائز قبضہ، ایکسپورٹ یا ایذا رسانی اور نقصان پہنچانے سے تحفظ حاصل ہوتا ہے، اسی طرح اسے دوسری مالی مراعات جیسے کہ ٹیکس کی معافی وغیرہ جیسی سہولت بھی حاصل ہوتی ہے، ایسا یا تو باہمی تعلقات کی بنیاد پر یا پھر رعایت کے طور پر ہوگا، جیسا بھی اسلامی مملکت کے عمومی مفاد کا تقاضا ہوگا، اس سلسلے میں بعض حضرات کی رائے ہے کہ اس سفیر سے جسے روم کے بادشاہ نے بھیجا ہو کسی طرح کا ٹیکس یا فیس نہیں لی جائے گی، الا یہ کہ اس کے ساتھ تجارت کا مال ہو، اس کے علاوہ جو مال ہوگا اس پر کسی طرح کی فیس یا ٹیکس کی وصولی نہ ہوگی اور اگر اس کے پاس اپنے بادشاہ کا خط یا کوئی پیغام ہو (۴۰۴) تو جس میں کسی طرح کا کچھ بھی وصول نہیں کیا جائے گا، اس پہلو کو بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ غیر ملکی قاصد یا سفیر سے فیس یا ٹیکس کی معافی باہمی تعلقات کی بنیاد پر یا رعایت کے طور پر ہوگی اس صورت میں جبکہ اس کے قبضہ میں جو مال ومتاع ہو وہ اس کے اور اس کے اہل وعیال کے ذاتی استعمال کا ہو، مگر جب سفیر تجارتی یا پیشہ ورانہ سرگرمیوں کو انجام دے، جس کا مقصد اندرون اسلامی مملکت ذاتی کمائی کا حصول ہو، اور جس مال کو دار الاسلام میں لے کر آیا ہو وہ مال اس طرح کی سرگرمیوں سے متعلق ہو تو یہ سارے امور قطع نظر اس سے کہ سفیر کے

۴۰۳- ابو حامد الغزالی، الوجیز فی فقہ مذہب الامام الشافعی، ج ۲، ص ۱۹۶ (نقلا عن دکتور احمد ابو الوفا، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۳۷۴)۔

۴۰۴- ابو یوسف، الخراج، مرجع سابق، ص ۱۸۸، ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۵۹۷۔ السرخسی، شرح السیر الکبیر، مرجع سابق، ج ۴، ص ۶۷۔

لئے تجارت کرنا درست ہے یا نہیں، تجارتی سرگرمیوں کو انجام دینے کے حوالے سے اسلامی مملکت میں زیر عمل اصول وقواعد کے تابع ہوں گے، ان اصول وقواعد کے بارے میں پہلے کہا جاچکا ہے کہ یہ ان معاہدوں پر مبنی ہیں جو عموماً اسلامی ریاست کی جانب سے باہمی تعاون کے اصول پر قائم ہوتے ہیں، یا اس ریاست کے مفاد عامہ کے تقاضوں کے مطابق واجب الاداء فیسوں کو کم کرنے یا منسوخ کرنے پر مبنی ہوتے ہیں(۴۰۵)۔

ھ-نمائندگان اور سفراء کو حاصل تحفظ کی شرعی بنیاد:

مفسرین اور فقہاء کی آراء اور ان کے رجحانات اس قانونی بنیاد کی نوعیت کے بارے میں مختلف ہیں جس پر اسلامی ریاست میں قاصدوں اور غیر ملکی سفیروں کو استثنی اور تحفظ حاصل ہے، فقہاء مفسرین بالخصوص ان میں جو قدیم ہیں، کا غالب رجحان یہ ہے کہ اس تحفظ کی بنیاد اللہ تعالی کے قول:"**وان أحد من المشرکین استجارک، فأجره حتی یسمع کلام الله ثم أبلغه مأمنه** "میں اور رسول اللہ ﷺ کے قول:"**المسلمون تتکأفأ دماؤهم ویجیر علیهم أدناهم وهم یدعلی من سواهم**"میں پنہاں ہے(۴۰۶)، ان حضرات کے نزدیک قاصد پناہ گزیں کی طرح جب تک اسلامی مملکت میں رہے گا اس وقت تک اسے امن وامان اور تحفظ حاصل رہے گا، یہاں تک کہ اپنی اس ذمہ داری سے فارغ ہوجائے جس کے لئے اسے بھیجا گیا ہے، اس رجحان کے حامی حضرات کے رجحان کو اس مسئلہ سے تقویت ملتی ہے کہ" جو

۴۰۵- راجع ماسبق،ص۸۱-۸۳۔

۴۰۶- سورہ توبہ:۸، نیز دیکھئے: الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازهار، مرجع سابق،ص۵۶۱، کنز العمال، مرجع سابق،ج۴،ص۴۳۵، نیز دیکھئے:**حول الامان:مفهومه، شروط وارکانه، من یعطیة، اختصاص کل منهم ابو الحسن المرداوی، الانصاف فی معرفة الراجح من الخلاف علی مذهب الامام احمد ابن حنبل**،د،ن،۱۹۵۵ء،ص۲۰۳ اور اس کے بعد کے صفحات، الکاسانی، بدائع الصنائع، مرجع سابق، ج۶،ص۱۰۶ اور اس کے بعد کے صفحات۔

دارالحرب سے دارالاسلام آئے مقصد خط پہنچانا ہو یا صلح کی جستجو ہو یا ان جیسے دیگر مقاصد ہوں، اور امام یا اس کے نائب سے امن طلب کرے تو اسے اس وقت تک امن حاصل رہے گا جب تک وہ دارالاسلام میں آتا جاتا رہے گا، یہاں تک کہ وہ اپنے گھر یا وطن لوٹ جائے، اور قاصد بھی پناہ گزینوں ہی کی ایک قسم ہے، اگر آپ چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ خاص نوعیت کا حامل پناہ گزیں ہے(۴۰۷)۔

جدید فقہ میں ایک رائے کی رو سے دارالاسلام میں غیر ملکی سفیر کو جو تحفظ حاصل ہوتا ہے وہ امن وسلامتی کے تصور پر مبنی ہوتا ہے، اس صورت میں جبکہ وہ سفیر عارضی مشن پر ہو، اس وقت وہ پناہ گزیں ہوتا ہے، اور یہ تحفظ پڑوسی ہونے کے تصور پر بھی مبنی ہوتا ہے، جب وہ مقیم ہو اس وقت وہ معزز پڑوسی ہوتا ہے یا مسلمانوں کا قریبی ہمسایہ ہوتا ہے(۴۰۸)، اس کی دلیل گذشتہ سطور میں ذکر کردہ آیات واحادیث ہیں، کیونکہ جس طرح پناہ چاہنے والے کی ہم سائیگی جائز ہے، اسی طرح پڑوسی کی ہم سائیگی بھی جائز ہے، جب اللہ تعالی نے جنگ کے وقت دشمن کے پڑوس کی اجازت دی ہے، اور اس کو جب تک وہ مسلمانوں کے درمیان رہے مکمل تحفظ دیا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے وطن اصلی کو لوٹ جائے، تو سچے پکے انسان کا پڑوس زیادہ افضل ہے اور اسے تحفظ دینا زیادہ نیکی پر مبنی عمل ہے(۴۰۹)۔

تیسری رائے:

قاصدوں اور سفیروں کو تحفظ فراہم کرنے کے سلسلے میں تیسری رائے یہ ہے کہ قاصد

۴۰۷- دیکھئے: ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۳۷، دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۰۶، دکتور جعفر عبد السلام، قواعد العلاقات الدولیۃ فی القانون الدولی وفی الشریعۃ الاسلامیۃ، القاہرۃ، مکتبۃ السلام العالمیۃ، الطبعۃ الاولی ۱۴۰۱ھ/ ۱۹۸۱ء، ص ۲۸۷۔ دکتور احمد ابو الوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی مرجع سابق، ص ۴۶۶۔

۴۰۸-۴۰۹- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۶۰۹۔

اور پناہ گزیں کے درمیان کچھ بنیادی فرق پائے جاتے ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قاصد اس ملک کے حکام کے نزدیک تسلیم شدہ ہوتا ہے جہاں اسے بھیجا جاتا ہے، یہ صورت پناہ گزیں میں نہیں پائی جاتی، اور پہلا شخص اپنی حکومت کا نمائندہ ہوتا ہے، جبکہ مؤخر الذکر اپنی نمائندگی کرتا ہے نہ کہ دوسرے کی، الا یہ کہ کچھ ایسی استثنائی صورت ہو جس میں وہ دوسروں کی نمائندگی کرتا ہو، اسی طرح قاصد پناہ گزیں کے برخلاف اس ذمہ داری سے بندھا ہوتا ہے جس کے لئے اسے بھیجا گیا ہے، اور قاصد کی صورتحال تحفظ اور سہولت کے لحاظ سے، پناہ گزیں کی صورتحال سے زیادہ مستحکم ہوتی ہے، اس کی دلیل اللہ کے رسول ﷺ کا وہ ارشاد ہے جو آپ ﷺ نے مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصدوں سے فرمایا تھا: "**لولا أن الرسل لا تقتل لضربت أعناقكما**" جبکہ آپ ﷺ نے پناہ گزیں کے حوالے سے کچھ بھی نہیں فرمایا، قاصد اور مستأمن (پناہ گزیں) کے درمیان گذشتہ سطروں میں مذکور اختلاف کی روشنی میں ایک رائے یہ قائم کی گئی ہے کہ قاصد یا سفیر کو جو تحفظ دیا جاتا ہے وہ نمائندگی اور اس کے سپرد ذمہ داریوں کے تقاضے سے ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان مراعات سے اس لئے مستفید ہوتا ہے کہ وہ خودمختار حکومت کا سرکاری نمائندہ ہے، اور اس لئے بھی کہ ان مراعات سے فائدہ اٹھانا اس کے لئے ضروری ہے تاکہ وہ اپنی مفوضہ ذمہ داری کو انجام دینے پر قادر ہو سکے (۴۱۰)۔

حقیقت یہ ہے کہ احادیث رسول اللہ ﷺ نیز آپ ﷺ کے غیر ملکی سفراء اور قاصدوں کے متعلق طرز عمل پر غور کرنے، اسی طرح ان سفراء کو اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کی غرض سے حاصل مراعات کے متعلق فقہاء کی آراء کا جائزہ لینے کے نتیجہ میں ہم اس رجحان کی تائید تک پہنچتے ہیں جو نمائندہ یا سفیر کو حاصل مراعات کو اس کی نمائندہ حیثیت یا اسے تفویض کردہ ذمہ داری کے تقاضوں پر مبنی قرار دیتا ہے۔

۴۱۰- دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۴۶۷ اور اس کے بعد کے صفحات۔

اس کی تائید اللہ کے رسول ﷺ کے اس قول سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے مسیلمہ کذاب کے دونوں قاصدوں سے فرمایا: "**لولا أن الرسل لا تقتل لضربت أعناقكما**" اور آپ ﷺ کے اس قول سے جو آپ ﷺ نے عامر بن طفیل سے فرمایا تھا جو آپ ﷺ کے پاس اپنی قوم کا قاصد بن کر آیا تھا، اور جس نے آپ ﷺ کو تین چیزوں کے درمیان انتخاب کی پیش کش کی تھی، جن میں جنگ کی دھمکی شامل تھی، "**أللهم اكفني عامر بن الطفيل**" (اے اللہ عامر بن طفیل کے مقابلے ہمارے لئے کافی ہوجا)، نیز آپ ﷺ کے اس قول سے بھی جو آپ ﷺ نے ابورافع سے فرمایا تھا، جن کے دل میں ایمان داخل ہوگیا، تو وہ مکہ سے نکل کر آپ ﷺ کے پاس یہ کہتے ہوئے آئے: اے اللہ کے رسول ﷺ میں ان کی طرف لوٹ کر نہیں جاؤں گا، میں آپ ﷺ کے ساتھ مسلمان کی حیثیت سے رہوں گا، تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: "میں نہ معاہدہ کی خلاف ورزی کرتا ہوں اور نہ ہی قاصدوں کو قید کرتا ہوں، تم مطمئن ہوکر ان کی طرف لوٹ جاؤ، اگر آئندہ تمہارے دل میں یہی چیز آوے جو ابھی تم محسوس کر رہے ہو تو ہمارے پاس لوٹ آنا (۴۱۱)۔

ایک طرف اگر دارالاسلام میں اللہ کے رسول ﷺ کے ذریعہ سفیر یا غیر ملکی ایلچی کو دیئے جانے والے تحفظ کو اس درجہ احترام اور تقدس حاصل تھا، تو دوسری طرف اس تحفظ میں کوتاہی اور سفیر کی جان یا آزادی کو لاحق خطرہ ناہی اس صورت حال کو جارحیت کی ایک ایسی شکل قرار دینے کے لئے کافی تھا جس کے مقابلہ اور خاتمہ کے لئے اسلامی مملکت کو اٹھ کھڑے ہونے کا جواز حاصل ہوجاتا تھا، اس کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ جب حضرت عثمان بن عفانؓ کے شہید کئے جانے کی خبر عام کردی گئی، تو آپ ﷺ نے مذاکرات کا سلسلہ منقطع فرمادیا، اور مسلمانوں کو قریش کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بیعت کرنے کی دعوت دی، یہ کہتے ہوئے کہ

۴۱۱- راجع ماسبق، ص ۱۳۲، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، مرجع سابق، ج ۴، ص ۱۸۱، دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۸۷۔

"لانبرح حتی نناجز القوم" (ہم یہاں سے نہیں ہٹیں گے جب تک کہ قریش سے جنگ نہ کریں)(۴۱۲)، اسی طرح مسلمانوں نے اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں مقام رجیع اور بئر معونہ (بنو عامر کی زمین اور بنو سلیم کے پتھریلے علاقے کے مابین واقع) میں مسلمان مبلغین (قاصدین) کے قتل کے بدلے میں حملے کئے جیسے بنو سلیم اور بنولحیان (عسفان کے قریب قبیلہ ھزیل کے پانی کا چشمہ) پر کئے گئے حملے (۴۱۳)، اس کے علاوہ بھی اقوال اور اللہ کے رسول ﷺ کے عملی نمونہ ہیں جو پوری وضاحت سے اس حقیقت کو ثابت کرتے ہیں کہ قاصد یا سفیر اس حیثیت سے کہ وہ اپنی حکومت کا سرکاری سفیر ہے، نمائندہ ہے اور سرکار کے عزائم و مقاصد کا ترجمان ہے، اور اسلامی حکومت کے نزدیک اپنی حکومت کے مصالح اور مقاصد کے حق میں کام انجام دینے والا ہے، اسے وہ استثناء حاصل رہے گا جس کی وجہ سے نہ اسے قتل کیا جاسکتا ہے اور نہ کوئی تکلیف دی جاسکتی ہے، اور نہ کسی طرح سے اسے کوئی نقصان پہنچایا جاسکتا ہے، اس سلسلے میں بعض فقہاء کی یہ رائے ہے کہ غیر مسلموں میں سے جو کوئی دارالاسلام آئے سفارت کی غرض سے یا کلام الٰہی سننے کے مقصد سے، اسے امن پر مبنی معاہدہ کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اس کا یہ عزم وارادہ ہی اسے امن وسلامتی عطا کرنے کے لئے کافی ہے (۴۱۴)، جیسا کہ بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ سفراء اور ایلچی حضرات کو جو تحفظ دیا جاتا ہے وہ اسلام میں ثابت ہے بغیر امن وسلامتی پر مبنی معاہدہ کے اور جو بھی سفیر اپنی قوم یا اپنی حکومت کی طرف سے اسلامی حکومت کا رخ کرے محض دارالاسلام میں داخل ہوتے ہی اسے امن وامان مل جائے گا، بشرطیکہ یہ ثابت

۴۱۲- دکتور محمد رواس قلعہ جی، مرجع سابق، ص ۳۰۳۔ دکتور محمد الصادق عفیفی تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام مرجع سابق، ص ۸۶۔

۴۱۳- ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، مرجع سابق، ص ۶۲ اور اس کے بعد کے صفحات، دکتور محمد رواس قلعہ جی، مرجع سابق، ص ۲۲۴، اور اس کے بعد کے صفحات، ابن خلدون، تاریخ بن خلدون، مرجع سابق، ج ۲، ص ۲۷-۲۸۔

۴۱۴- ابوحامد الغزالی، الوجیز فی فقہ مذہب الامام الشافعی، مرجع سابق، ص ۱۹۶ (نقلا عن دکتور احمد ابو الوفاء، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، ص ۴۶۸)۔

ہوجائے کہ وہ اپنی حکومت کی طرف سے بھیجا ہوا سفیر ہے، اور اس چیز کو ثابت کرنے کیلئے ظاہری علامت ہی پر اکتفا کیا جائے گا جیسے کہ اس کے پاس اپنے ملک کے حکمراں کا خط ہو، جب وہ خط نکالے تو ظاہر اوہ سچا سمجھا جائے گا، اور ان امور میں جن کی حقیقت سے واقف ہونا ممکن نہ ہو ظاہر کا اعتبار کرنا واجب ہے، اس کے ساتھ کسی طرح کی بدسلوکی نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ وہ اپنے وطن واپس آ جائے (۴۱۵)۔

اس امر کی ایک عملی دلیل کہ سفیر کو حاصل تحفظ کی بنیاد اس کی نمائندہ حیثیت ہے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی یہ روایت ہے کہ جب وہ کوفہ کے والی تھے، تو انہوں نے ابن النواحہ سے جو اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں مسیلمہ کذاب کی طرف سے بھیجے گئے دو قاصدوں میں سے ایک تھا اس وقت جب اس کی قاصد کی حیثیت ختم ہوگئی تھی فرمایا: میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اگر تم قاصد نہ ہوتے تو میں تمہاری گردن مار دیتا، آج تو تم قاصد نہیں ہو، یہ کہہ کر انہوں نے اس کی گردن زنی کا حکم دیا'' (۴۱۶)۔

قاصدوں اور سفیروں کو حاصل تحفظ کی بنیاد ان کی سفارتی حیثیت نیز مذکورہ بالا پیغمبرانہ اقوال، اسی طرح دارالاسلام میں غیر ملکی سفیر یا قاصد کو حاصل تحفظ کے بارے میں فقہاء کی آراء یہ سب اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ ذمہ داری کے تقاضے بھی ان مراعات کی ایک بنیاد ہیں، فقہاء کی متعدد ایسی آراء ہیں جو انہوں نے مذکورہ ارشادات نبوی کی شرح اور اس پر تعلیق کرتے ہوئے پیش کی ہیں، جن سے یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ ذمہ داری کے تقاضے اس بات کا جواز ہیں کہ قاصدوں اور سفراء کو مکمل تحفظ دیا جائے، فقہی نقطہ نظر سے اس مسئلہ میں اللہ کے رسول ﷺ کے اقوال کی تشریح سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ'' ضرورت قاصد کے تحفظ کا تقاضا

۴۱۵- دکتور محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۲۲، نیز دیکھئے: السرخسی، المبسوط، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۹۲، ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۸ ص ۴۰۰۔

۴۱۶- ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مرجع سابق، ج ۲، ص ۳۳۷۔ البیہقی، السنن الکبری، مرجع سابق، ج ۹، ص ۲۱۱۔ الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازہار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۳۲۔

کرتی ہے'' کیونکہ اگر اسے قتل کر دیا جائے گا تو مراسلت کا مقصد فوت ہو جائے گا (۴۱۷)، نیز کفار کے قاصدوں کا قتل جائز نہیں اگر چہ وہ امام اور تمام مسلمانوں کے سامنے کلمہ کفر کہیں، اس لئے کہ قاصد کے ذریعہ حکمراں تک آنے والا پیغام جواب کا تقاضا کرتا ہے، گویا یہ ایک عہد کے مترادف ہوا (۴۱۸)، ان کو قتل کرنا اس لئے بھی جائز نہیں کہ اگر ہم ان کے قاصدوں کو قتل کریں گے تو وہ بھی ہمارے قاصدوں کو قتل کریں گے، اس طرح مراسلت کے مقاصد فوت ہو جائیں گے (۴۱۹)، عمومی حیثیت سے بھی دیکھا جائے تو قاصدوں اور سفارتوں کے باہمی تبادلہ اور ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ان حضرات کو اس مقصد کے حصول کے لئے درج ذیل اصولی قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے ضروری تحفظ فراہم کیا جائے، اس اصولی قاعدہ پر عمل کرتے ہوئے "مالایتم الواجب الا به فهو واجب" (جس کے بغیر واجب مکمل نہ ہو وہ بھی واجب ہے) (۴۲۰)۔

و- نمائندگان اور سفراء کو دیئے گئے تحفظ کا خاتمہ:

چند اسباب ایسے بھی ہیں جن کی وجہ سے دارالاسلام میں قاصدوں اور سفیروں کو حاصل تحفظ ختم ہو جاتا ہے، یہ مراعات اس ذمہ داری کے ختم ہوتے ہی ختم ہو جاتے ہیں جن کے لئے قاصد بھیجے جاتے ہیں، اس سلسلے میں بعض حضرات کی یہ رائے ہے کہ'' جو آدمی ہماری طرف قاصد کی حیثیت سے آئے گا اسے امن وامان ملے گا، یہاں تک کہ اپنا کام کر کے اپنے وطن لوٹ جائے'' (۴۲۱)، اسی طرح قاصد یا سفیر کے وفات پاتے ہی یا اس کے برطرف کئے جاتے ہی یا استعفی دیتے ہی یا اس صورت میں اسے اپنے ملک واپس بلا لیا جائے یا جب اسلامی ریاست یا

۴۱۷- السرخسی، المبسوط، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۹۳۔

۴۱۸- الشوکانی، نیل الاوطار، مرجع سابق، ج ۸، ص ۳۰۔

۴۱۹- ابن قدامہ، المغنی، مرجع سابق، ج ۱۰، ص ۴۳۷۔

۴۲۰- دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، مرجع سابق، ص ۵۸۷-۵۸۸۔

۴۲۱- البغوی، شرح السنۃ، مرجع سابق، ج ۱۱، ص ۱۶۷-

مسلمان عوام کے خلاف کسی توہین آمیز عمل کے ارتکاب کی وجہ سے اسلامی حکومت کی طرف سے اس کے بارے میں یہ اعلان کر دیا جائے کہ یہ شخص اس کام کے لئے مناسب نہیں ہے، اس کو سپرد کی گئی ذمہ داری ختم ہوجاتی ہے، اسی طرح سفیر یا قاصد کو حاصل تحفظ دارالاسلام میں اس وقت ختم ہوجاتا ہے، جب اسلامی ریاست اور غیر ملکی سفیر کے ملک کے باہمی تعلقات منقطع ہوجاتے ہیں(۴۲۲)۔

تاہم قاصد یا سفیر کے مشن کے پورا ہونے یا اس مشن کے پورا ہونے کا جس کا وہ

۴۲۲- دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۵۰۲ تا ۵۰۷۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اسلامی ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کا منقطع ہونا ویسا ہی ہے جیسے عام افراد کے درمیان تعلق توڑنا، جس سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: " کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے تین دن سے زیادہ قطع تعلق رکھے۔ جب وہ دونوں ملیں تو ایک اِدھر منہ موڑے اور دوسرا اُدھر۔ ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام میں پہل کرے۔"

اور آپ ﷺ نے فرمایا: " آپس میں بغض نہ رکھو، حسد نہ کرو، دشمنی نہ رکھو، ایک دوسرے سے منہ نہ موڑو، اور اللہ کے بندے ہوکر بھائی بھائی بن جاؤ۔" جہاں تک غیر مسلم ممالک سے تعلقات کا تعلق ہے، تو اس کا اصول یہ ہے کہ اسلام ان ممالک سے تعلقات توڑنے کی اجازت نہیں دیتا جب تک وہ مسلمانوں سے دشمنی نہ کریں یا انہیں ستائیں نہیں۔ اس کی دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "اللہ تمہیں ان لوگوں سے بھلائی اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا جنہوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔"

اور اسی طرح فقہ میں جو رائے بیان کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی غیر مسلم قوم جس نے مسلمانوں پر کوئی ظلم یا حملہ نہیں کیا، نہ ہی اسلامی دعوت دینے والوں کو روکا ہو، بلکہ انہیں آزادی دی ہو کہ وہ جس کو چاہیں دین کی دعوت دیں اور اپنے دلائل پیش کریں۔ تو ایسی قوم سے نہ جنگ کرنا جائز ہے اور نہ ہی اسلامی تعلقات منقطع کرنا۔ (دکتور عبدالغفار عزیز، الدعوۃ الاسلامیۃ بین التنظیم الحکومی والتنشر یج الدینی، القاھرۃ، جلد نمبر ۱، ۱۴۰۳ھ/ ۱۹۸۳م، صفحہ نمبر ۳۲۱)۔

اور دکتور ابوالوفا اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ سفارتی تعلقات کو منقطع کرنا کبھی کبھار اسلامی ریاست اپنے اختیار سے کرتی ہے، اور بعض اوقات یہ اقدام کسی بین الاقوامی تنظیم کی درخواست پر کیا جاتا ہے، جیسا کہ اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) کے دائرے میں بعض اوقات ہوتا ہے۔

واقعی طور پر، کسی بین الاقوامی اسلامی تنظیم، جیسے کہ اسلامی کانفرنس تنظیم (OIC) کی جانب سے جاری کردہ سفارتی تعلقات منقطع کرنے کی سفارش یا فیصلہ — اگر وہ کسی اسلامی ملک کے خلاف ہو — تو اسے یوں سمجھا جاسکتا ہے

سربراہ ہے، یا جس کے دائرہ میں اسلامی ریاست میں وہ اپنی ذمہ داریاں انجام دے رہا ہے یہ نہیں ہے کہ فوری طور پر یا براہ راست سفیر یا ایلچی کو حاصل مراعات ختم کردی جائیں، بلکہ اس مشن کو اس ریاست تک منتقل کرنے کے لئے ایک معقول مدت دی جائے گی، جس میں سفیر یا ایلچی کے لئے اپنے وطن پہنچنا ممکن ہو سکے، اس سلسلے میں بعض حضرات کا یہ کہنا ہے کہ جب سربراہ کہ یہ ایک ایسا اقدام ہے جو اس اسلامی ملک کے خلاف کیا جاتا ہے جو سرکشی پر اتر آیا ہو اور جس کے بارے میں تنظیم اس نتیجے پر پہنچی ہو کہ اس کا طرز عمل اسلامی شریعت کے عمومی احکام سے ٹکرا رہا ہے۔

اسی طرح، اگر کسی غیر مسلم ملک کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے کی سفارش یا فیصلہ مذکورہ اسلامی تنظیم کی جانب سے جاری ہو، تو اسے اسلام دشمن قوتوں کے خلاف جہاد کے ایک ذریعے اور ذریعہ مزاحمت کے طور پر دیکھا جاتا ہے — وہ قوتیں جو اسلام سے دشمنی رکھتی ہیں اور اس کے ماننے والوں پر ظلم کرتی ہیں۔ لیکن اگر تعلقات منقطع کرنے کی سفارش یا فیصلہ کسی بین الاقوامی تنظیم کی طرف سے جاری ہو جس میں دنیا بھر کی اقوام شامل ہوں، بغیر اس کے کہ ان کا دین یا عقیدہ دیکھا جائے، جیسا کہ اقوام متحدہ کی مثال ہے، تو یہ معاملہ زیادہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اگر کوئی اسلامی ریاست کسی وجہ سے اس تنظیم کی رکنیت قبول کرتی ہے اور یہ سمجھتی ہے کہ یہ رکنیت اسلامی احکام سے متصادم نہیں، تو پھر اس کی پوزیشن مختلف انداز میں دیکھی جائے گی۔ اور خاص طور پر کمزوری اور مجبوری کی حالت میں، جب عمومی شرعی احکام کا تقاضا یہی ہو، تو ایسی صورت میں کسی بین الاقوامی تنظیم کی رکنیت کا ثابت ہونا یہ لازم کرتا ہے کہ اس کے منشور (میثاق) کا احترام کیا جائے اور اس کے اصولوں کا لحاظ رکھا جائے۔ چنانچہ اگر بین الاقوامی تنظیم کسی اسلامی ملک کے خلاف سفارتی تعلقات منقطع کرنے کا فیصلہ یا سفارش جاری کرتی ہے، تو دیگر اسلامی ممالک جو اس تنظیم کے رکن ہیں، ان کی طرف سے اس فیصلے کی پاسداری کو شریعت کے مطابق "عہد کی وفاداری" کے اصول کا تقاضا سمجھا جائے گا جو کہ بعض حالات میں دینی نصرت (مدد) کے فریضے پر مقدم ہو جاتا ہے، خاص طور پر جب اقوام متحدہ جیسی تنظیم اپنے فیصلے میں اس اسلامی ملک کی جانب سے واضح خلاف ورزی یا سنگین خلل کو بنیاد بناتی ہے، جس سے اس نے تنظیم کے میثاق کی پامالی کی ہو۔ لیکن اگر یہ فیصلہ کسی کھلے ظلم یا کسی بڑی طاقت کے دباؤ کی وجہ سے کیا گیا ہو، جو تنظیم کے فیصلے پر اثر انداز ہوتی ہو، اور یہ اسلامی ملک صرف اس وجہ سے نشانہ بنا ہو کہ اس کی پالیسی یا موقف بین الاقوامی طاقتوں کے مفاد سے ٹکراتا ہو، تو ایسی صورت میں دیگر اسلامی ممالک پر لازم ہے کہ ہر ممکن طریقے سے اس فیصلے کے جاری ہونے کو روکنے یا اس کے نفاذ کو روکنے کی کوشش کریں، کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اپنے بھائی کی مدد کرو، خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔ ظالم ہونے کی صورت میں اس کو ظلم سے روک کر، اور مظلوم ہونے کی صورت میں اس کا حق دلا کر۔" اگر ایسا ممکن نہ ہو، یعنی ** مسلمان ممالک کی کمزوری، باہمی تقسیم اور دوسروں کی طاقت و غلبہ ایسا کرنے سے اگر وہ (مسلم ریاستیں) قاصر ہوں، تو ان پر لازم ہے کہ ان حالات پر قابو پانے کی کوشش کریں، تاکہ وہ حق کو قائم کرنے اور ظالموں سے انصاف لینے میں ایک دوسرے کی مدد کر سکیں۔

کو دارالاسلام میں سفیر کا قیام ناپسند ہو، تو اسے نکلنے کی پیش کش کی جائے گی، اور اتنی مہلت دی جائے گی جس میں اس کے لئے بغیر کسی نقصان کے نکلنا ممکن ہو(۴۲۳)، یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کسی بھی سبب سے سفیر یا نمائندہ کی ذمہ داری ختم ہوجانے کے نتیجہ میں اسے ایک معقول مدت تک تحفظ فراہم کرنا اگر ایک طرف اسلام کے اس اصول پر مبنی ہے جس کے تحت اس نے انسانی اور اخلاقی نقطہ نظر سے ایفائے عہد کو لازم اور بدعہدی کو حرام ٹھہرایا ہے تو دوسری طرف یہ طریقہ دھوکہ دھڑی کی حرمت اور عہد کی پاسداری پر مبنی ہے(۴۲۴)، بیرون ملک موجود ان مسلم سفیروں کے تحفظ کو بنیادی ضمانت فراہم کرنے کا ذریعہ ہے جن کو حاصل مراعات مذکورہ بالا وجوہات میں سے کسی وجہ سے ختم ہوگئی ہوں، لہذا اس موقف کی بنیاد برابری کے اصول پر ہے۔ اس کے علاوہ معاصر سفارتی تعلقات کے دائرہ میں اس کی جڑیں اتنی گہری ہیں کہ یہ سفارتی نمائندگی کے تبادلے کے حوالے سے مستقل قواعد کی سطح تک ترقی کر چکا ہے، چاہے وفد بھیجنے کا معاملہ ہو یا اس کے استقبال کا(۴۲۵)۔

۴۲۳- السرخسی، شرح السیر الکبیر، مرجع سابق، جلد نمبر ۲، صفحہ نمبر ۱۰۶۔ رجوع کریں تفسیر آیت "وان احد من المشرکین استجارک، فأجرہ حتی یسمع کلام اللہ، صفحہ نمبر ۱۴۲ تا ۱۴۳۔

۴۲۴- رجوع کریں اس دراسہ سے جو اسلامی حکومت کے لئے خارجہ تعلقات کے سلسلے میں شرعی بنیاد سے متعلق ہے، مرجع سابق ذکرہ من الدراسۃ، اور اسی طرح دیکھیں: دکتور محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الاسلام، م مرجع سابق، صفحہ نمبر ۶۱۶۔ دکتور احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی، مرجع سابق، صفحہ نمبر ۵۲۹۔

اور اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دشمنوں سے معاملہ کرتے وقت یہ طریقہ اختیار کیا کہ جب کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کی مدت ختم ہوجاتی، تو آپ ﷺ ان کو اطلاع دیئے بغیر ان پر حملہ نہ کرتے، یہ اللہ تعالی کے اس فرمان پر عمل کرتے ہوئے تھا: "برائة من الله ورسوله الى الذين عاهدتم من المشركين" (اللہ اس کے رسول کی طرف سے ان مشرکین سے براءت کا اعلان ہے جن سے تم نے عہد و پیمان کیا تھا)۔

اور اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اگر چہ نبی ﷺ نے بنو مصطلق پر حملہ کیا جب کہ وہ غافل تھے، تو یہ اس لئے تھا کہ ان کے بارے میں (مستند) اطلاع ملی تھی کہ وہ اسلام کے خلاف چالا کیاں کر رہے ہیں، مسلمانوں کی دشمنی پر قائم ہیں، اور ان کو نقصان و اذیت پہنچا رہے ہیں۔

۴۲۵- اس مطلب یہ ہے کہ سفیر اور ایلچی کی حرمت ایک ایسا عرفی اصول ہے جو قدیم زمانے سے تسلیم شدہ چلا آ رہا ہے یہ اصول اسلام سے پہلے بھی معروف تھا، اور اسلام نے آ کر اسے مزید تقویت وضاحت اور پابندی عطا کی، کیونکہ

ز-مشن کے غیر نمائندہ ارکان کو دیئے جانا والا تحفظ:

یہاں یہ بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ قاصدوں اور سفراء کو دیئے جانے والے تحفظ کے متعلق مفسرین کی آراء اور فقہاء کی تحریریں اپنے مضمون اور دائرہ کار کے اعتبار سے ان ہی افراد تک محدود ہیں جن کی حیثیت سفیر یا سرکاری ایلچی کی ہو، اس کے علاوہ یہ عارضی سفارتکاری کے تبادلے کے ساتھ خاص ہیں، اگر ایک طرف ہم پہلے یہ نتیجہ اخذ کر چکے ہیں کہ عارضی قاصد یا سفیر کے استثناء اور دائمی مشن کے دائرہ کار کے اندر سرگرم قاصد یا سفیر کے استثناء کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے، تو دوسری طرف عصر حاضر میں سفارتی تعلقات کے تبادلے کے حوالے سے جو پیش رفت ہو رہی ہے، اس میں مشن کی رکنیت کے دائرہ کار میں اتنی وسعت آ چکی ہے کہ اس میں نمائندہ حیثیت کے علاوہ مشن کے مالی، انتظامی اور تکنیکی امور سے متعلق ماہرین اور منتظمین کی ایک بڑی تعداد بھی شامل ہے، اسی طرح مشن کی خدمت کرنے اور اس کے ارکان کے لئے راحت فراہم کرنے کے ذمہ دار خدام بھی اس فہرست میں اپنا مقام رکھتے ہیں، اس طرح کی پیش رفت سے یہ سوال اٹھے گا کہ اس ریاست کی سرزمین پر رہتے ہوئے جس میں انہیں بھیجا گیا ہے، انہیں کیا مراعات حاصل ہیں، اور یہ مراعات کس بنیاد پر ہیں؟ درحقیقت ان لوگوں کو قاصدوں اور سفیروں کی حیثیت پر قیاس کر کے وہ مراعات فراہم کرنا جو سرکاری نمائندگی کا اختیار رکھنے والے افراد کو حاصل ہوتی ہیں ممکن اور معقول ہے، ایسے اراکین میں نمائندہ حیثیت مفقود ہونے کی وجہ سے، ان کے لئے ان کے کام کی ضروریات کے علاوہ کوئی ایسی بنیاد باقی نہیں رہتی جس پر وہ استثناء اور مراعات حاصل کر سکیں، لہذا مشن کے کام کو انجام دینے اور تسلیم شدہ

ایک بدیہی اور منطقی حقیقت یہی ہے کہ صلح جنگ اور سفارت امور کا انتظام بغیر سفیروں کے ممکن نہیں، اور ان سفیروں کو تحفظ دینا لازم ہے، تاکہ باہمی مفاہمت یا مقابلہ کی راہ ہموار ہو سکے۔

اس سلسلے میں رجوع کریں: الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الازھار مرجع سابق، ج ۴، ۵۶۰۔ السرخسی، المبسوط، مرجع سابق، ج ۱، ص ۹۳۔ دکتور عزالدین فودۃ، النظم الدبلوماسیۃ، مرجع سابق، ص ۵۔

ریاست میں انہیں تفویض کردہ کاموں کو انجام دینے کے قابل بنانے کے لئے جس حد تک تحفظ ضروری ہے، انہیں ان مقاصد کے حصول کے لئے فراہم کرنا ضروری ہوگا۔

اسی طرح معاصر بین الاقوامی قانون میں 1961 کے سفارتی تعلقات پر منعقد ویانا کنونشن میں طے شدہ اصول کے مطابق اکثر صورتوں میں تکنیکی ماہرین اور منتظمین کو وہی مراعات حاصل ہوں گی جو سفارت کاروں کو حاصل ہوتی ہیں(۴۲۶)، ان کی ملازمت کے تقاضوں نیز اسلامی ریاست اور تمام مسلمانوں کے مفادات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے اسلامی قانون کی تائید حاصل ہے، دوسرے لفظوں میں رضامندی کے اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے جو عصر حاضر میں دائمی اور عارضی باہمی سفارتی تعلقات بنیاد ہے۔ اسی طرح سفارتی مشن سے متعلق امور میں واقع ہونے والی تبدیلیوں اور اس کے مقاصد کی پیچیدگی کے پیش نظر ضروری ہے کہ مشن کے تمام اراکین بشمول سفارت کار وغیرہ کو مراعات حاصل ہوں تاکہ وہ تفویض کردہ کاموں کو انجام دینے کے قابل ہوسکیں، یہ تمام تفصیلات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ معاصر سفارتی قانون کی طرف سے وہ تکنیکی ماہرین، منتظمین اور نوکروں کو تحفظ فراہم کرنے کا طریقہ جس سے ان کے لئے اپنے فرائض کی انجام دہی ان کے اپنے مشن کے دائرہ میں آسان ہوجاتی ہے، اسلامی ریاست کے عمومی مصالے کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اسلامی شریعت کے ان عمومی احکام سے مطابقت رکھتا ہے جن کا ذکر قاصدوں اور سفیروں کے تحفظ سے متعلق وضاحت کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

۴۲۶- ویانا کنونشن برائے سفارتی تعلقات ۱۹۶۱ کے تحت ان احکام کا مطالعہ کیجئے جو سفارتی مشن کے انتظامی اور فنی عملے کو حاصل استثناءات سے متعلق ہیں، اور یہ دیکھئے کہ ان افراد کو دی جانے والی سفارتی مراعات کس حد تک مشن کے سفارتی اراکین کو حاصل مراعات کے مماثل ہے۔

خاتمہ

حالت امن میں اسلامی ریاست کے امور خارجہ ذرائع کو منظّم کرنے والے اصول وضوابط:

اشارہ کیا جاچکا ہے کہ اسلامی حکومت کی صورت حال اس سلسلے میں دوسری حکومتوں اور اداروں کی طرح ہے، جو اپنے خارجہ تعلقات کو جاری رکھنے اور منظّم کرنے کی خاطر متعدد ذرائع اور وسائل سے کام لیتی ہے، جن میں خصوصا مذاکرات اور معاہدے شامل ہیں، اس کے علاوہ اس مقصد کے حصول کے لئے قاصدوں اور سفراء کا تبادلہ نیز باہمی اور تجارتی واقتصادی لین دین کا طریقہ بھی اختیار کیا جاتا ہے، یہ بھی واضح کیا جاچکا ہے کہ اسلامی مملکت کو اپنے بیرونی تعلقات منظّم کرنے کے لئے شدت کے ساتھ ایسے ذرائع اختیار کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے جو اسلامی شریعت کی طرف سے فرد و جماعت کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر عائد کی گئی ذمہ داریوں کو ادا کرنے میں معاون ہوں تا کہ روئے زمین کی تمام اقوام سے مسلمانوں کا رابطہ ہو سکے اور اس کے نتیجہ میں اسلام کی دعوت پھیل سکے اور آخر کار پورے کرہ ارض میں ''اسلامی امن'' قائم ہو۔

پیش نظر تحقیقی مقالہ کے مباحث اور ذیلی ابواب کا جائزہ لینے سے درج ذیل کلیدی حقائق سامنے آتے ہیں۔

پہلی حقیقت:

پہلی حقیقت اس میں مضمر ہے کہ اسلامی ریاست کے بیرونی معاملات کے ذرائع شرعی قانون کے وضع کردہ اصولوں اور احکام کے تحت چلتے ہیں، ان ذرائع کا قانونی جواز، اسی طرح ان کے انتظام واستعمال کی راہ ہموار کرنے والے اصول وضوابط کی تفصیل اور ان جہات کی

تعیین جن کے ساتھ اسلامی ریاست کی طرف سے ان ذرائع کا تبادلہ ہوسکتا ہے سب کے سب شرعی حدود کے تابع ہوتے ہیں، اس کی وضاحت یوں ہوسکتی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے غیر مسلموں سے تعلقات کی بنیاد ''دعوت'' پر ہونی چاہئے، جس کا تقاضا ہے کہ امن کے دائرہ کو وسعت دی جائے، دوسرے الفاظ میں اسلامی مملکت کے خارجی امور کے حوالے سے پرامن ذرائع کی ضرورت کو مستحکم کیا جانا چاہئے، نتیجتاً پورے عالم کے غیر مسلموں تک اسلام کی دعوت پہنچانے اور بغیر کسی دباؤ یا جبر کے انہیں احکام شریعت سے باخبر کرنے کی جو ذمہ داری اسلامی ریاست پر عائد ہوتی ہے، اس کے اولین تقاضے کی صورت میں ان پرامن ذرائع کا سہارا لینا فرض ہوگا جو حکمت اور اچھی تبلیغ سے شروع ہو کر قاصدوں اور مبلغین کو بھیجنے نیز توضیح ورہنمائی کی غرض سے دوسرے فریق کے ساتھ مذاکرات میں شامل ہونے پر ختم ہوگا اور آخر کار فریقین کے مابین معاہدے اور سمجھوتے طے پائیں گے، اس کے علاوہ اسلامی ریاست کے عمومی مصالح کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسروں کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی لین دین میں شمولیت کا موقع ملے گا، ساتھ ہی دعوت کی اشاعت اور دوسروں تک اس کی منتقلی کی ذمہ داری بھی ادا ہوگی، یا غیر مسلموں کے ساتھ مصنوعات اور دیگر سامانوں کے تبادلہ کا سلسلہ شروع ہوگا، یہاں یہ حقیقت مدنظر رہے کہ غیر مسلم جن کو اسلام کی دعوت پیش کی گئی ہے وہ اگر اسلام میں داخل ہونے سے انکار کردیں مسلمانوں سے کسی طرح کی عداوت کئے بغیر تو پھر شرعی طور پر اسلامی مملکت کے لئے گنجائش نہیں رہ جاتی کہ وہ کسی ایسے ذریعہ کا سہارا لے جو پرامن ذرائع کے دائرہ سے باہر ہو، اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی ریاست کے بیرونی تعلقات سے متعلق مقاصد کے حصول کے لئے پرامن ذرائع کے استعمال کی ضرورت، اہمیت اور کتنی زیادہ ہے اس کے علاوہ دعوت کو مسلمانوں کے دوسروں کے ساتھ تعلقات کی بنیاد قرار دے کر اور اسلامی ریاست کے بیرونی تعلقات میں پر امن ذرائع کا استعمال کر کے معاملات کو آگے بڑھانا بھی ضروری ہے، کیونکہ اسلامی ریاست کے

حکمرانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے خارجہ تعلقات کو مقررہ اور مستحکم اصولوں کے مطابق منظّم کریں، جن میں اسلامی ریاست کے بیرونی معاملات میں پر امن ذرائع کے استعمال کو منظّم کرنے سے متعلق بہت سے ضابطے اور حدود و قیود شامل ہیں۔

پہلی جہت سے یہ چیز یوں ظاہر ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کے درمیان مساوات اور انصاف کے اصولوں کی رعایت اسلامی مملکت کے حکمرانوں سے اس چیز کا تقاضا کرتی ہے کہ وہ روئے زمین کے مختلف حصوں میں قاصدوں اور سفراء کو بھیجیں، اور اس سلسلے میں ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں، اس لئے عہد نبوی سے لے کر خلفاء راشدین تک تواتر سے یہ سلسلہ چلا آ تا رہا ہے کہ قریب اور دور کے ممالک تک مبلغین اور سفراء بھیجے جاتے تھے، جن کا مقصد اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کے دائرہ میں سفراء اور قاصدین کے تبادلے کی ضرورت واہمیت کے پیش نظر دعوت کی اشاعت اور غیر مسلموں کو اسلامی احکام سے متعارف کرانا ہوتا تھا، اسلامی شریعت کے اصولی مصادر چاہے قرآن ہو یا سنت تواتر کے ساتھ غیر ملکی سفیروں کے تحفظ کے حوالے سے مستحکم بین الاقوامی اصولوں کو مضبوط کرنے، انہیں ہر طرح کے اعزاز سے سرفراز کرنے اور ان کی حفاظت پر زور دیتے ہیں جن سے ان کے لئے سپرد کردہ کاموں کو بہترین ممکنہ طریقہ پر انجام دینا آسان ہوجاتا ہے، باوجودیکہ دائمی یا رہائش پذیر سفارتی نمائندوں کا تبادلہ اسلامی مملکت کے پہلے ادوار تک بین الاقوامی برادری میں معروف نہیں تھا، مگر اسلامی شریعت کے عمومی احکام مسلمانوں کے لئے اس نوعیت کی خارجہ نمائندگی کی ضمانت دیتے ہیں، اسی طرح ان میں وسعت کے ساتھ سفارتی نمائندوں کے مکانات اور ان کی ذیلی عمارتیں نیز ان میں کام کرنے والے تمام ارکان کو ضروری تحفظ فراہم کیا گیا ہے تاکہ یہ سب اپنے کام کو بہتر طریقہ پر انجام دے سکیں، جس کی بنیاد شریعت کے اس فیصلہ پر ہے کہ نجی گھروں کا تقدس ملحوظ رکھا جائے۔

دوسری جہت سے یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اقتصادی معاملات اور تجارتی لین دین اسلامی شریعت کے عمومی احکام کے دائرہ میں خصوصی اہمیت کے حامل رہے ہیں، چاہے اس نقطہ نظر سے کہ ان سرگرمیوں کی وجہ سے دعوت کی تبلیغ اور ممالک اور گروہوں کے درمیان عقائد کے اختلاف کے باوجود تعلقات مضبوط ہوں، یا اس وجہ سے کہ ان سرگرمیوں کے نتیجے میں غیر مسلموں کے ساتھ سامانوں اور مصنوعات کا تبادلہ ہو، اور اس سے اسلامی ممالک کو عمومی فائدہ حاصل ہو۔

تاہم اسلامی مملکت کے ذریعہ خارجہ تعلقات کے میدان میں انجام دی جانے والی اقتصادی اور تجارتی سرگرمیاں اپنی حقیقت اور دائرہ کار کے لحاظ سے ان عمومی قواعد وضوابط کی پابند ہیں جس پر اسلامی شریعت نے بہت زور دیا ہے، ان قواعد کا پہلا حصہ یہ ہے کہ تجارتی اور اقتصادی تعلقات کے تبادلے میں اسلامی گروہوں اور ممالک کو ترجیح دی جائے، جبکہ امت اسلامیہ جیسا کہ موجودہ صورتحال ہے، متعدد ممالک اور دھڑوں میں تقسیم ہوچکی ہو، اس کے بالمقابل غیر اسلامی گروہوں اور ممالک کے ساتھ ان تعلقات کا قیام اور ان کے دائرہ کار کی توسیع صرف اور صرف حسب ضرورت ہو، نیز مسلمانوں کی ضروریات کی تکمیل اور ان کے امور کو منظّم کرنے سے متعلق عمومی مصالح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہو، اس سے یہ حقیقت وابستہ ہے کہ مسلمانوں کے عمومی مفاد کی تکمیل غیر مسلموں کے ساتھ تجارتی معاملات اور اقتصادی لین دین کے شرعی جواز میں بنیاد شرط کی حیثیت رکھتی ہے، اس کے علاوہ اس طرح کے لین دین اور معاملات میں جواز کے پہلو کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، خصوصاً جب معاملہ سودی لین دین یا شرعی طور پر حرام قرار دیئے گئے سامان کے تبادلہ، یا تجارتی لین دین کے استحکام اور سرمایہ کاری کے منصوبوں کی خاطر غیر مسلموں کے مقدس مقامات میں داخلہ سے متعلق ہو، اگر ایک طرف پرامن حالت میں اسلامی مملکت کے بیرونی معاملات کے لئے اقتصادی اور تجارتی تبادلے سب سے اہم ذریعہ ہیں، اسی

طرح موجودہ دنیا سائنسی اور زبردست تکنیکی ترقیات اوران کے نتیجہ میں مختلف ممالک اور سماجوں کے مابین فاصلوں کے کم ہونے اوراعتماد بڑھنے کی وجہ سے سامانوں اور مصنوعات کے تبادلہ کی ایک منڈی بن چکی ہے باوجودیکہ سماجی حالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور بازار میں معاملہ کرنے والے یونٹس اور ممالک کا اقتصادی معیار بھی ایک دوسرے سے الگ ہے، اس کے علاوہ ان بازاروں میں بڑے بڑے اقتصادی بلاکس قائم ہیں، اوران حالات وقواعد میں بھی برابری کا فقدان ہے جن کی بنیاد پر تبادلہ ہوتا ہے، تو دوسری طرف اسلامی شریعت کے عمومی احکام اسلامی مملکت کے حکمرانوں پر غیر اسلامی ریاست کے ساتھ فریق کی حیثیت سے معاشی اور تجارتی تبادلوں میں شامل ہونے کے لئے معاملات کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ ساتھ حکمرانوں کو یہ ترغیب بھی دیتی ہے کہ وہ ایک ایسی اقتصادی یونٹ کے قیام کی خاطر کوشاں رہیں، جوان کی حکومت کے لئے سرگرم مثبت کردار ادا کرنے کی ضامن ہو، اور جس کے نتیجہ میں ان تمام ترقیات کے درمیان بالآخر ایک ایسا معاشی نظام قائم ہو جو سب کو انصاف دے، اسلامی ممالک کے درمیان ایک ایسی اقتصادی یونت کا قیام اور موجودہ بین الاقوامی اقتصادی نظام میں رائج ناانصافیوں کی اصلاح اسلامی قانون کی طرف سے اسلامی ریاست پر عائد خیر وتقوی کے کاموں میں تعاون، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے متعلق فرض کی تعمیل ہے۔

تیسری جہت: اگر ایک طرف اسلامی شریعت کے عمومی احکام غیر مسلموں کے ساتھ مذاکرات کی اہمیت اور شرعی حیثیت پر زور دیتے ہیں، چاہے یہ کام دعوت اسلامی کی نشر واشاعت کے دائرہ میں باہمی تبادلہ خیال کی غرض سے ہو یا شرعی احکام کی وضاحت اور مدمقابل کو قائل کرنے کی غرض سے ہو، یا ان دوسرے مسائل کو حل کرنے کے لئے ہو جو غیر مسلموں کے ساتھ انسانی زندگی کے کسی بھی میدان میں تعلقات استوار کرنے سے متعلق ہوں، دوسری طرف مسلم مذاکرات کار کے لئے تمام قابل عمل مذاکراتی مرحلوں میں ضروری ہے کہ وہ اس سلسلے میں شریعت

کے عمومی احکام کے تقاضوں کی رعایت کرے، جیسے کہ بنیادی اقدار پر استقامت، اور اسلام اور مسلمانوں کے اہم مصالح میں عدم تساہل، مقصد اور ذرائع دونوں کو ایک ساتھ ملحوظ رکھنے کی بھرپور کوشش، کیونکہ دونوں جہتیں باہم مربوط ہیں، اور دونوں کا حکم ایک ہی ہے۔ اس کے علاوہ مسلمان مذاکرات گفتگو میں نیک نیتی کے اصول کے تقاضوں کو مدنظر رکھے گا، اور فطری طور پر مذاکراتی عمل سے متعلق معاملات میں جیسے کہ ثانوی یا ان امور میں جو اسلامی مملکت کے بنیادی مصالح اور اعلی اقدار کو نقصان نہ پہنچاتے ہوں مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے باہمی رعایت یا درمیانی حل کے طریقہ پر عمل کرے گا۔

چوتھی جہت سے گذشتہ تفصیلات میں یہ اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر اسلامی ممالک کے ساتھ مذاکرات کے نتیجہ میں عام طور پر معاہدے طے پاتے ہیں، یہاں تک کہ معاہدوں کو اسلامی مملکت کے خارجہ معاملات میں ایک اہم ذریعہ کی حیثیت حاصل ہے، اس سلسلے میں شریعت نے متعدد ایسے احکام وضوابط دیئے ہیں جن میں اتنی وسعت ہے کہ شرعی قانون کے مطابق معاہدہ یا معاہدے پر رضامندی درست ہے، یعنی ان معاہدوں سے یا تو مسلمانوں کو فائدہ پہنچے یا ان سے نقصانات دور ہوں، ساتھ ہی معاہدہ کی مدت چاہے عارضی ہو یا مستقل ہو، اس سے متعلق شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں کی رعایت ملحوظ رہے، اس کے علاوہ بھی اسلامی شریعت میں قواعد وضوابط ہیں، جن سے معاہدوں کے انعقاد کو منظّم کیا جاسکتا ہے، لہذا جب معاہدہ کے ارکان و شرائط مکمل ہوجائیں تو اسلامی مملکت کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاہدہ کے تحت عائد تمام ذمہ داریوں کو پورا کرے، معاہدوں کو پورا کرنے اور اس کے احترام کے ان اصولوں پر گامزن رہتے ہوئے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان معاہداتی تعلقات کی تنفیذ اور قیام میں بنیادی پتھر کی حیثیت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ غیر مسلموں کے ساتھ کئے گے معاہدوں کی پاسداری اسلامی اخوت کی پاسداری پر مقدم سمجھی گئی ہے، اور اس کے ضمن میں مسلمانوں کے درمیان تعاون اور

امداد باہمی کا جو سلسلہ جاری رہتا ہے اس پر بھی اسے ترجیح حاصل ہے، یہاں تک کہ جن معاہدوں کی پاسداری واجب ہے اگر ان کی خلاف ورزی کی گئی تو اسے اسلامی شریعت کے کلی اور عمومی اصولوں میں سے ایک اصل کی خلاف ورزی قرار دیا جائے گا۔

دوسری حقیقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس تحقیق کے تمام مباحث اور اس کی تفصیلات پر غور وفکر کا ماحصل یہ ہے کہ اگر ایک طرف اسلامی شریعت کی طرف سے متعین کردہ حدود وضوابط کے مطابق اسلامی مملکت اور غیر اسلامی مملکت کے باہمی تعلقات میں مذکورہ پر امن ذرائع کا استعمال کرنا واجب ہے تو دوسری طرف خود اسلامی مملکتوں کے باہمی تعلقات کو استوار اور منظّم کرنے کی خاطر ان ذرائع سے کام لیا جانا یہ زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے، بلکہ اسلامی شریعت کے عمومی احکام کی صورت میں موجود یکساں مشترکہ ماخذ کو پیش نظر رکھا جائے تو ان ذرائع کا استعمال اس طرح کے حالات میں لازمی طور پر آسانی اور لچک کے بہت سے پہلو سامنے لائے گا، اور اس طرح ان ذرائع کے استعمال سے بالآخر اسلامی ممالک انظام اور اتحاد کی اپنی اصل پوزیشن بحال کرنے کے قابل ہوں گے۔

اس جائزہ کے تمام مباحث اور اس کے فروعی حصوں سے ایک تیسری حقیقت سامنے آتی ہے کہ موجودہ بین الاقوامی نظام اور بین الاقوامی قانونی قواعد جن پر بین الاقوامی برادری بشمول اسلامی ممالک، کا اتفاق ہو چکا ہے کے تحت اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں پر امن ذرائع کے استعمال میں عملی طور پر زیادہ علمی دشواریوں کا سامانا نہیں کرنا پڑتا- اس کا سبب یہ ہے کہ خارجی لین دین میں مذکورہ مصالحتی ذرائع کے استعمال کو منظّم کرنے کی بابت عام بین الاقوامی قانونی قواعد اور معاصر بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں رائج رجحانات کم یا زیادہ شریعت کے طے کردہ ایسے حدود وضوابط سے ہم آہنگ ہیں جو ان ذرائع سے متعلق ہیں جنہیں اسلامی ریاست کی طرف سے غیر اسلامی ممالک سے تعلقات میں استعمال کیا جاتا ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات میں مذاکرات کے جواز نیز مذاکراتی عمل سے متعلق قواعد سازی اور اس مسئلہ کے حوالے سے مسلم مذاکرات کی ذمہ داریوں کی وضاحت، یہ سارے احکام بڑی حد تک بین الاقوامی تعلقات میں مذاکرات کے عمومی نظریات سے اور بین الاقوامی انون کے ان احکام سے ہم آہنگ ہیں جن کا تعلق مذاکرات کے دوران مذاکرات میں شریک تمام فریقوں کی ذمہ داریوں کے تعین سے ہے، اسی طرح ان مذاکرات کے نتیجہ میں طے پانے والے سمجھوتوں اور معاہدوں سے بھی وہ مطابقت رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی تعلقات کے سلسلے میں مذاکرات کا عمومی نظریہ اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ مذاکرات کے موضوع، وقت اور جگہ نیز مذاکراتی عمل میں شریک ہر فریق کی طرف سے اپنے ملک کے اعلی مقاصد اور بنیادی مصالح پر قائن رہتے ہوئے ایک دوسرے کو دی جانے والی رعایتیں یا درمیانی حل کا تعین واران کا فیصلہ عام حالات میں تمام فریقوں کے درمیان مصالح کے توازن اور روابط کو پیش نظر رکھ کر کیا جاتا ہے، اسی طرح بین الاقوامی قانون کی دفعات مذاکراتی فریقوں کو اس بات کی ترغیب دیتی ہیں کہ مذاکرات میں حسن نیت پر کار بند رہا جائے، اور ان کے نتیجہ میں جو عمومی معاہدہ یا بین الاقوامی سمجھوتہ طے پائے اس کی تمام تر ذمہ داریوں کی پاسداری کی جائے۔ یہ ساری چیزیں مذاکرات کی بابت اسلامی شریعت کے ان عمومی احکام سے ہم آہنگ ہیں جن کا تعلق اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات کی خاطر طے شدہ مقاصد کی تکمیل کے پرامن ذرائع سے ہے، اگرچہ شرعی قانون اس سلسلے میں اس بنا پر ممتاز ہے کہ وہ مسلم مذاکرات کار پر یہ لازم کرتا ہے کہ وہ مذاکرات کے ان مقاصد تک رسائی حاصل کرنے کی غرض سے اختیار کئے جانے والے وسائل وذرائع کے درمیان ربط ملحوظ رکھے جو حیلے اور حربے اختیار کرتا ہے ان کے درمیان جوڑ پیدا کرے، کیونکہ ایسی صورت میں اس پر ضروری ہوجاتا ہے کہ دونوں پہلوؤں میں جواز کو پیش نظر رکھے، ورنہ اس کا طریقہ کار عدم جواز پر مبنی سمجھا جائے گا اور وہ جواب دہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں

درج ذیل اصولی قاعدہ پر عمل کیا جائے گا: ''ذرائع کا بھی وہی حکم ہے جو مقاصد کا ہے''۔

اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قانون میں مذاکرات اور ان کے احکام وقواعد سے متعلق ہم آہنگی کی مذکورہ تفصیل زیادہ قوت کے ساتھ اسلامی ریاست کے خارجہ تعلقات میں نمائندوں اور سفراء کے تبادلہ پر منطبق ہوتی ہے، کیونکہ وہ نمائندوں اور سفراء کا تبادلہ یا اگر آپ چاہیں تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ دائمی یا عارضی نمائندوں کا تبادلہ ایک عملی ضرورت ہے جو شریعت کی نگاہ میں ان ذرائع میں سے ایک اہم ذریعہ ووسیلہ ہے جنہیں اسلامی مملکت کے خارجہ تعلقات اور لین دین سے وابستہ مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور احکام شریعت اور بین الاقوامی قانون کی ہم آہنگی قاصدوں اور سفارت خانوں کے تبادلہ کے سلسلے میں بالکل واضح ہے، جس میں اسلامی اصول-قرآن وحدیث-تواتر کے ساتھ بین الاقوامی عرف واصول کو مستحکم کرنے پر زور دیتے ہیں بالخصوص ان امور میں جن کا تعلق قاصدین اور ایلچی حضرات کو دیئے جانے والے ضروری تحفظ نیز ہر طرح ان کی تکریم، اور اس حد تک ان کی حفاظت سے ہے کہ وہ پسندیدہ طریقے پر اپنی مفوضہ ذمہ داریوں کو انجام دے سکیں۔

اگر ایک طرف یہ حقیقت ہے کہ دائمی سفارتی نمائندگی کی صورت کا معاملہ نہ عہد رسالت میں معروف تھا اور نہ عہد خلافت راشدہ میں، پھر بھی شریعت کے عمومی احکام جن میں ''نجی مکانات'' کا احترام ملحوظ رکھنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان میں رہائش پذیر افراد کی اجازت کے بغیر داخلہ کو ممنوع قرار دیا گیا ہے دائمی غیر ملکی نمائندوں کی عمارتوں اور ان کے تمام سفراء کے لئے احترام اور ان ضروری حفاظتی تدابیر کے ضامن ہیں جو انہیں بہتر طریقے پر مفوضہ کاموں کو انجام دینے کے قابل بنائیں۔

معاہدات اور باہمی اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے حوالے شرعی احکام اور بین الاقوامی قانون کے احکام کے درمیان ہم آہنگی کا دائرہ بہت حد تک تنگ ہو جاتا ہے، بایں طور کہ

یہ دونوں چیزیں پر امن حالت میں اسلامی مملکت کے خارجی لین دین کے ذرائع کے ضمن میں بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں، اس کی وجہ ان ذرائع کے استعمال کی صورت میں شرعی قانون کی طرف سے اسلامی ریاست کے مقتدر افراد پر عائد کردہ ذمہ داریوں کی نوعیت ہے، لہذا کسی ایسے معاملہ میں معاہدہ ممنوع ہے جو شریعت کے عمومی احکام کے تقاضوں سے ٹکراتا ہو، جیسا کہ مقتدر حضرات کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاہدہ کی ابتداء، انتہاء اور اس کی مدت کی تعیین کہ وہ عارضی ہے یا دائمی کے سلسلے میں شرعی احکام کے تقاضوں کی رعایت کریں، اسی طرح اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے تبادلہ کا فیصلہ بھی ان عمومی قواعد کی روشنی میں ہوگا جس کی تعیین شریعت نے کی ہے، چاہے معاملہ کا تعلق اس طرح کے تبادلوں کے موضوع سے ہو، یا متعلقہ فریقوں سے، یا اس ذمہ داری سے جو اسلامی مملکت پر بین الاقوامی اقتصادی نظام ککی طرف سے تمام انسانوں کے لئے ایک منصفانہ اور عادلانہ نظام کے قیام اور مساوی تعلقات کی داغ بیل ڈالنے کی خاطر کی جانے والی کوششوں کو منظّم کرنے کے لئے عائد کی گئی ہو۔

سچی بات یہ ہے کہ منطقی اور طبعی طور پر، جیسا کہ دوران تحقیق میں محسوس کیا گیا کہ احکام شریعت اور بین الاقوامی قانون کے احکام کے درمیان ہم آہنگی کا دائرہ مذاکرات اور سفارتی نمائندوں کے تبادلے کے متعلق وسیع ہونا چاہئے، اور یہ دائرہ اقتصادی تعلقات کے تبادلے اور معاہدوں کے انعقاد کے سلسلے میں تنگ ہونا چاہئے، جس کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے کہ گذشتہ چار ذرائع کی ماہیت پر غور وفکر سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے پہلے دو ذرائع یعنی سفارتی نمائندوں کا تبادلہ اور مذاکرات حقیقت میں اور عمومی حالات میں اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ یہ دونوں دوسرے دو ذرائع تک پہنچنے کا ذریعہ ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ مذاکرات اور قاصدوں اور سفراء کے ذریعہ عام حالات میں تبادلہ سے معاہدوں کے انعقاد اور تجارتی واقتصادی تعلقات کے قیام اور ترقی میں مدد لی جاتی ہے، جس کے نتیجہ میں فطری طور پر ان تمام حدود اور ضوابط کا دائرہ

وسیع ہوجائے گا جنہیں شریعت نے اسلامی مملکت کے لئے خارجہ تعلقات کے ذرائع کے ضمن میں تجارتی اور اقتصادی لین دین اور معاہدوں کے استعمال کو منظّم کرنے کے لئے وضع کیا ہے۔

یہ ساری تفصیلات آخری تجزیہ میں ایک چوتھے ذریعہ پر زور دیتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ پرامن حالات میں اسلامی مملکت کے خارجی لین دین کے ذرائع، کم یا زیادہ معاصر بین الاقوامی تعلقات اور بین الاقوامی قانون میں اپنے ہم جنس ذرائع سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے میں شامل اور ایک دوسرے کے لئے تکمیلی ذرائع ہونے کی خصوصیت رکھتے ہیں، یہاں تک کہ ان میں سے کچھ اسلامی مملکت کی اپنے خارجہ تعلقات کے بنیادی اور بلند مقاصد کی تکمیل کی کوششوں کے عمومی تناظر میں دوسروں تک پہنچنے کا ذریعہ بنتے ہیں، اس لئے معاہدوں کے انعقاد، اقتصادی اور تجارتی تعلقات کے قیام اور ان کی ترقی کا راست تقاضا ہے کہ قاصدوں اور سفارتوں کے تبادلے کے تقاضوں کے ضمن میں کہ سفیر یا قاصد لازمی طور پر پہلے درجہ کا مذاکرات کار ہو، ساتھ ہی اس میں ان صفات اور صلاحیتوں کا ہونا بھی ضروری ہے جو اسے ایک اسلامی مملکت کی نمائندگی کا اور مکمل طور پر اس کے مصالح کے تحفظ کا اہل بنادیں، جبکہ مذاکرات کار کی حقیقت بس اتنی ہے کہ وہ ایک ایسا نمائندہ ہوتا ہے جسے اسلامی مملکت کی طرف سے خارجہ تعلقات کے لئے متعین کردہ عمومی مقاصد کے دائرہ میں طے شدہ اہداف کی تکمیل کے لئے بھیجا جاتا ہے۔

☆☆☆

مراجع

۱-احمد ابوالوفا محمد، القانون الدبلوماسی الاسلامی (القاہرۃ، دارالنہضۃ العربیۃ، ط۱، ۱۹۹۲ء)۔

۲-احمد ابوالوفا محمد، المعاہدات الدولیۃ فی الشریعۃ الإسلامیۃ، (القاہرۃ: دارالنہضۃ العربیۃ، ط۱، ۱۹۹۰ء)۔

۳-احمد زینی دحلان،، السیرۃ النبویۃ والآثار المحمدیۃ (بیروت، دارالمعرفۃ، ط۲، ۱۹۸۰ء)۔

۴-احمد عبدالونیس شتا، تطویر المجلس الاقتصادی والاجتماعی لمنظمۃ الأمم المتحدۃ (القاہرۃ: الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۸۹ء)۔

۵-احمد محمد احمد، الجانب السیاسی فی حیاۃ الرسول ﷺ، (الکویت: دارالقلم، ط۱، ۱۹۸۲ء)۔

۶-اسامۃ الباز، المفاوضات السیاسیۃ: دراسۃ حالۃ مفاوضات السلام المصریۃ- الأسرائیلیۃ (ندوۃ معہد الدراسات الدبلوماسیۃ، الریاض، ۱۹۹۳ء)۔

۷-ابن الأثیر، الکامل فی التاریخ (القاہرۃ: المطبعۃ الازہریۃ، ط۱، ۱۳۰۱ھ)۔

۸-الآلوسی، روح المعانی فی تفسیر القرآن والسبع المثانی (القاہرۃ: المطبعۃ المنیریۃ، ۱۳۴۵ھ)۔

۹-البخاری، صحیح البخاری (المدینۃ المنورۃ، دارالفکر، ۱۳۹۱ھ)۔

۱۰-البرہان نوری، کنز العمال فی سنن الأقوال والأفعال، تحقیق بکر حیانی، (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ۱۹۷۹ء)۔

۱۱-البلاذری، فتوح البلدان، (تعلیق) رضوان محمد رضوان (القاہرۃ، مطبعۃ السعادۃ، ۱۹۵۹ء)۔

۱۲-البہوتی، کشف القناع عن متن الاقناع (القاہرۃ، مطبعۃ السنۃ المحمدیۃ، ۱۹۴۷ء)۔

۱۳-البیہقی، السنن الکبری (حیدرآباد الدکن: مجلس دائرۃ المعارف النظامیۃ، ۱۳۵۳ھ)۔

۱۴-السبکی ،طبقات الشافعیۃ الکبری (القاہرۃ،البابی الحلبی ،۱۹۶۷)۔
۱۵-ابن تغری بردی،النجوم الزاہرۃ فی معرفۃ ملوک مصر والقاہرۃ (القاہرۃ: وزارۃ الثقافۃ والأرشاد القومی،د۔ت)۔
۱۶-ابن تیمیہ، القواعد النورانیۃ الفقہیۃ، تحقیق محمد حامد الفقی ، (القاہرۃ:مکتبۃ السنۃ المحمدیۃ، ۱۳۷۰ھ)۔
۱۷-ابن تیمیۃ ،مجموع الفتاوی الکبری (القاہرۃ: دار الرحمۃ للنشر والتوزیع،د۔ت)۔
۱۸-جعفر عبد السلام،قواعد العلاقات الدولیۃ فی القانون الدولی وفی الشریعۃ الاسلامیۃ (القاہرۃ: مکتبۃ السلام العالمیۃ،ط۱،۱۹۸۱)۔
۱۹-ابن جماعۃ،تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام،(تحقیق) فواد عبد المنعم (الدوحۃ،رئاسۃ المحاکم الشرعیۃ والشؤن الدینیۃ،ط۲،۱۹۸۷ء)۔
۲۰-جمال الدین عطیۃ، النظریۃ العامۃ للشریعۃ الإسلامیۃ (المدنیۃ:مطبعۃ المدینۃ،ط۱، ۱۹۸۸ء)۔
۲۱-الجوینی،غیاث الأمم فی التیاث الظلم،تحقیق محمد خلیل الطویل،(جامعۃ الأزہر: رسالۃ دکتوراہ مقدمہ إلی کلیۃ الشریعۃ والقانون،۱۹۷۵ء)۔
۲۲-ابن حجر العسقلانی، فتح الباری بشرح صحیح البخاری (القاہرۃ:مطبعۃ البابی الحلبی ،۱۹۵۹ء)۔
۲۳-الحسن بن عبداللہ،آثار الأول فی ترتیب الدول (القاہرۃ،۱۳۹۵ھ)۔
۲۴-الخطابی،معالم السنن (بیروت: دار الکتب العلمیۃ ۱۹۸۱ء)۔
۲۵-ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون کتاب العبر ودیوان المبتدأ والخبر (بیروت، دار الکتاب اللبنانی،۱۹۶۸ء)۔
۲۶-ابن خلکان، وفیات الأعیان،تحقیق أحسان عباس (بیروت: دار الثقافۃ،۱۹۷۱ء)۔

۲۷-الرازی، التفسیر الکبیر (القاہرۃ، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۴۸ء)۔
۲۸-ابن رشد القرطبی، بدایۃ المجتہد ونہایۃ المقتصد، تحقیق محمد محمد سالم محیسن، محمد شعبان اسماعیل، (القاہرۃ: مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ، ۱۹۷۴ء)۔
۲۹-ابن رشد، المقدمات الممہدات (القاہرۃ: د، ت، ۱۳۲۶ھ)۔
۳۰-الزمخشری، الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل وعیون الأقاویل فی وجوہ التأویل (القاہرۃ: مطبعۃ الأستقامۃ، ط۱، ۱۳۶۵ھ)۔
۳۱-الزیلعی، نصب الرایۃ الأحادیث الہدایۃ (نیودلہی، مطبوعات المجلس العمی بالہند، ۱۹۳۸ء)۔
۳۲-السرخسی، شرح السیر الکبیر للشیبانی، تحقیق صلاح الدین المنجد، (القاہرۃ: معہد المخطوطات العربیۃ، ۱۹۷۲ء)۔
۳۳-السرخسی، المبسوط (بیروت: دار المعرفۃ، ط۲، د۔ت)۔
۳۴-ابن سعد، الطبقات الکبری (بیروت: دار صادر، د۔ت)۔
۳۵-ابوالسعود، تفسیر ابوالسعود: أرشاد العقل السلیم إلی مزایا القرآن الکریم (بیروت: دار احیاء التراث العربی، ۱۹۸۰ء)۔
۳۶-سعید حوی، الأسلام (القاہرۃ، مکتبۃ وہبۃ، ۱۹۷۷ء)۔
۳۷-سید قطب، فی ظلال القرآن (القاہرۃ، بیروت: دار الشروق، ط۱۰، ۱۹۸۲ء)۔
۳۸-السیوطی، أسباب النزول، (القاہرۃ: کتاب الجمہوریۃ، د۔ت)۔
۳۹-السیوطی، الجامع الصغیر من حدیث البشیر النذیر، (تحقیق) ناصر الألبانی (بیروت، المکتب الاسلامی، ۱۹۸۲)۔
۴۰-شارل روسو، القانون الدولی العام، (ترجمۃ) شکر اللہ خلیفۃ، عبد المحسن سعید (بیروت، الأہلیۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۸۲ء)۔

۴۱-الشاطبی، الموافقات فی أصول الأحکام، تعلیق حسنین محمد مخلوف،(دمشق:دارالفکر، ۱۹۸۰ء)۔
۴۲-الشافعی،الأم(القاہرۃ:المطبعۃ الأمیریۃ،۱۳۲۱ھ)۔
۴۳-الشنقیطی، أضواء البیان فی إیضاح القرآن بالقرآن(الریاض:الرئاسۃ العامۃ لأرادۃ البحوث العلمیۃ والافتاءوالدعوۃ والارشاد، ۱۹۸۳ء)۔
۴۴-الشوکانی، السیل الجرار المتدفق علی حدائق الأزہار،تحقیق محمد ابراہیم زاید(بیروت:دار الکتب العلمیۃ،ط۱،۱۹۸۵ء)۔
۴۵-الشوکانی،نیل الأوطار(بیروت:دارالکتب العلمیۃ ۱۹۸۵ء)۔
۴۶-الشیرازی،المہذب(القاہرۃ:البابی الحلبی، ۱۳۴۳ھ)۔
۴۷-صبحی محمصانی، القانون والعلاقات الدولیۃ فی الإسلام(بیروت:دار العلم للملایین، ۱۹۷۲ء)۔
۴۸-صلاح الدین المنجد، النظم الدبلوماسیۃ فی الإسلام(بیروت، دار الکتاب الجدید،ط۱، ۱۹۸۳ء)۔
۴۹-الصنعانی،سبل السلام،تحقیق طہ عبدالرؤف سعد(القاہرۃ،مکتبۃ الجمہوریۃ،۱۹۷۷ء)۔
۵۰-الطبرسی،مجمع البیان فی تفسیر القرآن(بیروت،دارالمعرفۃ،۱۹۸۶ء)۔
۵۱-الطبری،تاریخ الطبری:تاریخ الأمم والملوک(القاہرۃ:دارالمعارف،ط۲،۱۹۸۶ء)۔
۵۲-عبدالحق الشکیری، التنمیۃ الاقتصادیۃ فی المنہج الاسلامی،(قطر،کتاب الأمۃ،عدد ۱۷،ط۱، ۱۹۸۸ء)۔
۵۳-عبداللہ الشرقاوی،فتح المبدی(القاہرۃ،الہیئۃ العامۃ لشؤن المطابع الأمیریۃ،د۔ت)۔
۵۴-ابن عبدربہ،العقد الفرید،تحقیق سعید العریان(القاہرۃ،المطبعۃ التجاریۃ،۱۹۵۳ء)۔

۵۵-ابن العربی، أحکام القرآن، تحقیق علی محمد البیجاوی (القاہرۃ: دار احیاء الکتب العربیۃ، ط۱، ۱۹۵۷ء)۔
۵۶-عبدالغنی عبدالحمید، التمثیل السیاسی فی احکام القانون الدولی العام مقارنا بالشریعۃ الأسلامیۃ (جامعۃ الأزہر، رسالۃ ماجستیر بکلیۃ الشریعۃ والقانون، ۱۹۸۰ء)۔
۵۷-عبدالغنی محمود، التحفظ علی المعاہدات الدولیۃ فی القانون الدولی والشریعۃ الاسلامیۃ (القاہرۃ: دارالنہضہ العربیۃ، ۱۹۸۶ء)۔
۵۸-عبدالقادر عودۃ، التشریع الجنائی الاسلامی (بیروت، دارالکتب العربی، ۱۹۶۰ء)۔
۵۹-عبد الکریم زیدان، احکام الذمیین والمستأمنین فی دار الإسلام، (بغداد: مکتبۃ القدس، ۱۹۸۲ء)۔
۶۰-عبد المنعم ماجد، التاریخ السیاسی للدولۃ العربیۃ، عصر الخلفاء الأمویین، (القاہرۃ: مکتبۃ الأنجلو المصریۃ، ط۷، ۱۹۸۲ء)۔
۶۱-عزالدین بن عبد السلام، قواعد الأحکام فی ترتیب مصالح الأنام، تحقیق طہ عبد الرؤف سعد، (القاہرۃ: مکتبۃ الکلیات الأزہریۃ، ۱۹۹۱ء)۔
۶۲-عزالدین فودۃ، النظم الدبلوماسیۃ (القاہرۃ، مکتبۃ الأداب، ط۲، ۱۹۸۹ء)۔
۶۳-أبوعبید القاسم بن سلام، الأموال (تحقیق) محمد خلیل ہراس (القاہرۃ، دار الفکر، ط۲، ۱۹۷۵ء)۔
۶۴-علی صادق ابوہیف، القانون الدبلوماسی والقنصلی (السکندریۃ، منشأۃ المعارف، ۱۹۶۷ء)۔
۶۵-علی بن ابی طالب، نہج البلاغۃ، شرح ابن ابی الحدید، (القاہرۃ: البابی الحلبی، ۱۳۲۹ھ)۔
۶۶-عمر کمال توفیق، الدبلوماسیۃ الإسلامیۃ والعلاقات السلمیۃ مع الصلبیین (الأسکندریۃ، مؤسسۃ شباب الجامعۃ، ۱۹۸۶ء)۔

٦٧-عون الشریف قاسم، نشأۃ الدولۃ الإسلامیۃ علی عہد رسول اللہ ﷺ: دراسۃ فی وثائق العہد النبوی (القاہرۃ: دار الکتب الإسلامیۃ، ١٩٨١ء)۔
٦٨-الغزالی، المنقول من تعلیقات الأصول، تحقیق محمد حسن ہیتو (دمشق: دار الفکر، ١٩٨٠ء)۔
٦٩-ابن فارس، معجم مقاییس اللغۃ، تحقیق عبد السلام ہارون (بیروت، دار الفکر، ١٩٧٩ء)۔
٧٠-فاضل زکی محمد، الفکر السیاسی العربی الإسلامی بین ماضیہ وحاضرہ (بغداد: دار الطبع والنشر الأہلیۃ، ط١، ١٩٧٠ء)۔
٧١-فتحی عثمان، الحدود الإسلامیۃ البیرنظیۃ بین الاحتکاک الحربی والاتصال الحضاری (القاہرۃ، دار الکتاب العربی للطباعۃ والنشر، ١٩٦٦ء)۔
٧٢-ابن الفراء، رسل الملوک ومن یصلح للرسالۃ والسفارۃ، تحقیق صلاح الدین المنجد (بیروت: دار الکتاب الجدید، ١٩٧٢ء)۔
٧٣-ابو الفرج الجوزی القرشی، زاد المستنیر فی علم التفسیر (بیروت، المکتب الاسلامی، ١٩٨٤ء)۔
٧٤-ابن قدامہ، الشرح الکبیر (بیروت: دار الکتاب العربی، ١٩٨٣ء)۔
٧٥-ابن قدامہ، المغنی (بیروت: دار الکتاب العربی، ١٩٨٣ء)۔
٧٦-القرطبی، الجامع لأحکام القرآن (القاہرۃ: دار الکتاب العربی، ١٩٧٦ء)۔
٧٧-القلقشندی، صبح الأعشی فی صناعۃ الأنشا (القاہرۃ: المطبعۃ الأمیریۃ، ١٩٣١ء)۔
٧٨-ابن قیم الجوزیۃ، احکام اہل الذمۃ، تحقیق صبحی الصالح (بیروت: دار العلم للملایین، ١٩٨٣ء)۔
٧٩-ابن قیم الجوزیۃ، زاد المعاد فی ہدی خیر العباد، تحقیق شعیب الأرناؤوط، (بیروت: مؤسسۃ الرسالۃ، ١٩٨١ء)۔
٨٠-الکاسانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (بیروت دار الکتب العلمیۃ، ١٩٨٦ء)۔

۸۱-ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ (بیروت، مکتبۃ المعارف، ۱۹۸۸ء)۔
۸۲-ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم (بیروت: دار المعرفۃ، ۱۹۸۳ء)۔
۸۳-مالک، المدونۃ الکبری (القاہرۃ، دار السعادۃ، ۱۳۲۵ھ)۔
۸۴-الماوردی، الاحکام السلطانیۃ والولایات الدینیۃ (القاہرۃ: المکتبۃ التوفیقیۃ، ۱۹۷۸ء)۔
۸۵-مجید خدوری، الحرب والسلم فی شرعۃ الإسلام (بیروت: الدار المتحدۃ للنشر، ۱۹۷۳ء)۔
۸۶-محمد ابوزہرۃ، خاتم النبیین فی العہد المکی والعہد النبوی (الدوحۃ، المؤتمر العالمی الثالث للسیرۃ والسنۃ النبویۃ، ۱۹۸۰ء)۔
۸۷-محمد ابوزہرۃ، الجریمۃ والعقوبۃ فی الفقہ الاسلامی (القاہرۃ، دار النہضۃ العربی ۱۹۶۵ء)۔
۸۸-محمد ابوزہرۃ، العلاقات الدولیۃ فی الإسلام، (القاہرۃ؛ الدار القومیۃ للنشر والتوزیع، ۱۹۶۴ء)۔
۸۹-محمد ابوزہرۃ، الوحدۃ الإسلامیۃ (بیروت، دار الرائد العربی، ۱۹۹۰ء)۔
۹۰-محمد بہرام القاضی، سیاسۃ الرسول فی الجہاد والقضاء (جامعۃ الأزہر: رسالۃ دکتوراہ غیر منشورۃ، کلیۃ الشریعۃ والقانون، ۱۹۳۶ء)۔
۹۱-محمد التابعی، الدبلوماسیۃ فی الإسلام (القاہرۃ، مرکز النیل للإعلام، ۱۹۸۱ء)۔
۹۲-محمد حمید اللہ، مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی والخلافۃ الراشدۃ، (بیروت: دار النفائس، ط ۴، ۱۹۸۳ء)۔
۹۳-محمد رشید رضا، تفسیر المنار (القاہرۃ، مطبعۃ المنار، ۱۹۲۷ء)۔
۹۴-محمد رواس قلعہ جی، قراءۃ جدیدۃ للسیرۃ النبویۃ (الکویت، دار البحوث العلمیۃ، ۱۹۸۲ء)۔
۹۵-محمد سامی عبد الحمید، أصول القانون الدولی العام (الاسکندریۃ: الثقافۃ الجامعیۃ، ۱۹۸۶ء)۔
۹۶-محمد سعید رمضان البوطی، فقہ السیرۃ (دمشق: دار الفکر، ط ۷، ۱۹۷۸ء)۔
۹۷-محمد الشحات الجندی، التنفیۃ الاقتصادیۃ فی القانون الدولی والفقہ الإسلامی (القاہرۃ، دار

النہضۃ العربیۃ، ۱۹۸۵ء)۔
۹۸-محمد الشربینی الخطیب، مغنی المحتاج، (القاہرۃ، البابی الحلبی، ۱۳۵۲ھ)۔
۹۹-محمود شلتوت، الإسلام عقیدۃ وشریعۃ (القاہرۃ: الإدارۃ العامۃ للثقافۃ الإسلامیۃ بالأزہر، ۱۹۵۹ء)۔
۱۰۰-محمد شمس الحق آبادی، عون المعبود فی شرح سنن ابی داؤد (بیروت: دار الفکر، ۱۹۷۹ء)۔
۱۰۱-محمد الصادق عفیفی، الإسلام والمعاہدات الدولیۃ (القاہرۃ: مکتبۃ الأنجلو المصریۃ، ۱۹۸۵ء)۔
۱۰۲-محمد الصادق عفیفی، تطور التبادل الدبلوماسی فی الإسلام، (القاہرۃ: مکتبۃ الأنجلو المصریۃ، ۱۹۸۶ء)۔
۱۰۳-محمد طلعت الغنیمی، احکام المعاہدات فی الشریعۃ الإسلامیۃ، (الإسکندریۃ: منشأۃ المعارف، ۱۹۷۵ء)۔
۱۰۴-محمد طلعت الغنیمی، قانون السلام فی الإسلام (الإسکندریۃ: منشأۃ المعارف، ۱۹۸۹ء)۔
۱۰۵-محمد عبد المنعم عفر، النظام الاقتصادی الإسلامی (د۔ن، ۱۳۳۹ھ)۔
۱۰۶-محمد علی الحسن، القرآن والسنۃ (عمان: مکتبۃ النہضۃ الإسلامیۃ، ط ۲، ۱۹۸۲ء)۔
۱۰۷-محمد عمر مدنی، العلاقات الدبلوماسیۃ للمملکۃ العربیۃ السعودیۃ (الریاض، معہد الدراسات الدبلوماسیۃ، د۔ت)۔
۱۰۸-محمد الغزالی، فقہ السیرۃ (الإسکندریۃ، دار الدعوۃ، ۱۹۸۹ء)۔
۱۰۹-محمود محمد بابلّی، السوق الإسلامیۃ المشترکۃ (بیروت: دار الکتاب اللبنانی، ۱۹۷۵ء)۔
۱۱۰-المرداوی، الأنصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف علی مذہب الإمام أحمد ابن حنبل (القاہرۃ، ۱۹۵۵ء)۔
۱۱۱-المسعودی، مروج الذہب (القاہرۃ: مطبعۃ بولاق، ۱۲۸۳ھ)۔

۱۱۲-مسلم، صحیح مسلم (القاہرۃ: دارالریان للتراث، ۱۹۸۸ء)۔
۱۱۳-مفید شہاب، المفاوضیات الدولیۃ: علم وفن (ندوۃ معہد الدراسات الدبلوماسیۃ، الریاض، ۱۹۹۳ء)۔
۱۱۴-المقدسی، الإقناع فی فقہ الإمام احمد بن حنبل (بیروت، دارالمعرفۃ، د۔ت)۔
۱۱۵-المقریزی، السلوک فی معرفۃ دول الملوک (القاہرۃ، لجنۃ التألیف والترجمۃ، ۱۹۳۶ء)۔
۱۱۶-منیر محمد الغضبان، المنہج الحرکی للسیرۃ النبویۃ (القاہرۃ: دارالأمان، ط ۳، ۱۹۸۷ء)۔
۱۱۷-نجیب الأرمنازی، الشرع الدولی فی الإسلام (لندن: ریاض الریس للکتب والنشر، ۱۹۹۱ء)۔
۱۱۸-نعیم زکی، طرق التجارۃ الدولیۃ ومحطاتہا بین الشرق والغرب أواخر العصور الوسطی (القاہرۃ، الہیئۃ المصریۃ العامۃ للکتاب، ۱۹۷۳ء)۔
۱۱۹-النووی، المجموع شرح المہذب للشیرازی (جدۃ، مکتبۃ الأرشاد، ۱۹۷۲ء)۔
۱۲۰-ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ، تحقیق محمد محی الدین عبدالحمید (القاہرۃ: دارالہدایۃ، ۱۹۸۰ء)۔
۱۲۱-ولید محمود عبدالناصر، جات العالم الثالث: النظام الشامل للافضلیات التجاریۃ فیما بین الدول النامیۃ (القاہرۃ، کتاب الأہرام الإقتصادی، العدد ۹۰، یولیو ۱۹۹۵ء)۔
۱۲۲-وہبۃ الزحیلی، اثارالحرب فی الفقہ الإسلامی (دمشق: دارالفکر، ۱۹۶۲ء)۔
۱۲۳-وہبۃ الزحیلی، المفاوضات فی الإسلام والمفاوضات الدولیۃ (بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۱۹۸۵ء)۔
۱۲۴-یحیی بن آدم القرشی، الخراج، تحقیق احمد شاکر (القاہرۃ، المطبعۃ السلفیۃ، ط ۲، ۱۳۸۴ھ)۔
۱۲۵-أبو یوسف، الخراج (القاہرۃ: المطبعۃ السلفیۃ، ط ۴، ۱۳۹۲ھ)۔

☆☆☆